April
2021

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

UNESCO

شہرِ ادب
لاہور

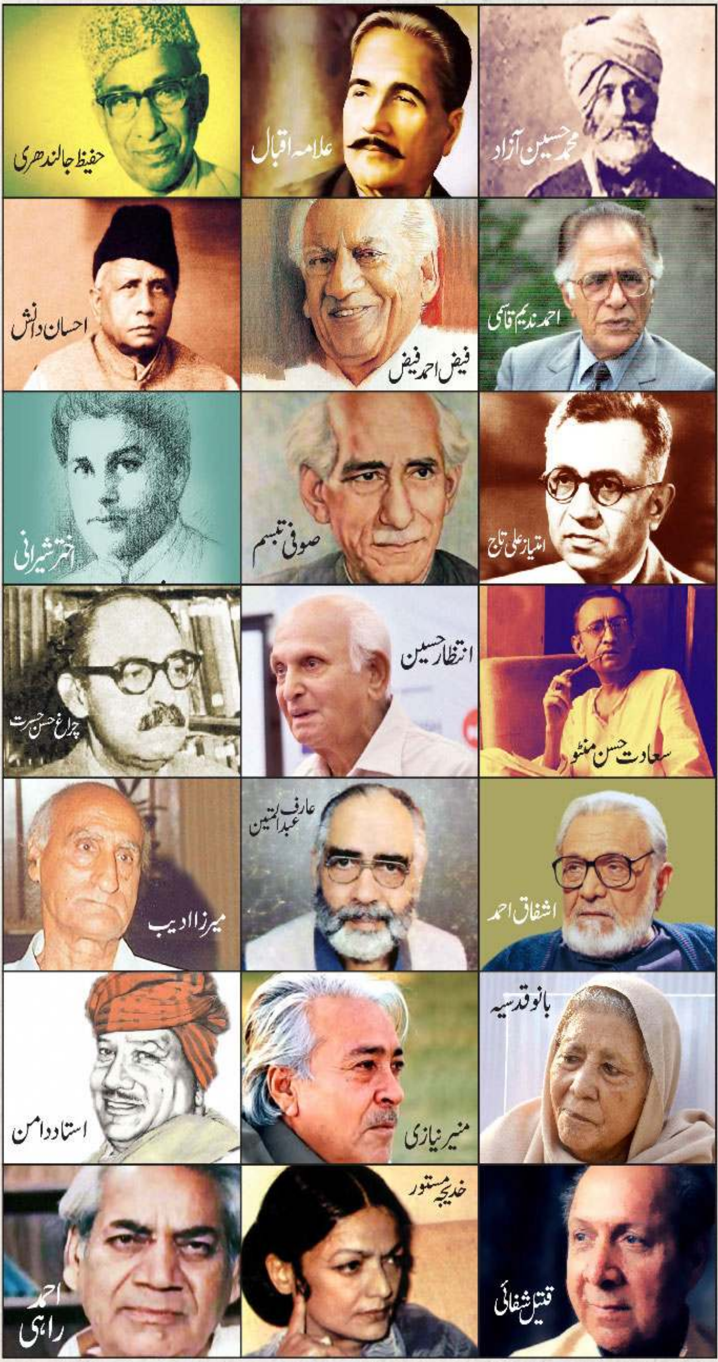
محمد حسین آزاد
علامہ اقبال
حفیظ جالندھری
احمد ندیم قاسمی
فیض احمد فیض
احسان دانش
امتیاز علی تاج
صوفی تبسم
اختر شیرانی
سعادت حسن منٹو
انتظار حسین
چراغ حسن حسرت
اشفاق احمد
عارف عبدالمتین
میرزا ادیب
بانو قدسیہ
منیر نیازی
استاد دامن
قتیل شفائی
خدیجہ مستور
احمد راہی

بانی مدیر خالد احمد

اختر حسین جعفری کے لیے

اے سینہ زنو! دیکھو! زنجیر ہے اور میں ہوں
لاہور کی گلیاں ہیں ، تقدیر ہے اور میں ہوں

پیوست گلو کیا ہے؟ دل ہے کہ لہو کیا ہے؟
اک درد ہے اور دل ہے ، اک تیر ہے اور میں ہوں

دل ٹوٹ کے کب ٹوٹا ، سر پھوٹ کے کب پھوٹا
دیوار ہے ، اس بت کی تصویر ہے اور میں ہوں

پل پل اسے بڑھنا ہے ، پگ پگ اسے پڑھنا ہے
ہر سمت ترے غم کی تحریر ہے اور میں ہوں

اک بت کی طرح سل میں رہتا ہے مرے دل میں
اے خاک لحد ! تیرا نخچیر ہے اور میں ہوں

شب بھر یونہی روئے ہیں ، دن دیکھ کے سوئے ہیں
خالد ، صفِ یاراں دل گیر ہے اور میں ہوں

(اقتباس نظم)

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

Karachi: (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جسد ترادب کا شذرہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - اپریل 2021 - شمارہ نمبر: 4

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

نجیب احمد	اعجاز رضوی	نعمان منظور	کنور امتیاز احمد	جاوید احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: شہر ادب لاہور

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

www.trackntie.com
BAYAZ
ویب سائٹ برائے مطالعہ

عمران منظور ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز، 16 کلومیٹر نزد ٹھوکر نیاز بیگ، سید اطہر شہید روڈ، ملتان روڈ، لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی ، سرور حسین نقشبندی	7 تا 8
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، محمد یٰسین قمر، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، خاور اعجاز، اکرم ناصر، عقیل رحمانی، انفال احمد انور، رخشندہ نوید، سرور حسین نقشبندی، صغیر احمد صغیر	9 تا 19
3	عقیدت	سید ریاض حسین زیدی، عقیل رحمانی، اکرم ناصر، ماجد یزدانی	20 تا 23
4	ہائیکو	نسیم سحر	24
5	گوشہ لاہور	**نثر:** کنھیا لال ہندی، امجد اسلام امجد، ابدال بیلا، اسلام عظمی، جمیل یوسف، بشریٰ رحمٰن، غافر شہزاد، سید ریاض حسین زیدی، آفتاب احمد ملک، ممتاز راشد لاہوری، شوکت محمود شوکت، سیدہ آمنہ ریاض، رانا محمد شاہد	25 تا 90
		نظم: امجد اسلام امجد، احمد جلیل، غافر شہزاد، ناصر حسن، شوکت محمود شوکت، سلیم اختر ندیم، نیاز خان اعوان، اعجاز رضوی، وسیم عباس	91 تا 101
6	مضامین	ارشد چہال، کلیم خارجی، طلعت شبیر، روحانہ روحی، واصف سجاد	102 تا 116

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، نجیب احمد اعجاز کنور راجہ، حسن عسکری کاظمی، نسیمِ سحر، اسلام عظمی رشید آفرین، راحت سرحدی، منظور ثاقب، عقیل عباس افتخار شاہد، سید قاسم جلال، گلزار بخاری، یعقوب پرواز طاہر ناصر علی، کبیر اطہر، اقبال سروبہ، افشاں سجاد افروز رضوی، احمد جلیل، آسناتھ کنول، زبیر فاروق ابو طالب انیم، رضا اللہ حیدر، علی حسین عابدی، حسنین سحر ثمینہ سیّد، انجم جاوید، صغیر احمد صغیر، نبیل قیصر، انیس احمد آفتاب خان، عزیز عادل، رفعت وحید، سید فرخ رضا امر مہکی، علی رضا احمد، صائمہ اسحاق، حمزہ ہاشمی سوز وسیم جبران، عزم الحسنین عزمی، سرور فرحان، ماجد یزدانی ارشد محمود ارشد، اکرم جاذب، فرح شاہد، تاثیر جعفری محسن رضا شافی، ربینہ ممتاز روبی، نائیلہ راٹھور، محمد حماد، علی آرش	117 تا 168
8	افسانے	حبیب الرحمٰن، کلیم، خارجی، نور کمال شاہ، نائیلہ الیاس	169 تا 204
9	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	205 تا 214
10	نظمیں	امجد اسلام امجد، نسیمِ سحر، خاور اعجاز، صفدر صدیق رضی کرامت بخاری، حامد یزدانی، ازہر منیر، طاہر ناصر علی اقبال سروبہ، منظور ثاقب، رخشندہ نوید، نائیلہ راٹھور امین کنجاہی، رخسانہ سمن، امجد بابر، سحر علی ارشد، کیفی قلندر	215 تا 233
11	خطوط	آصف ثاقب، نسیمِ سحر، ہمایون خان، سلطان سکون آفتاب احمد ملک، رانا محمد شاہد	234 تا 241

حمد

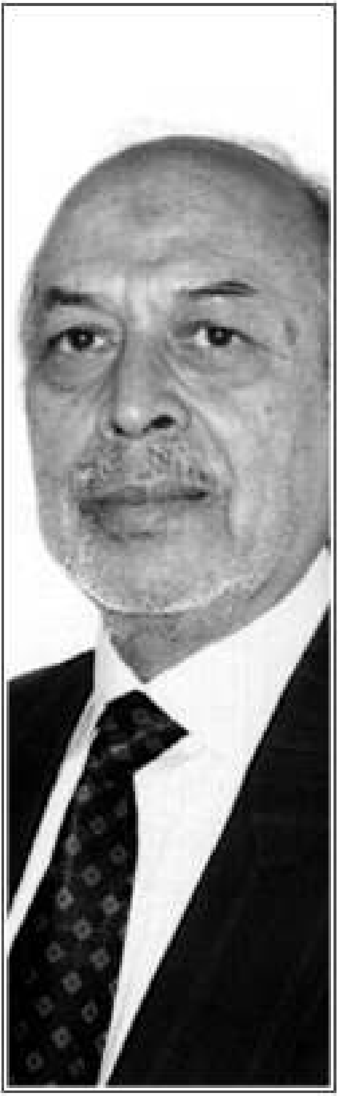

وہ کہ بے مثل، وہ یکتا، وہ صمد ہے وہ عظیم
ہم نے قرآں میں اسے پایا ہے رحمان ورحیم

ہم نے الحمد سے تا سورۂ والنّاس پڑھا
اپنے بندوں پہ ہے اس ذات کا الطافِ عمیم

وہ تو اُس وقت بھی تھا جب نہ تھا پیمانۂ وقت
ماہ وسال اس نے بنا ڈالے ہیں بہرِ تفہیم

حرفِ کُن اس کے ارادے کا جمالِ زرّیں
اس کی نظروں میں برابر ہیں جدید اور قدیم

اس کے ہر نام سے وابستہ ہیں اوصافِ جلی
وہ مصدِّق وہ مصوّر وہ ہے دانا وہ حکیم

ڈوبا سورج بھی پلٹ آیا گواہی کے لیے
معجزہ کہیے کہ تھا حکمِ خداوند کریم

چشمے پھوٹے ہیں کہیں گرم، کہیں سرد حسنؔ
اس کی قدرت سے پہاڑوں کا جگر ہے دو نیم

حسن عسکری کاظمی

حمد

سرور حسین نقشبندی

بحرِ غم سے نکالنے والے
ہر مصیبت کو ٹالنے والے

ہم کو ہر دم پناہ میں رکھنا
سب جہانوں کو پالنے والے

میرے سجدوں میں زندگی بھر دے
جان پتھر میں ڈالنے والے

لڑکھڑانا سرشت ہے میری
ہر قدم پر سنبھالنے والے

میرے لفظوں کو رفعتیں دے کر
حرفِ مدحت میں ڈھالنے والے

فردِ عصیاں کے گھپ اندھیروں میں
دل کا رستہ اجالنے والے

شکر ہو بھی ادا تو کیسے ہو
ہر بھنور سے نکالنے والے

چشمِ سرورؔ میں اپنی رحمت کے
گرم چشمے ابالنے والے

نعتؐ

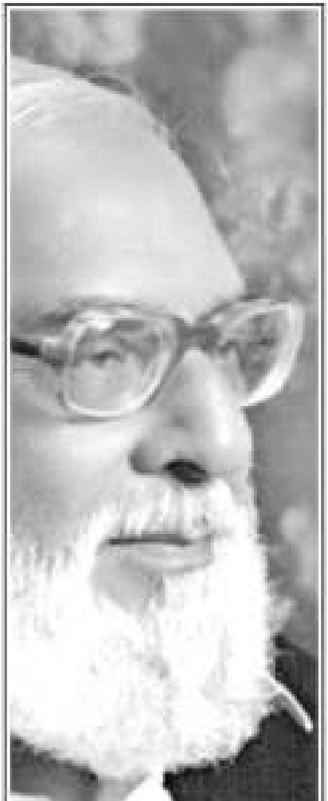

سید ریاض حسین زیدی

ذکرِ شاہ انبیاؐ سے دل میں میرے نور ہے
کون کہتا ہے مدینہ مجھ سے کوسوں دور ہے

حجرۂ جاں ماہِ طیبہ سے مجلیٰ ہو گیا
کارِ عصیاں کی سبھی ظلمت ہوئی کافور ہے

اسوہ خیرالوریٰ ہے، دل نشیں، جامع حسیں
اور یہ انسانیت کا عالمی منشور ہے

کس قدر عشق و محبت میں ہے ربطِ باہمی
آپؐ نے جو کہہ دیا، حق کو وہی منظور ہے

عقدہ ہائے عقل و دانش، آپؐ کے دم سے کھلے
کارگر ہے حسنِ نیت جس قدر مقدور ہے

لفظ و معنیٰ آپؐ کی توصیف میں گویا ہوئے
روحِ قرآں مدحِ آقاؐ میں بڑی مسرور ہے

آپؐ کی مدح سرائی، روشنی ہی روشنی
طورِ سینا ہو گیا اب یہ دل مہجور ہے

آپؐ کے الہام کی خوشبو منور کر گئی
نطقِ یوحیٰ آپؐ ہیں اور دل ریاضِ طور ہے

نعتؐ

دیکھنا خود کو اور الطافِ پیمبرؐ دیکھنا
نعت کا کشکول پکڑے خود کو در پر دیکھنا

حمد کا پرچم، شفاعت، حوضِ کوثر دیکھنا
رفعتِ محبوبِؐ داور، روزِ محشر، دیکھنا

سوچ کرتی ہے طوافِ سیّدِؐ خیرالبشر
کس قدر ہیں مدح جُو کے بخت یاور، دیکھنا

آپؐ کے دربار میں ہے کیسی رحمت کی پھوار
تُو کبھی جا کر مدینے دیدۂ تر! دیکھنا

یاد کر لینا بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ کو
کیسے ہوتا ہے کوئی قطرہ، سمندر، دیکھنا

ذہن میں لانا طلوعِ ماہتاب ہاشمیؐ
شب گزیدہ موسموں میں اجلے منظر دیکھنا

گفتگو کر، رحمۃ للعالمیں کی ذات کی
پھر سخن کی تازگی تُو اے سخن ور! دیکھنا

سیرتِ سرورؐ اگر دل جذب کر لے اے نظر!
آج بھی ممکن ہے وہ مسجد، وہ منبر، دیکھنا

دیکھ لے طائف میں وہ، سرکار کا طرزِ دعا
آرزو ہو جس کی رحمت کو مصوّر، دیکھنا

کیا کہوں کیسا کٹھن تھا، شہرِ طیبہ چھوڑنا
اک قدم چلنا، ٹھہرنا اور مڑ کر، دیکھنا

انکسار آثار ہر لمحہ ترا گزرے یہاں
بارگاہِ ناز ہے اے قلبِ مضطر! دیکھنا

اِک کرن پر اُس کی واروں میں ہزاروں آفتاب
جس قمرؔ کو تھا میسّر روئے انور، دیکھنا

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

مرا مرکز، مرا مامن مدینہ
کہے ہے دل کی ہر دھڑکن، مدینہ

میں صحرا ہوں، مگر تشنہ نہیں ہوں
ہے میری پیاس پر ساون مدینہ

مجھے درپیش کیوں ہو کوئی الجھن؟
مِٹا دیتا ہے ہر اُلجھن مدینہ

مدینے سے سفر کرنے لگوں جب
تو بڑھ کر تھام لے دامن مدینہ

کرن چمکی تھی اِک غارِ حِرا سے
زمانے بھر میں ہے روشن مدینہ

یہ دُنیا اِک اندھیری رات جیسی
اور اِس میں نُور کا روزن مدینہ

اِسی سے تو بھرم قائم ہے میرا
مری عزّت کا پیراہن مدینہ!

نسیمِ سحر

نعتؐ

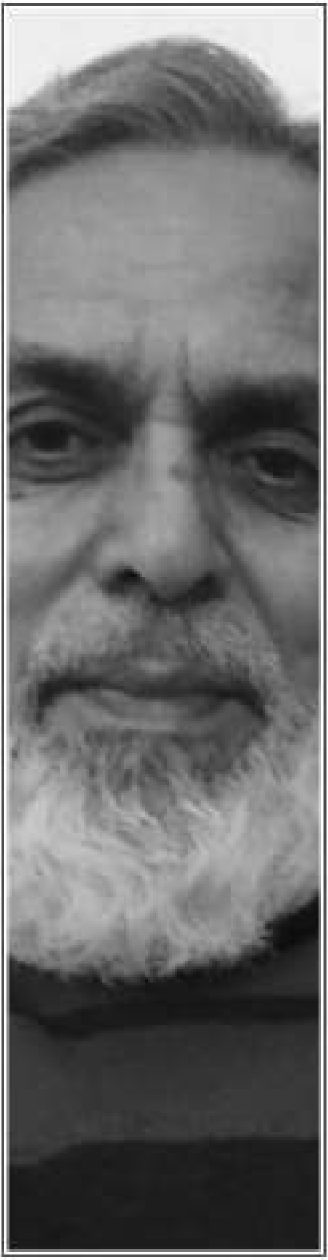

گلاب جھڑتے ہیں آقا تمھارے ہونٹوں سے
مہک رہی ہیں فضائیں تمھاری سانسوں سے

زمین چومتی جاتی ہے جب ترے پاپوش
کلام کرتی ہے خوشبو تری ، ہواؤں سے

یہ کون آیا ہے؟ اُصنامِ کعبہ گر پڑے ہیں
خدائی چھن رہی ہے سینکڑوں خداؤں سے

نزولِ سورۂ نشرح کی ساعتوں کو سلام!
لپٹ رہے ہیں زمانے تمھارے قدموں سے

گواہ رہنا اے شہرِ جمال کی برسات
ہے میری آنکھ کو نسبت تری گھٹاؤں سے

قطارِ نعت نگاراں کا ہوں میں آخری فرد
انیسؔ! حضرتِ حسانؓ کی دعاؤں سے

محمد انیس انصاری

نعتؐ

ذرّۂ شوق سے خورشیدِ جہاں ہو جاؤں
اِک نظر مجھ پہ پڑے، مَیں بھی درخشاں ہو جاؤں

حرفِ بے صوت بنا چومتا ہُوں جالیوں کو
اذنِ اظہار مِلے تو لبِ امکاں ہو جاؤں

کاش چھو جائے مجھے بادِ مدینہ اِک بار
جسمِ خاکی نہ رہوں، روحِ رواں ہو جاؤں

آپؐ کے در کے سوا کوئی نہیں ہے کہ جہاں
دو گھڑی بیٹھ کے افلاک نشاں ہو جاؤں

چشمِ ہستی میں رہوں یا نہ رہوں مَیں لیکن
آپؐ کے چاہنے والوں میں نمایاں ہو جاؤں

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیٹھے ہیں اُن کے دَر سے لگے سر دَر آستیں
دیدہ درا تمام ، دریدہ دہن تمام

نعتؐ

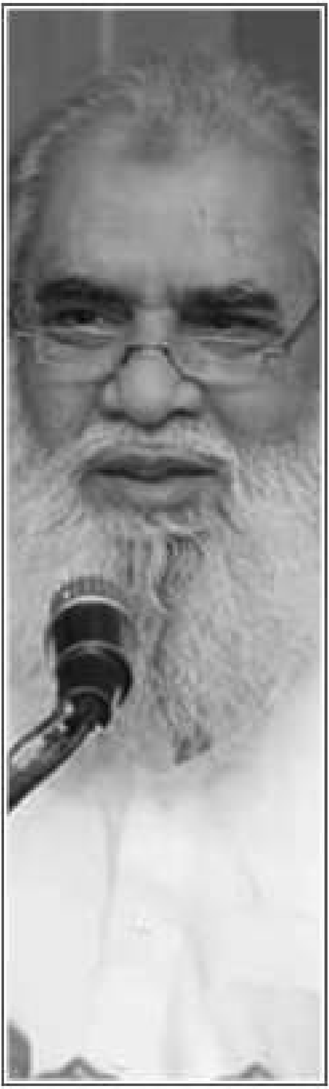

اکرم ناصر

ایک پتھر میں مدینہ سے اٹھا لایا ہوں
لوگ حیران ہیں کس شہر سے کیا لایا ہوں

موتی چن چن کے مدینہ کے گلی کوچوں سے
ایک تسبیح مدینہ سے بنا لایا ہوں

میری پیشانی پہ ہے مہر ریاض الجنہ
جس کی خواہش تھی وہ دولت میں کما لایا ہوں

ہے یقیں آپ کے قدموں سے یہ لپٹی ہوگی
خاکِ طیبہ کو میں ماتھے پہ سجا لایا ہوں

ہر گھڑی دل کی طہارت میں جو مصروف رہے
اپنی آنکھوں کے لیے ایسی گھٹا لایا ہوں

خاکِ طیبہ کی یہ پڑیا ہے اثاثہ میرا
میرا سامان ذرا دیکھ میں کیا لایا ہوں

جان سے بڑھ کے کوئی چیز نہ تھی پاس مرے
سو یہ نذرانہ میں محبوبِ خدا لایا ہوں

نعتؐ

آگہی کا ہر جانب نور ہے ، اُجالا ہے
گمرہی کے زنداں سے آپؐ نے نکالا ہے

سب کے واسطے پھیلا اُنؐ کا دامنِ رحمت
سب گناہ گاروں کو آپؐ نے سنبھالا ہے

یوں تو سب نبیؑ رب کے، باکمال و برتر ہیں
لیکن آپؐ کا رُتبہ ہر نبیؑ سے اعلیٰ ہے

خوشبوئے محمدؐ سے جان و دل معطر ہیں
قافلہ مدینے کی سمت جانے والا ہے

آپؐ کی عنایت سے چل رہی ہیں جو سانسیں
آپؐ نے جو بخشا ہے مُنہ میں وہ نوالہ ہے

جشنِ آمدِ آقاؐ کیا منائیں وہ جن کے
دل میں بس تعصب کی مکڑیوں کا جالا ہے

عشقِ مصطفائیؐ سے ، فیضِ کبریائی تک
روح پر محیط اپنے نور ہی کا ہالہ ہے

آج پھر عقیلؔ اپنی حاضری ہے روضے پر
آج میری راتوں سے دن نکلنے والا ہے

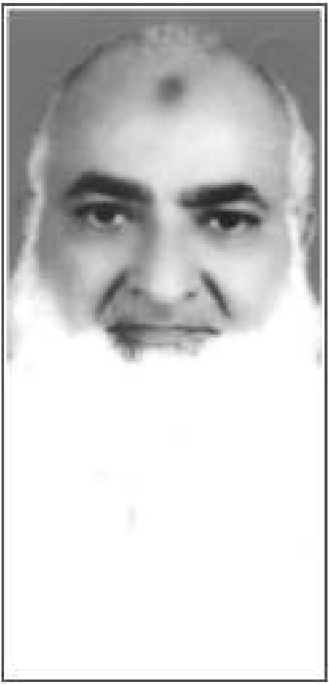

عقیل رحمانی

نعتؐ

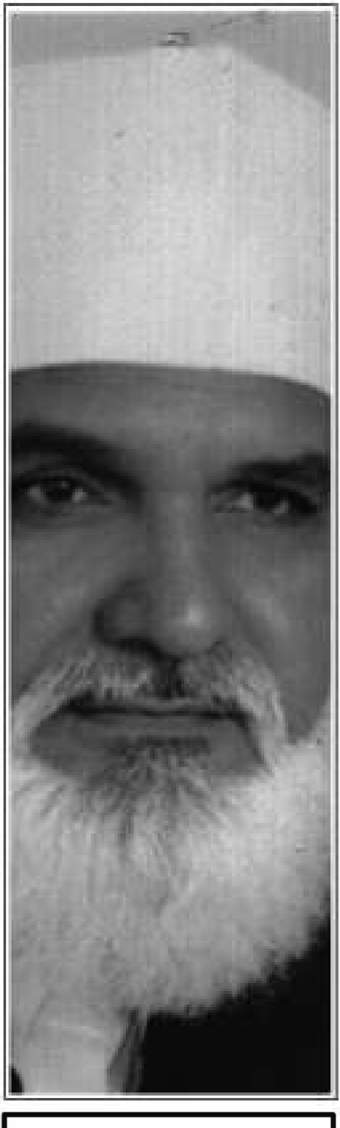

اے حبیبِ حق تعالیٰ! اے جوازِ کائنات
آپؐ وجہِ کُن فکاں ہیں، آپؐ ہیں سِرِّ حیات

آپؐ ہیں جانِ جہانِ حُسن و خیر و آگہی
آپؐ کے دم سے بہارِ بوستانِ صالحات

نُور ہے ہر کہکشاں کا آپ کے قدموں کی دُھول
آپؐ ہیں خیرالخلائق، آپؐ ہیں عالی صفات

حُبِّ رحماں کے لیے لازم ہے طاعت آپؐ کی
پیروی سے آپؐ کی کونین میں فوز و نجات

آپؐ نے توحید کا پیغام پہنچایا ہے یُوں
شرک خانوں میں ہیں لرزاں، آج بھی لات و منات

آپؐ سے منسوب ذرّہ بھی ہے رشکِ مہر و ماہ
آپؐ کی الفت نہ ہو تو رائیگاں صوم و صلوٰۃ

اعتبارِ دین و دانش، آپؐ کا ہے ہر عَمَل
جان ہے سچائیوں کی آپؐ کی ہر ایک بات

آپؐ کی تبلیغ سے عالم میں امن و ارتقا
آپؐ کا حُکمِ جہاد، اصلِ حیاتِ شش جہات

ہرِ صدی کی ہر گھڑی کو آپؐ نے خیرات دی
انورِ عاصی پہ بھی آقاؐ نگاہِ اِلتفات

افضال احمد انور

نعتؐ

نثار ایک نہیں صرف میری جاں اُنؐ پر
زمیں کے ساتھ فِدا ہے یہ آسماں اُن پر

نہیں کہ ایک وہ ہجرت کے کرب سے گزرے
پھر اس کے بعد بہت آئے امتحاں اُن پر

بس ایک عشق کہ ہے قدرِ مشترک ہم میں
فدا ہیں چاہنے والے، یہاں وہاں، اُن پر

یہ میں نے دیکھا کہ دیوانہ وار شام و سحر
درود بھیجتی رہتی ہے میری ماں اُن پر

میں روتی جاؤں نبیؐ جی نبیؐ جی کہتے ہوئے
مجھے یقیں کہ مرا درد ہے عیاں اُن پر

مقامِ نعت یہ رخشندہ چپ لگی تجھ کو
ہوئی ہے ختم تری طاقتِ بیاں اُن پر

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

منہ دیکھتے ہی رہ گئے جادو بیاں سبھی
قرآن پر گواہ تھا اُن کا چلن تمام

نعتؐ

رنگِ رخِ حیات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے
زیرِ لحد بھی ساتھ ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

دیکھو قدم قدم ہے یہاں خیر خیمہ زن
آؤ یہاں ثبات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

کرتی ہے کائنات کے گوشوں کے راز فاش
عقدہ کشائے ذات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

گھڑیاں قبولیت کی اسی میں ہیں عکس ریز
پچھلے پہر کی رات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

اس میں نمو پذیر ہیں کرنوں کے دائرے
تنویرِ شش جہات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

حرفِ نیاز و عجز ہی اس میں ہیں معتبر
فخرِ سخن کو مات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

فکر و سخن کو رکھتی ہے مائل بہ جستجو
ایسی کرم صفات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

اشکوں میں ڈھل گئی ہے مرے دل کی کیفیت
کیا حسن واردات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

مجھ تک غم و الم کی رسائی نہ ہو سکی
یہ جو کرم کا ہاتھ ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

صدیاں بھی جس کے حسن کو گہنا نہیں سکیں
اس میں یہی تو بات ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

جن کے ادب میں اترا ہے لاترفعوا کا حکم
سرورؔ یہ اُنؐ کی نعت ہے، یہ اُنؐ کی نعت ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

خوش ہوں کہ ملی ہے جو رسائی ترے در کی
خیرات نہ دامن میں سمائی ترے در کی

روداد کسی نے جو سنائی ترے در کی
دل نے مرے تصویر بنائی ترے در کی

شاہوں سے کہیں بڑھ کے مقدر پہ ہے نازاں
"تھی جس کے مقدر میں گدائی ترے در کی"

ہر لحہ مدینے کے تصور میں گزارا
اک دردِ مسلسل ہے جدائی ترے در کی

شاہا، میں ترے در کے جو ٹکڑوں پہ پلا ہوں
کیسے نہ کروں مدح سرائی ترے در کی

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

عقیدت

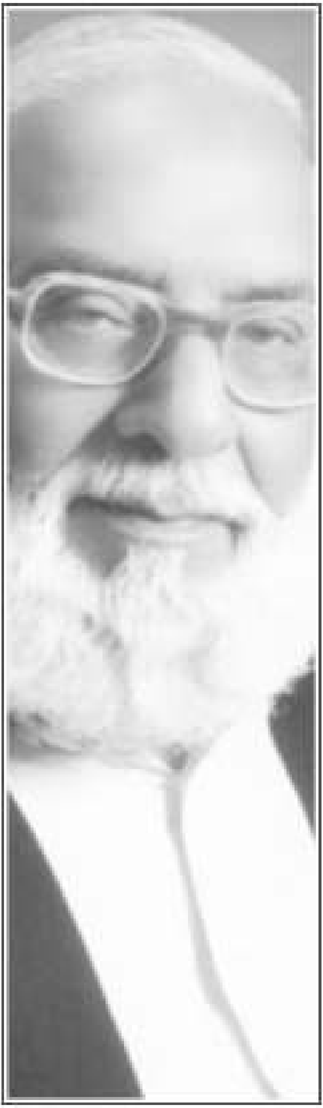

مصیبت کو جب مشکلوں سے گزارا
فقط کام آیا خدا کا سہارا

سفینہ جو منجدھار میں ڈولتا تھا
اسی سے ملا عافیت کا کنارا

ہو ایثار پیشہ، سخاوت روش ہو
خزانہ ملے گا جہانوں کا سارا

یقیں ہو وہی راہ بر ہے سبھی کا
لہٰذا کہیں بھی نہ آئے خسارا

دلِ مردِ مومن کو پاکیزہ کر دے
جہانِ وفا پر ہو اس کا اجارہ

کبھی رخ نہ موڑیں، رخِ مصطفیؐ سے
دمکتا رہے گا عقیدہ ہمارا

ہے توحید ہی اصل انسانیت ہے
ریاضِ عقیدت ہے اس سے دلارا

سید ریاض حسین زیدی

گلہائے عقیدت

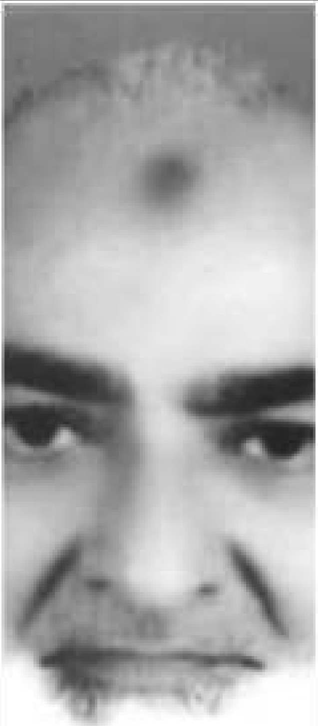

تعریف اُنؐ کی اس سے بھی کیا مختصر لکھوں
آقاؐ کو شانِ عظمتِ نوعِ بشر لکھوں

ریگِ مدینہ میں تجھے شمس و قمر لکھوں
اور تیرے سنگ ریزوں کو لعل و گہر لکھوں

جبکہ میری بہشت مواجہ شریف ہے
باب السلام کو نہ کیوں جنت کا در لکھوں

جس کو طواف گنبدِ خضرا نصیب ہو
خود کو میں اس حسین کبوتر کا پَر لکھوں

میری ہر ایک سانس سے ہیں باخبر حضورؐ
احوال اپنا کس لیے میں نامہ بر لکھوں

لفظوں میں بھی وفاؤں کے جگنو دکھائی دیں
میں بھی چراغِ خیمہ بجھا کر اگر لکھوں

عقیل رحمانی

ربِ سماوات

ہو کام کوئی ایسا عطا ، ربِ سماوات
ہر شخص کا ہو جس سے بھلا، ربِ سماوات

میں پیکرِ گل، مجھ میں ہر اک عیب جہاں کا
تو لطف و کرم ، جود و سخا، ربِ سماوات

تتلی سے ملی ہے ترے ہونے کی گواہی
جگنو سے ملا تیرا پتا ، ربِ سماوات

تو مدح سرا والیِ کونین کا یا رب
ہر چیز تری مدح سرا ، ربِ سماوات

تو مانتا ہے یہ کہ فقط تیرا نہیں ہے
میرا بھی ہے محبوبِ خدا ، ربِ سماوات

کب سے میں لیے کاسہ، ترے در پہ کھڑا ہوں
ہو کچھ تو عطا ، کچھ تو عطا ، ربِ سماوات

تو مالک و مختار ہے، دے صبر کی دولت
کر شکر کی توفیق عطا ، ربِ سماوات

ہے دیکھنا کیا کیا ہے چھپا اوٹ میں اس کی
آنکھوں سے یہ پردہ تو ہٹا، ربِ سماوات

کیا بات کریں تیری، کہ دیتا ہے کبھی تو
ذروں میں تو خورشید چھپا ربِ سماوات

کر دے مری سوچوں کی طہارت مرے مالک
ناپاک ارادوں سے بچا ربِ سماوات

چھیڑوں گا کبھی تجھ سے، میں کربل کی کہانی
اپنوں سے ہی ہوتا ہے گلا، ربِ سماوات

کل تک تو تری یاد میں تھا لطف مگر آج
ہے روح کی کچھ اور غذا، ربِ سماوات

کس طرح کرے کوئی بھلا مدحِ محمدؐ
کس طرح بنے کوئی بھلا، ربِ سماوات

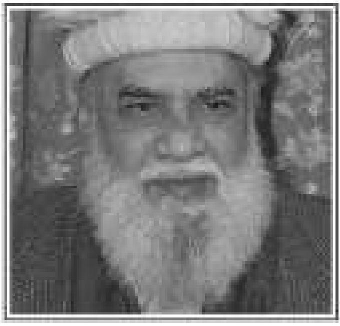

اکرم ناصر

عقیدت

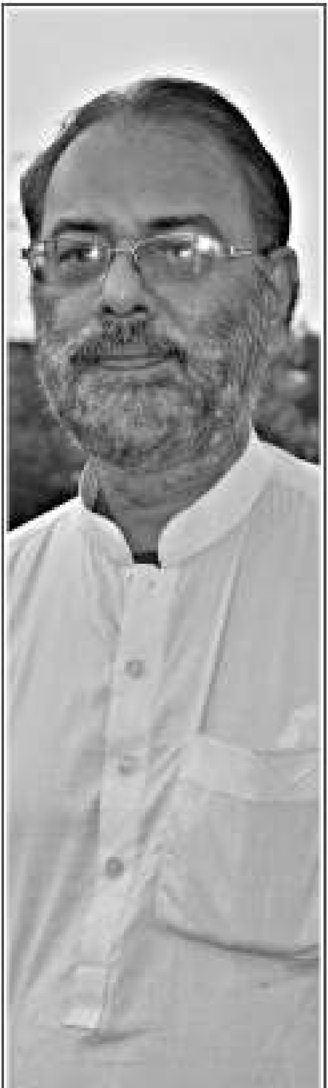

ماجد یزدانی

مشکلوں سے مجھے بچایا ہے
مجھ پہ تیرے کرم کا سایا ہے

میں نے ہر بار کھائی ہے ٹھوکر
تونے ہر بار ہی بچایا ہے

مجھ کو ظلمت کے ان اندھیروں میں
آج بے طرح یاد آیا ہے

ہم ہی بھولے ہیں تیری سب باتیں
ورنہ تو نے تو کب بھلایا ہے

راستے بھی چمکتے جاتے ہیں
نور ہے یا کہ تیرا سایا ہے

تیری تائید ہی ملی مجھ کو
میں نے جو بھی قدم اٹھایا ہے

اللہ اللہ وہ شان کیا ہو گی
رب نے نور عرش پر بلایا ہے

ہائیکو

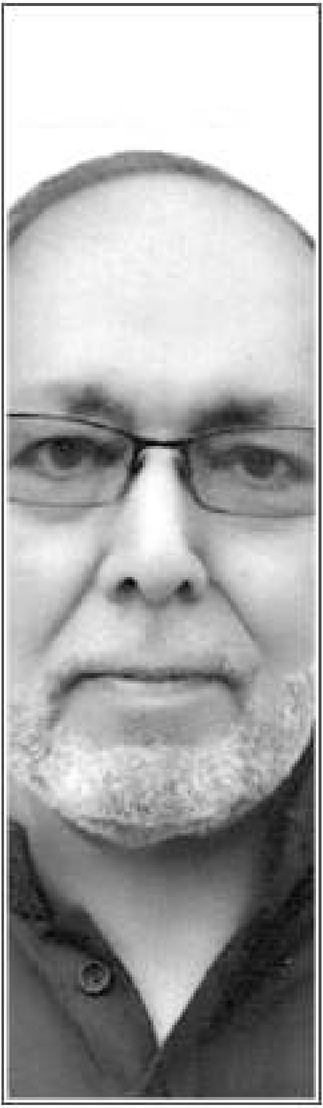

مرنے کی خواہش
دِل میں رکھ کر بھی اکثر
جینا پڑتا ہے

سنتا کب ہے شہر
اِس کے اندر کتنے دکھ
گونجیں آٹھوں پہر

لہر سمندر کی
تاب کہاں لا سکتی تھی
سوکھے منظر کی

رہتے ہیں گم صم
اپنی اپنی جگہ دونوں
اکثر مَیں اور تُم

کہہ دے کوئی گُن
مجھ میں زندہ ہو جائے
پریم کا سجرا ہُن

کیسی عجب خواہش!
تُو بھی شامل ہو جائے
میری اِکائی میں

نسیمِ سحر

شہر لاہور

کنھیا لال ہندی

یہ شہر دارالحکومت و دارالسلطنت ملک پنجاب کا ہے۔ دریائے راوی کے بائیں کنارے پر بہ فاصلۂ دو میل آباد ہے۔ صدہا سال سے یہی شہر خطۂ پنجاب کا حاکم نشین اور صوبے کا (صدر) مقام رہا ہے۔ کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اگرچہ شاہانِ چغتائی کی عملداری سے پہلے پنجاب کا دارالحکومت دیپال پور تھا اور سلاطینِ تغلقیہ اور خلجیہ و لودیہ وغیرہ کے عہد میں بھی دیپال پور ہی دارالحکومت تصور کیا جاتا تھا، مگر بابریہ و ہمایونی عہد میں شہر لاہور ہی دارالسلطنت قرار پایا۔ اور حاکم نشین ہونے کے سبب رونق اس کی روز بروز بڑھتی گئی۔

پہلی تاریخوں میں اس کا نام کہیں لہاور اور کہیں لہانور اور کہیں لوہور اور کہیں لاہور تحریر ہے۔ امیر خسرو دہلوی نے بھی اپنی مصنفہ کتاب ''قران السعدین'' میں اس شہر کا نام لاہور درج کیا ہے، اور فرمایا ہے:

از حدِ سامانہ تا لاہور کذا
ہیچ عمارت نہ مگر در قصور

....

اس سے معلوم ہوا کہ آٹھویں صدی ہجری (۸۰۰ھ) کی ابتدا میں، جب امیر خسرو شاعر نامور دہلوی زندہ تھا، تو نام اس شہر کا لاہور ہی تھا۔ کتاب ''فوائد الفوائد'' (فوائد الفواد) ملفوظِ شیخ المشائخ نظام الدین بداؤنی (کذا) دہلوی میں اس شہر کو لہانور کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس شہر کے بانی کا نام بہ سبب گزر جانے مدتِ دراز کے بہ خوبی معلوم نہیں ہوتا اور نہ بہ خوبی ثابت ہوا ہے کہ پہلے پہل اس نامور شہر کی بنیاد کس نے رکھی ہے، کیوں کہ کتبِ تواریخ میں مختلف روایتیں لکھی ہیں۔ بنیاد کس نے رکھی ہے، کیوں کہ کتبِ تواریخ میں مختلف روایتیں لکھی ہیں۔ عموماً مشہور ہے کہ مہاراجہ چندر اوتار کے فرزند لو نے یہ شہر آباد کیا تھا اور لوہور نام رکھا تھا۔ صدہا بلکہ ہزارہا سال کی مدت گزرنے کے سبب سے لوہور کا لفظ بگڑ کر لاہور مشہور ہو گیا۔ بلکہ صاحبِ ''خلاصۃ التواریخ'' بھی اسی قول کی تصدیق کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ لو اور کشّو دو فرزندانِ دل بند مہاراجہ رام چندر اوتار کے تھے۔ جب وہ دونوں پنجاب میں رونق افزا ہوئے تو لو نے لوہور یعنی لاہور اور کشّو یعنی قصور آباد کیا۔ مگر

شیخ احمد زنجانی، صاحب رسالہ "تحفۃ الواصلین"، جس نے وہ کتاب ۴۳۵ ہجری عہد سلطان مسعود غزنوی میں بہ مقام لاہور اس شہر کے علما و فضلا کے حال میں لکھی ہے، صاحب "خلاصۃ التواریخ" کے قول کے برخلاف لکھتا ہے، کہ اس شہر کو اول راجہ پرتھچت نے، جو پانڈوؤں کی اولاد سے بڑا راجہ تھا، آباد کیا۔ کسی قدر مدت کے بعد قحط وغیرہ کے صدمات سے یہ بستی ویران ہوگئی اور صدہا سال تک ویران رہی۔ جب راجہ بکرماجیت کا وقت آیا تو اُس کے حکم سے دوبارہ اس کی آبادی کی بنیاد قائم ہوئی۔ ابھی آباد ہونے نہیں پایا تھا کہ بکرماجیت مر گیا اور سمند پال جوگی تخت نشین ہوا۔ اُس وقت میں آبادی اس کی بہ اتمام پہنچی اور سمند پال نگری (کذا) نام رکھا گیا۔ وہ آبادی میں مدت مدید تک قائم رہی۔ من بعد جب راجہ دیب چند دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اُس نے پنجاب کا علاقہ اپنے برادر زادے لوہار چند کی جاگیر میں دے دیا۔ جب اُس کا کامل تسلط پنجاب پر ہوگیا تو اس نے اس شہر کو دارالحکومت بنایا، اور اس کی آبادی و ترقی میں بہت کوشش کی، اور سمند پال نگری نام موقوف کرکے، لوہار پور نام اپنے نام پر رکھا جو مدت مدید میں بہ کثرت استعمال بگڑ کر لاہور مشہور ہوگیا۔

جب اسلام کا زمانہ آیا اور مسلمان بادشاہوں نے غربی ملکوں میں قوت حاصل کی تو سلطان محمود سبکتگین (کذا) غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا۔ فرمان فرما صاحب تخت و تاج تھا جس کی لڑائیاں سلطان سبکتگین اور اُس کے فرزند سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہوئیں تھیں پہلے اس شہر کی آبادی کھلی آبادی تھی۔ فصیل شہر پناہ نہ تھی۔ اکبر بادشاہ نے اس کے گرد پختہ حصار بنوایا۔ فصیل کی دیوار بہت بلند اور چوڑی تعمیر کی۔ ایک ایک دروازے کے درمیان دس دس برج کلاں بنوائے۔ دروازے پختہ تعمیر کیے۔ قلعہ بھی پختہ بنوایا۔ وہ فصیل اخیر سلطنت سکھی تک قائم رہی۔ انگریزی عہد میں اس قدر بلند فصیل فضول متصور ہوکر پہلے بہ قدر نصف کے گرائی گئی۔ دوسری دفعہ باقی ماندہ گرا دینے کا حکم مل گیا اور اُس کی جگہ ایک مختصر دیوار پختہ بنوادی گئی جو اب موجود ہے۔ اس شہر کے بارہ دروازے اور ایک چھوٹا دروازہ ہے جس کو موچی دروازہ کہتے ہیں۔

اول دہلی دروازہ: یہ دروازہ مشرق کی سمت گویا شہر دہلی کی طرف ہے اس لیے اس کو دہلی دروازہ کہتے ہیں۔ لاہور کے نامی دروازوں میں سے یہ دروازہ ہے اور آمد و رفت لوگوں کی بہ کثرت ہے، کیوں کہ اسی

دروازے کے باہر سٹیشن ریلوے بنایا گیا ہے اور اسی سمت کو بڑے بڑے شہر امرتسر و جالندھر وغیرہ ہیں۔ ریل پر سوار ہونے والے مسافر اور تجار سب اسی دروازے سے نکلتے ہیں اور جو باہر سے آتے ہیں وہ بھی اسی سے داخل شہر ہوتے ہیں۔ اسی دروازے کے اندر سے سیدھی سڑک قلعے کو جاتی ہے۔ مسجد وزیر خاں، جو ایک نامی عمارت و باعث افتدار شہر ہے، اسی دروازے کے اندر ہے۔ سرائے وزیر خاں و حمام وزیر خاں، جو مسجد کے اوقاف میں سے شمار ہوتا ہے، اسی دروازے کے پاس ہے۔ پرانی عمارت اکبری اس دروازے کی انگریزی عہد تک موجود تھی مگر نہایت بوسیدہ و خراب۔ اور دروازہ پست و زمین دوز ہو چکا تھا، یہاں تک کہ ہاتھی کا مع عماری گزرنا محال تھا۔ سرکار انگریزی نے بہ نظر رفع اس تکلیف کے پہلے دروازے کو گرا دیا اور محمد سلطان ٹھیکیدار کی معرفت عمارت موجودہ حال ہوئی۔ یہ دروازہ دو منزلہ نہایت مقطع بنایا گیا ہے۔ دونوں طرف دروازے کے دو منزلہ عالی شان عمارت ہے اور وسط میں دروازہ ہے۔ نیچے کے دو طرفہ مکانات میں پولیس کے سپاہی رہتے ہیں اور اوپر کی منزل میں ایک طرف تو مکان نشست و کچہری صاحبان آنریری مجسٹریٹاں و میونسپل کمیٹی کے ممبروں کے اجلاس کے لیے مکلف و مصفا بنا ہے جس میں کچہری ہوتی ہے، اور دوسری طرف پولیس کے افسر رہتے ہیں جن کی تعیناتی دروازے کی حفاظت پر ہوتی ہے۔

دوم اکبری دروازہ: اس دروازے کو بادشاہ وقت محمد جلال الدین اکبر نے اپنے نام سے موسوم کیا اور ہر قسم کے غلے کی منڈی اس دروازے کے اندر مقرر فرما کر اس کو بھی اکبری منڈی کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ اب تک دروازہ اور منڈی دونوں اکبر کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ دروازہ بھی خستہ و بوسیدہ ہو چکا تھا اور سرکار انگریزی کے عہد میں قدیمی قطع پر از سر نو بنایا گیا۔

تیسرا موتی دروازہ: المعروف موچی دروازہ۔ یہ دروازہ موتی رام جمعدار ملازم اکبری کے نام سے موسوم ہے جو تمام عمر اس دروازے کی حفاظت پر تعینات رہا تھا۔ مدت العمر کی ملازمت کے سبب سے اس دروازے نے بھی موتی کے ساتھ پوری نسبت پیدا کر لی اور ہمیشہ کے لیے موتی بن گیا۔ سکھی عہد میں موتی کے نام سے بدل کر موچی مشہور ہوا۔ اب بھی موچی دروازہ مشہور ہے۔ اس دروازے کے شرقی دالان میں ایک قبر چھوٹی سی زمانہ سلف کی پختہ بنی ہوئی موجود ہے۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ یہاں کسی شہید کا سر مدفون

ہے۔ اب سرکار انگریزی کے حکم سے یہ دروازہ مع دونوں برجوں کے گرادیا گیا ہے اور اینٹیں فروخت کر دی گئی ہیں۔ یقین ہے کہ عنقریب نیا دروازہ تعمیر ہوگا۔

چوتھا شاہ عالمی دروازہ: یہ دروازہ شاہ عالمی بادشاہ، اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے، کے نام سے موسوم ہے۔ پہلے اس کا نام کچھ اور تھا۔ چند دنوں میں (کذا) بادشاہ لاہور میں آیا تو چاہا کہ اکبر بادشاہ اپنے جسدِ اعلیٰ کی طرح ایک دروازہ اس شہر کا اپنے نام سے موسوم کرے اور اپنے رونق افزا ہونے کی یادگار لاہور میں چھوڑ جائے۔ اُس نے یہ تجویز قائم کرکے منادی کرادی کہ آئندہ یہ دروازہ شاہ عالمی پکارا جائے۔ چنانچہ اس روز سے آج تک شاہ عالمی دروازہ کہلاتا ہے۔ یہ دروازہ بھی انگریزی عہد میں دوبارہ پہلے دروازے کی قطع پہ تعمیر ہو چکا ہے۔

پانچواں لُہاری دروازہ: اصل نام اس کا لاہوری دروازہ ہے۔ غلط العام لُہاری دروازہ مشہور ہے۔ اس دروازے کو خاص لاہور کا دروازہ تصور کرنا چاہیے اور روزِ آبادیٔ اسلام سے اسی نام سے موسوم ہے۔ باعث یہ ہوا کہ جب سلطان محمود غزنوی نے چاہا کہ راجہ جے پال بن انگ پال بن جے پال بن جے پال (کذا) کو لاہور سے بے دخل کرکے پنجاب کا علاقہ اپنے ماتحت کرلے تو راجہ جے پال چند ماہ تک اس شہر میں محصور ہوکر لڑتا رہا۔ آخر بھاگ گیا۔ محمود نے شہر کو آگ لگادی۔ رعایا کو قتل کیا جس سے شہر بالکل ویران و برباد ہو گیا۔ رعایا کچھ تو قتل ہوئی اور کچھ بھاگ گئی۔ چند سال یہ شہر غیر آباد رہا۔ آخر جب ملک ایاز، پنجاب کے انتظام کے لیے مامور ہوا تو اس نے شہر کو دوبارہ آباد کرنا چاہا۔ سب سے اول آبادی شہر کی اسی محلے سے شروع ہوئی جس کو لاہوری منڈی کہتے ہیں اور سب سے اول یہی دروازہ تعمیر ہوا، جس کا نام لاہوری دروازہ رکھا گیا۔ اس دروازے کی عمارت سابقہ نہایت بوسیدہ تھی۔ صاحبانِ انگریز نے ازسرِ نو قدیمی قطع اور وضع پر اس کو بنوایا جو اب تک موجود ہے۔

چھٹا موری دروازہ: یہ چھوٹا سا دروازہ لوہاری اور بھاٹی کے درمیان فصیل کے برج کے گوشے میں بنا ہوا تھا۔ قدیمی دروازہ تو بہت چھوٹا تھا جس میں اسپ سوار کا گزر بہ مشکل ہوتا تھا۔ گزرنے کے وقت بہر حال سوار کو زین تک گردن جھکانی پڑتی تھی۔ سرکار انگریزی کے وقت یہ دروازہ کشادہ کر دیا گیا ہے جس سے یہ صورت دروازے کی بن گئی اور اس لائق ہو گیا کہ

گاڑی، اونٹ، گھوڑا اس سے بخوبی گزر جائے۔ یہ دروازہ موری دروازے کے نام سے بہ عہد ملک ایاز موسوم ہوا۔ اس واسطے کہ جن دنوں میں بہ عہد راجگی راجہ جے پال، سلطان محمود نے شہر کو محصور کیا ہوا تھا، راجہ تو بے خبر بھاگ گیا مگر شہر کے لوگ بہ دستور لڑتے رہے۔ سلطان نے چاہا کہ شہر میں داخل ہو کر شہر والوں کو سزا دیوے مگر کسی راستے سے داخلہ نہ ملا۔ آخر اس مقام سے دیواروں کو گرا کر داخلِ شہر ہوا۔ ملک ایاز نے جب پھر شہر کو آباد کیا تو فتح کی یادگار کے طور پر اس جگہ دروازہ قائم کر دیا اور بہ سبب اس کے کہ چھوٹا دروازہ تھا، موری دروازہ نام رکھا۔ کیونکہ موری پنجابی زبان میں اُس سدرو کو، جس میں سے پانی گھر کا نکلتا ہے۔

ساتواں بھاٹی دروازہ: یہ دروازہ بھاٹ کی قوم سے منسوب ہے جو بعد آبادی ملک ایاز کے اس دروازہ کے اندر یک جا آباد ہوئی تھی اور صدہا سال آباد رہی۔ اس واسطے یہ دروازہ اُن کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اب اگرچہ اس محلے میں کوئی بھاٹ قوم قیام پذیر نہیں۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

کا نقشہ نمودار ہے۔ مگر نام قوم بھاٹ کا اب تک لیا جاتا ہے، کیونکہ بوقتِ آبادی انھوں نے حاکم کے ساتھ شرط کر لی تھی کہ ہم اس شرط پر اپنا محلہ اس موقع پر آباد کرتے ہیں کہ دروازہ ہمارے نام سے موسوم ہو۔ چنانچہ حاکم نے منظور کر کے یہ دروازہ اُن کے نام سے موسوم کر دیا۔ قطعہ:

کام کر ایسا کہ تیرے بعد بھی
نیک ناموں میں ترا روشن ہو نام
یادگار اپنی کوئی دنیا میں چھوڑ
جس سے تم کو یاد رکھیں خاص وعام
نام قائم ہو قیامت تک ترا
ذکر جاری ہر جگہ ہو صبح و شام

یہ دروازہ پرانا ہو گیا تھا۔ صاحبانِ انگریز نے اس کو گرا کر انگریزی قطع کا بنوایا ہے۔

آٹھواں ٹکسالی دروازہ: شہر لاہور کی غربی فصیل میں صرف یہی دروازہ ہے جس کو ٹکسالی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ شاہانِ سلف کے عہد میں اس دروازے کے اندرونی شمالی میدان میں دارالضرب شاہی ایک عالی شان مکان بنا ہوا تھا اور اسی جگہ پر ایک کا سکہ مسکوک و مضروب ہوتا تھا۔ اس ٹکسال کے سبب سے اس کا نام ٹکسالی دروازہ مشہور ہوا۔ اب اگرچہ انقلاب زمانہ نے اس ٹکسال کی بیخ و بنیاد باقی نہیں چھوڑی مگر بقیہ مسجد کذا ٹکسالی کا باقی ہے، جس کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں

کانسی کا رعمدہ مسجد بنی ہوگی۔

نواں روشنائی دروازہ: یہ دروازہ مسجد بادشاہی اور قلعۂ لاہور کے درمیان ہے۔ چونکہ بہ سبب مسجد شاہی اور دروازہ غربی قلعۂ لاہور کے آمد و رفت ملازمان شاہی اس دروازے کے اندرونی میدان اور باہر روزمرہ بادشاہی حکم سے روشنی ہوا کرتی تھی، اس سبب سے یہ دروازہ روشنائی دروازہ کہلاتا تھا اور اب تک اسی نام سے موسوم ہے۔ یہ دروازہ اصل میں قلعے کا دروازہ ہے مگر بہ سبب اس کے کہ قلعے کی غربی دیوار کے باہر اور فصیلِ شہر کی دیوار کے اندر ہے، شہر کا دروازہ گنا جاتا ہے۔

دسواں مستی دروازہ: یہ دروازہ بھی ایک شاہی ملازم کے نام سے مشہور ہے جس کا نام مستی بلوچ تھا اور حفاظت اس کی بادشاہ کے حکم سے اُس کے سپرد تھی اور مدت العمر اسی خدمت پر مامور رہا۔ اُس کی قدامت اور نیکوخدمتی کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہی حکم سے یہ دروازہ اُس کے نام سے ہمنام کیا گیا تاکہ اُس کا نام تاقیام دروازہ زندہ رہے۔ یہ پرانا دروازہ اب بہ حکم حکام انگریز گرایا گیا اور مختصر پھاٹک اُس کی جگہ بنایا گیا ہے۔

گیارھواں کشمیری دروازہ: یہ دروازہ کشمیریوں کے نام سے منسوب ہے اس لیے رخ اس دروازے کا کشمیر کی سمت ہے جیسے کہ دہلی دروازہ، دہلی کی سمت ہونے کے سبب سے دہلی دروازہ کہلاتا ہے۔ یا یہ سبب ہوگا کہ بہ وقت آبادی شہر کے جس طرح کہ بھاٹی دروازے کے پاس بھاٹ قیام پزیر ہوئے تھے، اس جگہ کشمیریوں کو آبادی کیا گیا ہوگا۔ یہ دروازہ بھی نہایت بوسیدہ اور خستہ تھا۔ سرکار انگریزی نے انگریزی وضع اور دروازہ بھاٹی کی قطع پر اب بنوایا ہے۔

بارھواں خضری دروازہ: وجہ تسمیہ اس دروازے کا (دروازے کی) یہ ہے کہ زمانہ سلف میں دریائے راوی شہر کے بہت نزدیک بہتا تھا۔ خصوصاً اس دروازے کے تو آگے کشتی پڑتی تھی۔ چونکہ خواجہ خضر کو دریاؤں کے ساتھ کمال نسبت ہے اور میر البحار اُن کا خطاب ہے۔ بہ سبب قرب دریا کے اس دروازے کا نام خضری دروازہ رکھا گیا۔ مگر اب لوگ اس کو شیراں والا دروازہ کہتے ہیں۔ باعث یہ ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت ہمیشہ دو شیروں کے پنجرے اس دروازے کے اندر رکھتے تھے اور خبرگیری شیروں کی محافظانِ دروازہ کے متعلق تھی۔ انگریزی عہد میں وہ پنجرے اُٹھوائے گئے مگر دروازے کا نام شیراں والا

دروازہ بحال رہا۔

تیرھواں ذکی دروازہ المعروف یکی دروازہ:

یہ دروازہ پیر ذکی شہید کے نام سے مشہور ہے جس کے سر کی قبر عین دروازے کے اندر ہے اور جسم بے سر کی قبر شہر کے اندر ایک طویلے میں ہے جو اس دروازے کے پاس ہی واقع ہے۔ دونوں جگہ قبریں بنی ہیں اور اعتقاد مند لوگ آ کر فاتحہ کہتے ہیں۔ یہ بزرگ مغلیہ محاصرے کے وقت اس دروازے کا محافظ تھا۔ جب شہر فتح ہوا اور رعایا قتل ہوئی تو اس نے بہ کمال دلاوری دشمنوں کا مقابلہ کیا اور دروازے کے اندر شہید ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ پیر ذکی کا سر گردن سے جدا ہو گیا تو جسم بے سر اُس مقام تک دشمنوں سے لڑتا چلا گیا، جہاں اب جسمِ بے سر کی قبر شہر کے اندر ہے دونوں قبریں اب زیارت گاہ خاص و عام ہیں۔ یہ دروازہ بھی بہ سبب کہنہ اور بوسیدہ ہو جانے کے اب گرا دیا گیا ہے۔ عنقریب دوبارہ تعمیر ہوگا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت بہ نظرِ استحکام فصیل و شہر پناہ لاہور کے ہمیشہ مرمت دیوار فصیل اور دروازوں کی جاری رہتی تھی اور چاروں طرف شہر کے پختہ خندق نہایت گہری بنوائی گئی تھی اور ہر ایک دروازہ کے آگے خندق پر پختہ پل بنوا کر دوہرا پختہ دروازہ تعمیر کیا گیا تھا۔ دوہرے دوہرے دروازوں اور خندق اور دھول کوٹ و پختہ دمدموں سے اس قدر استحکام شہر کو حاصل تھا کہ غنیم کبھی شہر پر متصرف نہیں ہو سکتا تھا۔

جب انگریزی امن کا وقت آیا تو دوہرے دروازے گرائے گئے۔ خندق کی اینٹیں نکلوا کر مٹی سے بھروائی گئی اور اُسی زمین پر باغچے (باغیچے) لگوائے گئے۔ نہر جاری کی گئی جس سے اب شہر کا نواح باغ بہشت بن گیا ہے۔ ملک ایاز کی آبادی کے بعد بھی یہ شہر کبھی ترقی اور کبھی تنزل کی حالت میں رہا۔ اس کی آبادی کی بڑی ترقی بہ عہدِ سلطنت اکبری و جہانگیری وشاہ جہانی و عالمگیری ہوئی اور بڑے بڑے محلے بیرونِ حصار قدیم آباد ہو گئے۔ عالمگیر کی سلطنت کے بعد اس کے تنزل کا زمانہ شروع ہوا۔ ضعفِ سلطنت و بادشاہ گردی نے وہ آفتیں برپا کیں کہ سکھوں نے لوٹ کر اس کو برباد کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت اگرچہ بیرونی ویران شدہ محلوں میں سے کوئی آباد نہ ہوا مگر حصار کے اندرونی شہر کی آبادی اچھی طرح سے ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

ماخوذ: تاریخِ لاہور ۱۸۸۴ ___ آنجہانی کنھیا لال ہندی

لاہور اور ہائیڈل برگ

یہ تو اب ساری دنیا کو معلوم ہو گیا ہے کہ لاہور شہر کو یونیسکو نے دنیا کے ستائیسویں ادب اور تہذیب کے نمائندہ شہر کا درجہ دے دیا ہے لیکن یہ بات شاید بہت کم دوستوں کے علم میں ہو کہ اس اعزاز کے ساتھ جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ اور اور اس کے پاکستان دوستوں کا کیا تعلق اور کردار ہے اس کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ خود سے کوئی ملک یا شہر اس اعزاز کے لیے اپنے آپ کو پیش نہیں کرسکتا اس کے لیے کسی دوسرے ممبر ملک یا شہر کو اُس کا نام تجویز کرنا ہوتا ہے اور اس سے وابستہ متعلقات کی ایک طویل فہرست ہے، جس کی تکمیل اور پیروی بھی اس تجویز کرنے والے شہر کے ذمہ ہوتی ہے اور لاہور کے کیس میں یہ شہر وہی ہائیڈرل برگ تھا، جس کے دریائے نیکر کے کنارے اقبال نے اپنی ایک مشہور نظم بھی تخلیق کی تھی- یہ اب سے کوئی تین برس قبل کی بات ہے لاہور کے اس وقت کے میئر صاحب کی طرف سے دعوت ملی کہ جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ سے وہاں کے ایک پاکستانی نژاد پارلیمنٹرین وسیم بٹ اُن کے پاس آ رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی اس میں شرکت کروں کہ معاملہ لاہور شہر کو ادب کے حوالے سے ایک اعزاز دلوانے کا ہے، اس سارے قصے میں میرے لیے اس وقت صرف ''ادب'' کا حوالہ ہی معنی رکھتا تھا، یہ اور بات ہے کہ ملاقات میں شرکت کے بعد سے اس کا دائرہ پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے، وسیم بٹ میرے اندازے کے برخلاف بہت زیادہ کم عمر بلکہ لڑکے سے لگتے تھے، جن کو دیکھ کر یہ یقین کرنا بہت مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ ایسے اعلیٰ عہدے کے حامل اور اس قدر شدید پاکستان دوست ہو سکتے ہیں کہ نہ

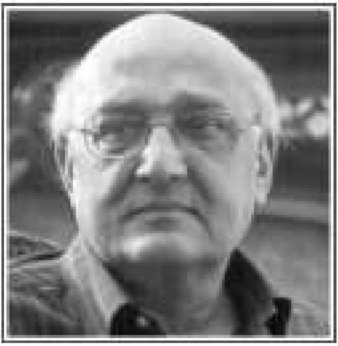

امجد اسلام امجد

صرف ان کی پیدائش وہاں کی ہے بلکہ اُن کی ساری زندگی بھی وہیں گزری ہے۔ ملاقات میں انھوں نے ماسکو کے حوالے سے پاکستان کو دنیا کے بڑے ادبی شہروں کی فہرست میں شامل کرانے اور اس کی اہمیت کا ذکر تو کیا مگر سچی بات ہے کہ اُس مختصر ملاقات میں یہ بات پوری طرح سے میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی اب جو عالمی درجہ بندی میں لاہور اور پاکستان کو یہ مقام اور یہ اعزاز مل گیا ہے تو اس کی اہمیت کھل کر سامنے آرہی ہے۔ وسیم بٹ نے بعد کی ایک اور ملاقات میں بتایا کہ وہ ہائیڈل برگ شہر کی انتظامیہ کی طرف سے پاکستان سے کچھ دوستوں کو جرمنی مدعو کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں، جس میں میرا نام بھی شامل ہے مگر پھر کرونا کا زمانہ شروع ہو گیا اور ساری دنیا ہی ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ چند دن قبل مجھے اُن کا ایک واٹس ایپ میسیج ملا کہ وائس آف جرمنی کی طرف سے لاہور کو ملنے والے اس عالمی اعزاز کے حوالے سے ایک زوم میٹنگ کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس میں سلیمہ ہاشمی اور سابق میئر لاہور کے علاوہ مجھے بھی شرکت کرنا ہوگی۔ سو میں نے وعدہ کر لیا اور وقت مقررہ پر تیار ہو کر اور موبائل فون سامنے رکھ کر بیٹھ بھی گیا مگر یہ بات مجھے یاد نہ رہی کہ میں نے دو دن قبل ہی فون بدلا تھا اور ابھی میرے اس نئے فون میں زوم ایپ ڈاؤن لوڈ نہیں ہوئی تھی، اس طرح کے کام عام طور پر میرا بیٹا علی ذی شان یا بہو رابعہ ہی کرتی ہے اور اتفاق سے وہ دونوں اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ میں نے اپنی عقل کے مطابق اور جرمنی کے دوستوں کی رہنمائی سے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کسی طرح بھی بات نہ بن سکی اور اگرچہ دس منٹ بعد ہی مجھے اس کی ویڈیو ریکارڈنگ مل گئی تھی، جس سے مجھے اس میں ہونے والی باتوں کا تو پتہ چل گیا مگر میں خود اس کا حصہ نہ بن سکا، اتفاق کی بات ہے کہ منتظمین کی اس فرمائش کے حوالے سے کہ مجھے کچھ کلام بھی سنانا ہوگا میں نے اسی 'اعزاز' کے حوالے سے ایک کچی پکی نظم بھی موزوں کر لی تھی جو سراج اورنگ آبادی کے بقول "دھری کی دھری" ہی رہ گئی، اب میں نے اس کی کچھ فائن ٹیوننگ بھی کر لی ہے سو اسی کو درج کرنے کے ساتھ اپنی بات کو ہائیڈل برگ کے دوستوں کے خصوصی شکریہ کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ بقول شیخ سعدی یہ بھی کہنا جائز ہے کہ "اے صبا ایں ہمہ آوردہ تست"

☆☆☆☆☆

فنون

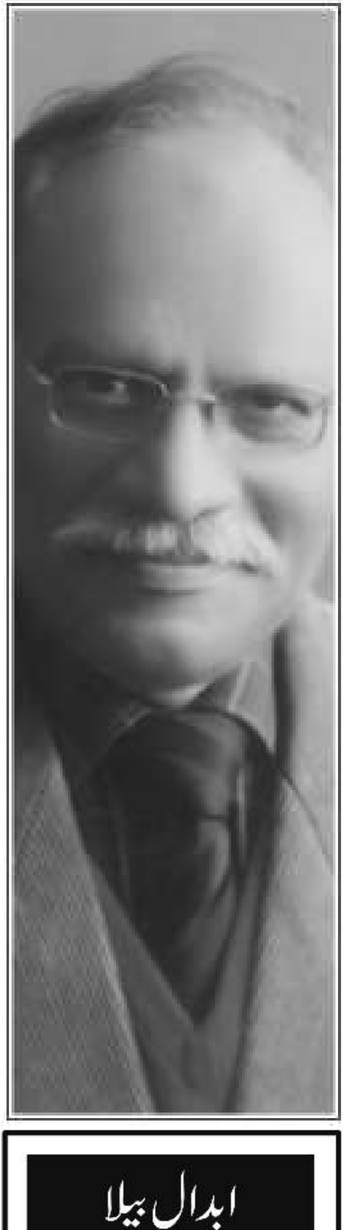

ابدال بیلا

ہال روڈ سے نکل کے میکلوڈ روڈ کو کراس کرتے ہی سامنے تھوڑی سی ٹیڑھی سیڑھیاں چڑھ کے ''فنون'' کا دفتر تھا، جہاں ''احمد ندیم قاسمی'' اپنی بید کی بنی لکڑی کی کرسی پہ ایک چپکی ہوئی بدرنگی سی گدی رکھے بیٹھے ہر آنے والے کو دیکھ کے مسکراتے جاتے۔ وہ مسکراتے تو ان کی دائیں گال پہ ایک پرانا سا زخم کا لمبا نشان ان کی مسکراہٹ میں مل کر مسکرانے لگتا اور وہ آنے والے کو سامنے کی کسی خالی کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کر دیتے۔

اُن کے سامنے کرسیوں پہ ہر وقت ایک منڈلی منڈلاتی رہتی۔

''خالد احمد'' کا گول مول چہرہ کسی نہ کسی ہنسی کی بات کو گول گپے کی طرح اپنے گالوں میں دبائے بیٹھا ہوتا۔

اکثر پھلجھڑیاں وہ چھوڑتا تھا۔

پھر سب سے اونچا قہقہہ ''عطاالحق قاسمی'' لگاتا۔

''امجد اسلام امجد'' ان دنوں کبھی کبھار اُدھر نظر آتا۔ انہی دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پہ اس کا شاہکار ڈرامہ ''وارث'' چل رہا تھا۔ ''وارث'' کی قسط جس دن ٹی وی پہ آتی۔ لاہور کی سڑکیں سنسان ہو جاتیں۔ ٹی سٹال کے باہر کرسیاں بھر جاتیں۔ وہ چائے کی

پیالی کی قیمت دوگنی کر دیتے۔ رکشے والے سواریاں چھوڑ کے، رکشہ سڑک کنارے کھڑا کر کے کسی چائے خانے میں جا کر ڈرامہ دیکھنے لگتے۔ عورتیں اپنی شاپنگ ملتوی کر دیتیں۔ بچے بڑے سب اٹھ کے ٹیلی ویژن کے ساتھ آ بیٹھتے۔ امجد اسلام امجد کے اس ایک ڈرامہ سیریل نے پورے شہر کو دبوچا ہوا تھا۔

وہ کبھی کبھار فنون کے دفتر آتا تو باقی سارے ساتھی، کبھی اس کے منہ پہ اس کے ڈرامے کی تعریف نہ کرتے۔ الٹا ہر کوئی، کوئی نہ کوئی لطیفہ ڈھونڈ کے امجد اسلام امجد پہ نشانہ بازی کرتا رہتا۔

امجد اسلام امجد اپنا شر میلا سا منہ بنا کے اپنے سر کے تھوڑے سے بالوں کی لٹوں کو پنکھے کی تیز ہوا سے بار بار اٹھا کے درمیان کے گنجے سر پہ رکھتا اور خالد احمد ہنستے ہوئے کہتا پنکھا بند کر دیں قاسمی صاحب اس کے ہاتھ تھک جاتے ہیں۔

سب پھر منہ کھول کے قہقہے لگاتے۔

صدیوں سے یہی ہماری تہذیب رہی ہے کہ اپنے ساتھی کی خوبیوں کو اپنے منہ سے کبھی نہیں کہنا۔

ہاں جب کوئی اور لوگوں کی منڈلی ہو تو اس میں سینہ پھلا کے کہہ دینا۔

وہ تو اپنا یار ہے۔

خالد احمد کی شاعری اپنے سارے ساتھیوں کے کلام سے منہری اور ست رنگی تھی۔ وہ جنہیں اپنا گرو کہتا تھا، انہوں نے بھی اتنی گہرائی اور گیرائی سے تہہ در تہہ سنسناتی لہروں بھری شاعری نہیں کی مگر گڈی ان دنوں عطا الحق قاسمی کی شاعری کی چڑھی تھی۔ اس کے ساتھی تنگی اس پہ ہنستے ہوئے دل میں کوئی دکھی لہر بھرا سانس لے کر کہتے، عطا تجھے پاکستان سے باہر کتنے بلاوے آتے ہیں۔ تو اب اپنی چھٹی نظم بھی کوئی لکھ ہی لے۔

ایک ایک غزل، نظم سے تو نے ڈھائی ڈھائی لاکھ تو کما لیے۔

محفل پھر قہقہوں سے لت پت ہو جاتی۔

اس محفل میں سب سے سنجیدہ صرف آنکھوں سے بولنے والا ایک ہی شاعر ہوتا ”نجیب احمد“۔

وہ باتیں کم کرتا۔

سر گردن میں دیے مسکین سے انداز سے ہر ایک کو دیکھتا رہتا۔

مگر اس کے دیکھنے میں کچھ ایسی طراری ہوتی کہ جس کو آنکھ بھر کے دیکھتا، اُسے پتہ چل جاتا اس کی نگہ نے اس کے کونسے چھپے زخم پہ نمک پاشی کی ہے اور کونسی دکھتی رگ پہ اپنی آنکھ کی نظر ڈالی ہے۔ دوسرے بھی نجیب احمد کی نگاہوں کی بولی کی ساری تفہیم سے آگاہ تھے۔

محفل میں ہنسی کی پھر گٹھڑی کھل جاتی۔

وہ منڈلی بھی، سبھی تخلیقی لوگوں کی منڈلی جیسی تھی۔

ایک ڈور میں رنگ برنگے نگینے پتھر سیپیاں اور ہیرے پروئے ہوئے تھے۔

کوئی چوکور،

کوئی تکون۔
کوئی پانچ رخا۔
کوئی سات رنگی۔
مگر گول کوئی بھی نہیں۔
تخلیقی آدمی گول ہو ہی نہیں سکتا۔
اس لیے اس کی نکریں اتنی نکیلی ہوتی ہیں
دوسروں کے علاوہ کبھی کبھی اسے خود بھی وہ
چبھ جاتی ہیں۔
اسی چبھن سے بے چینی ہے جو اندر کے
چھلاوے کی اچھل کود سے بندے کو ساری
عمر نچاتی ہے۔
کبھی اٹھتے وقت پاؤں مارتی، کبھی مناتے
سے پیروں میں گھنگرو باندھ کے رقص کرا
دیتی۔
ہر تخلیق کے پیچھے کوئی بے چینی لرزاں رکھتی۔
پھول کی پتی پہ شبنم کی بوند سے بھی ارتعاش۔
یہی ہر تخلیقی قوت کی ماں ہے۔
تخلیق کار، ناول نگار ہو، افسانہ لکھے،
شاعری کرے، موسیقار بنا دھنیں بنائے،
مجسمہ ساز ہو یا پینٹر وہ نوکیلا رہتا۔ چبھتا۔
مگر اس کی ہر تخلیق اسے دھیرے دھیرے
گول کرتی جاتی۔
کہ وہ کسی کو چبھے نا۔
یہی شاید کسی تخلیق کا انعام ہے۔
اسی محفل میں احمد ندیم قاسمی باری باری ہر
ایک سے یہ بھی پوچھتے جاتے کچھ نیا لکھ کے
لائے ہو؟ کبھی ایک کو کہتے تو اس پہ لکھو،
دوسرے کو کہتے تو اس پہ۔ پھر وہاں لکھا ہوا
سنجیدگی سے پڑھا جاتا۔ سب سر جھکا کے
کان لگا کے، آنکھیں مٹکائے بغیر سنتے
رہتے، جب لکھا پڑھا ختم ہو جاتا تو پھر شہد کا
چھتہ مچل جاتا۔ شاعری میں تو ہر شعر کو بار بار
سنا جاتا۔ واہ، واہ بھی ہوتی اور کہیں کسی کو
جھول نظر آتا تو وہ رائی کا پہاڑ بنا کے پورے
پہاڑ کو رائی کی طرح اڑا دیتا۔
وہ بڑی شاندار تربیت گاہ تھی۔
میں بھی اپنی کہانیاں لکھ لکھ کے ادھر
لے جاتا۔
کئی بار تو احمد ندیم قاسمی وہیں میرے سامنے
لال بال پوائنٹ پکڑ کے میری کہانی کی
تہوں کو کھولنے لگتے۔ جہاں کوئی ہجے کی غلطی
ہوتی فوراً اسے درست کر دیتے۔
ایک بار میں نے انہیں ڈاک سے افسانے
کی جو کاپی بھیجی وہ نیلی کاربن کاپی تھی۔
اصل میں افسانہ پنسل سے لکھا تھا۔
فوٹو کاپی ان دنوں موجود تھی مگر وہ طالب علمی
کا زمانہ تھا۔ فوٹو کاپی مہنگی لگتی۔
کاربن پیپر سستا تھا اور بار بار استعمال بھی
ہو جاتا تھا۔ افسانہ جب لکھا گیا تو پنسل کا
لکھا پھیکا پھیکا لگا۔ نیلی کاربن کاپی شوخ
طرار خوبصورت لگی، وہی لفافے میں ڈال
کے بھیج دی۔
احمد ندیم قاسمی صاحب نے ''فنون'' میں تو
شائع کر دیا مگر جوابی خط میں گلہ کیا کہ ایڈیٹر
کو کاربن کاپی نہیں اصل کاپی بھیجا کرو۔

☆☆☆☆☆

اُچّے برج لہور دے

لاہور شہر صدیوں پرانا ہے۔ ہوش سنبھالا تو سُنا کہ لہور لہور ہے۔ پھر سُنا ''جنّے لہور نہیں ویکھیا اوہ جمیا ای نہیں''۔ ۱۹۲۸ء کی چھپی ہوئی عربی کی کتاب ۱۹۵۸ء میں پڑھی۔ یہ کتاب میٹرک کے نصاب میں شامل تھی۔ اس کی ایک نظم میں لکھا تھا ''پنجاب ہند کی آنکھ ہے اور لاہور آنکھ کی پتلی''۔ اُن دنوں پتلی تماشا بھی ہوا کرتا تھا اور خوب تھا۔ پھر یہ بھی سُنا ''نہیں ریساں شہر لہور دیاں''۔ شاعر نے فلم کے لیے گیت لکھا تو کہا ''ٹانگہ لہور دا ہووے تے پاونویں جھنگ دا...... ٹانگے والے خیر منگ دا''

جھنگ کی اہمیت اپنی جگہ مگر منگ کے ساتھ جھنگ کا قافیہ شعری مجبوری تھا۔ جھنگ کے تذکرے کے ساتھ ہیر سیال کی یاد ہی لطف دیتی ہے۔ روایتوں کے قائم رہنے کا اپنا لطف ہے۔

....

روم کی طرح لاہور بھی ایک شب میں نہیں بنا تھا۔ یہ اِس خطّے کا اہم شہر تھا۔ اِسے بستی سے شہر بننے میں صدیاں لگیں۔ پھر شعری فتویٰ یہ ہے ''بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے''۔

اُونچے برجوں والا شہر لاہور راوی کنارے بسا۔ ''اُچّے بُرج لہور دے تے ہیٹھ وگے دریا''۔ اُچے برج لہور دے کا نام سے اشفاق احمد نے لاہور ٹی وی کے لیے سیریل بھی لکھی۔ شہر لہور اور راوی دریا صدیوں تک ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہے' بڈھا راوی اس کا گواہ ہے۔ دوسرے مشہور شہروں کی طرح شہر لہور سے بھی میلے ٹھیلے جڑے تھے۔ ساون آتا تو لوگ مقبرہ جہانگیر اور شالامار باغ کا رُخ کر لیتے۔ میلہ چراغاں ہوتا تو خلقت رات کا کھانا شالامار باغ میں جا کر پکاتی اور کھاتی۔ عرس کی رات گویا پکنک کی

اسلام عظمی

رات ہوتی۔ داتا صاحب کے عرس کے موقعہ پر سڑک کے دونوں طرف سرکس اور درجنوں تھیٹر رنگ جمانے لگتے۔ شاہ جمال اور میاں میر کے عرس بھی زندگی سے بھرپور تھے۔ بسنت کا تہوار صدیوں لاہور کی روایت میں شامل رہا۔ اس کے لیے ہزاروں کی تعداد لاہوریے بیرونِ ملک سے بسنت کے لیے لاہور آتے۔ چھتیں رنگوں اور آسمان پتنگوں سے بھر جاتا۔ پھر جیسے کسی کی نظر لگ گئی اور لوگوں نے اِسے خونی کھیل بنا دیا۔ اب یہ جدید بننے کے شوق میں لاہور کہلانے لگا ہے۔

....

لاہور بارے ''نقوش'' نے لاہور نمبر نکالا اُس میں لاہور کی تاریخ سمیٹ دی۔ شہر کیسے وجود میں آتے ہیں؟ غلام عباس نے اس تناظر میں افسانہ ''آنندی'' لکھا۔ افسانے کے پس منظر میں شاید مقولہ ''جسم فروشی دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے'' تھا۔ ہندوستان میں ''آنندی'' افسانے کو لے کر فلم ''منڈی'' بنی۔ لاہور میں ایک علاقہ ''ہیرا منڈی'' کہلاتا تھا۔ کچھ لوگ اسے ٹبی بھی کہتے۔ ٹکسالی دروازے کی مناسبت سے یہ ٹکسالی کہلاتا۔ شورش کاشمیری نے اپنی تصنیف ''اُس بازار میں انسانی منڈیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ خام مال کہاں سے آتا ہے؟

یہ بھی لکھا۔ یہ بھی بتایا کہ یہ منڈی ایسی اونچائی پر تھی کہ راوی کا سیلابی پانی اس پر گرفت نہیں کر سکتا تھا۔

قدیم آبادیوں اور مزارات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کم و بیش یہ سب دریاؤں کے کنارے تھے اور قدرے بلند جگہ پر بھی۔ پانی باآسانی دستیاب رہتا اور بلندی پر ہونے کی وجہ سے سیلابی پانی گزند نہ پہنچا پاتا۔

....

لاہور شکست و ریخت کے ادوار سے گزرتا اور اُبھرتا رہا۔ سکھوں کی حکمرانی ابھی کل کی بات ہے بادشاہی مسجد گھوڑوں کا اصطبل اور اسلحہ خانہ بھی بنی۔ کچھ مہینے پہلے محمد ظہیر بدر کے ساتھ پاپڑ منڈی سے گزرا تو اُس نے ایک ''مسجد مائی جنداں'' کے بارے میں بتایا کہ جنداں رنجیت سنگھ کی مسلمان بیوی تھی۔ رانی جنداں کے نام پر یہ مسجد بنی۔ تاریخ بہت ظالم شے ہے۔ سچ دفن ہو جاتا ہے اور جھوٹ کا بول بالا۔ بات لاہور کی ہے۔ لاہور جو دل والوں کا شہر تھا اور بڑی حد تک اَب بھی ہے۔

محمد ظہیر بدر مجلس ترقی ادب کے مجلّہ ''صحیفہ'' کا ایڈیٹر رہا ہے۔ وہ لاہور کی جم پل ہے۔ اُس کے والد مری سے آ کر لاہور میں آباد

ہوئے۔ سسرال مری میں ہے۔ وہ ایک روز اپنے سسر کے ساتھ انارکلی بازار گیا۔ وہاں اُس کے سسر کے پرانے دوست کی دکان ہے۔ سسر کے دوست کو جب یہ پتا چلا کہ اُن کا داماد لاہوریا ہے تو اُس نے کہا ''شاہ جی لاہور سے رشتہ جوڑ کر اچھا کیا۔ ہم مری سے ہیں مگر انارکلی بازار میں کسی نے ہم کو کبھی ''پہاڑیا'' کہہ کر نہیں پکارا۔ ہم مری کی پہاڑیوں سے اُتر کر راولپنڈی کے راجا بازار میں چلے جائیں تو وہ ہمیں ''پہاڑیا'' سمجھتے ہیں۔ یہاں ایسا نہیں۔ مارکیٹ میں کسی سے جھگڑا ہو جائے تو بہت سے لوگ ہمارا ساتھ بھی دیتے ہیں۔ ''یہ تو پہاڑیا ہے'' کی بات کبھی سننے میں نہیں آئی۔

....

معاشرہ اچھے لوگوں اور بُرے لوگوں کا مرکب ہے۔ ''سب اچھا'' تب تک رہتا ہے جب تک اچھوں اور بُروں دونوں میں انسانیت پائی جائے۔ یہاں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے انسان تھے۔ کسی محلے میں کوئی بدمعاش پیدا ہو جاتا تو بزرگ ناک مُنہ چڑھاتے اور یہ بھی کہتے ''ایک بات تو اچھی ہوئی کہ محلے کی بہو بیٹیوں کی عزت محفوظ ہوگئی ہے''۔

لاہور کا ماضی محبت بھرا تھا۔ یہ کھلے دل والوں کا شہر تھا۔ یاد آگیا کہ ابوظہبی میں کراچی کے افسانہ نگار طاہر نقوی آئے ہوئے تھے۔ لاہور اور کراچی کے چند دوست اُن کے پاس بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں پولیس کا تذکرہ چل نکلا۔ طاہر نقوی نے کہا کہ پنجابی پولیس اُردو والوں کو بہت تنگ کرتی ہے۔ محمد ظہیر بدر نے جھٹ درستی کی ''بھائی یہ پنجابی پولیس کیا؟ پولیس پولیس ہے۔ میں کئی سال کراچی میں رہا ہوں۔ پولیس میرے ساتھ بھی وہی کرتی تھی جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتی ہے''۔

بدسلوکی کا غیر ضروری واویلا انسانوں نے شاید شیطان سے سیکھا ہے۔ لاہور داتا کی نگری کہلاتا ہے تو داتا جیسا ظرف بھی رکھتا ہے۔ بلند ظرف لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور کم ظرف بھی۔ مثبت سوچ صحت مند معاشرے کی نشانی ہے۔ یہی لوگ معاشرے کی حسن ہیں۔

راوی کا پانی ہندوستان نے روک لیا ہے۔ تھوڑا بہت جو بچا ہے اِسے ہم نے گدلا کر دیا ہے۔ لاہور کے لوگوں کی زندہ دلی پھر بھی قائم ہے۔

....

جنوبی پنجاب کی ابحاث جب زوروں پر تھیں تو ایک دوست بار بار کہہ رہا تھا۔

''ہمیں صوبہ چاہیے اور لے کر رہیں گے''۔

پاس بیٹھے ہوئے لوگ سنتے رہے۔ بھاشن طویل ہو گیا تو سننے والوں میں سے ایک نے اُکتا کر کہا ''بھائی شوق سے نیا صوبہ بناؤ۔ نیا صوبہ بننے کے بعد کیا لاہور، لاہور نہیں رہے گا۔ لاہور داتا کی نگری ہے۔ داتا دربار کے آس پاس کے تندوروں سے خیرات کرنے والی روٹیوں سے کئی ہزار لوگ پیٹ بھر لیتے ہیں۔ کیا داتا کا مزار اکھاڑ کر ساتھ لے جاؤ گے۔ بھائی لاہور لاہور، لاہور ہی رہے گا اور تم بھی یہیں''۔

....

لاہور تعصب سے پاک شہر رہا ہے۔ سچ اس کے لیے سچ اور جھوٹ جھوٹ تھا۔ لاہوریے بچوں کی شادیاں لاہور ہی میں کرتے۔ خوشی اور غم کے مواقع پر باآسانی شرکت رہتی۔ اپنے ہی بستر سے جاگنا اس شہر کی روایت تھی۔ تنگ گلیوں اور ایک کمروں میں زندگی بسر کر دیتے۔ حرف شکایت بہت کم تھا۔ لاہور کی تنگ گلیوں اور خستہ مکانوں میں کتنے ہی پردیسی آباد ہوئے اور اس کی مٹی میں مٹی ہو گئے۔ لاہور میں آ بسنے والے اور یہیں مدفون ہونے والوں کی فہرست بنائی جائے تو سیکڑوں صفحات بھی کم پڑ جائیں۔ کوئی کوئی شخص نقل مکانی کیوں کرتا ہے؟ اس کی وجوہات مختلف ہو سکتی ہیں مگر تہذیبوں کا پھیلاؤ ہجرتوں اور نقل مکانیوں ہی سے ہوا ہے۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آ گیا چلتے چلتے سنتے جائیے۔ لطیفہ لطیف بات سے مشتق ہے۔ بیرونِ ملک سیالکوٹی اور لاہوری اکٹھے بیٹھے تھے۔ لاہوریے نے سیالکوٹی سے پوچھا: ''تم ہر وقت سیالکوٹ سیالکوٹ کی رٹ لگائے رکھتے ہو۔ سیالکوٹ کے کسی مشہور بندے کا نام بتاؤ؟''

''علامہ سر محمد اقبال۔''

''اُس کی تو ساری عمر لاہور میں گزری ہے۔''

''پیدا تو وہ سیالکوٹ میں ہوا تھا۔''

لاہوریے نے کچھ سوچا پھر کہا ''شکر کرو کہ وہ لاہور آ گیا تھا۔ سیالکوٹ ہی میں رہتا تو زیادہ سے زیادہ فٹ بالوں کی فیکٹری لگا لیتا''۔ ایسی نوک جوک زندگی کا خاصہ ہے۔ مشکل تب پیش آتی ہے جب کوئی ایسی باتوں کو دل پہ لے لیتا ہے۔

....

لاہور ایک علمی شہر تھا۔ کالج اس کی پہچان تھے۔ کالج تو اب بھی بہت ہیں مگر تعلیم فرنچائز ہو گئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت والا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ وہ جو کہتے تھے کہ نو

ناجی وڈ آوٹ کالج۔ طالب علموں کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ کبھی بورڈ کے امتحان میں اوّل آنے والوں کے نمبر اسی پچاسی فی صد سے نہیں بڑھتے تھے۔ اب ننانوے فی صد بھی کم لگتے ہیں۔ سیانا پن اپنی حدود کے اندر ہی رہے تو اچھا ہے۔

....

لاہور کے کسی محلے میں کوئی بدمعاش پیدا ہوجاتا تو بزرگ اُسے بُرا کہتے مگر ساتھ یہ بھی کہتے ''اچھا ہوا کہ محلے کی بہو بیٹیوں کی عزت محفوظ ہوگئی''۔ شادی بیاہ کے لیے کسی لڑکے کی جانچ کرنا ہوتی تو کہتے اسے تاش کی بازی کھیلتے ہوئے دیکھو۔ جب ہارے گا تو اس کے لہجے سے اس کی پہچان ہو جائے۔ معاشرہ اچھائی اور برائی سے مرکب ہے۔ انسانیت ان دونوں میں ضروری ہے۔

....

تیس سال پردیس میں گزارنے کے بعد واپس وطن لوٹا تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ لکھاریوں کی پناہ گاہ ''پاک ٹی ہاؤس'' بند تھی۔ تب حسین مجروح حلقۂ ارباب ذوق کا سیکرٹری تھا۔ اُس نے بہت شور مچایا۔ ایوانِ اقبال میں اجلاس منعقد کرنے تک کچھ اجلاس فٹ پاتھ پر بھی منعقد کیے۔ پھر یوں ہوا کہ حسین مجروح نے حبیب بنک یا پھر حبیب بنک نے حسین مجروح سے ہاتھ چھڑا لیا۔ رفاقتوں کو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ حسین مجروح نے ''روٹی اور بوٹی'' کے نام سے ریسٹورنٹ کی پلاننگ کی مگر بیل سرے نہ چڑھی۔

....

حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس ایوانِ اقبال کے تہہ خانے میں ہونے لگے۔ پنجابی سنگت والے پلاک میں جا بسے۔ ادبی بیٹھک الحمرا میں ادبی سرگرمیاں ہونے لگیں مگر پاک ٹی ہاؤس والا لطف ندارد رہا۔ وقت جگہوں کو جو اعتبار عطا کرتا ہے اُسے نئے بندوبست واپس نہیں لا سکتے۔ احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، اسرار زیدی، منیر نیازی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے تو لاہور جیسے سُنجا ہو گیا۔ خالد احمد کسی نہ کسی بہانے سے ادبی بیٹھک الحمرا میں مل بیٹھنے کی گنجائش نکال لیتا تھا۔ داخلے کے گیٹ کے ساتھ اُس کی میز ہر آنے والے کا استقبال کرتی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے اور خالد احمد کے قہقہے جیسے ہال نمبر تھری کو بھر دیتے۔ جب تک خالد احمد کے دم میں دم رہا وہ اپنی سعی کرتا رہا۔

آج جب یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو کیا کیا یاد آ رہا ہے۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو

گا۔ زندگی کے میلے رُکتے نہیں۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والے آتے ہیں۔ پٹاری سے سانپ اور جیب سے کبوتر نکالنے والے آتے ہیں۔ غلغلہ مچا ہے...... بہار آوے ای آوے..... مگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہو تو بہار کیا کرے۔

شیکسپیئر نے کہا ”دنیا ایک سٹیج ہے اور ہم سب اداکار“ ہر کوئی اپنے حصے کا تماشا دکھاتا ہے اور دوسروں کے لیے سٹیج خالی کر دیتا۔ تماشا چلتا رہتا ہے۔

....

۲۰۱۰ء صفاں والا چوک میں‘ میں نے ”عظمی پبلی کیشنز“ کے نام سے دفتر بنایا کہ کام چلے یا نہ چلے دوست مل بیٹھا کریں گے۔ شفیق سلیمی‘ شاہد شیدائی‘ رفیق اظہر‘ کامران نذیر اور کچھ دوست چند ماہ تک تواتر سے آتے رہے۔ پھر غیر حاضریاں بڑھنے لگیں۔ ممکنہ وجہ یہ تھی کہ دفتر تیسری منزل پر تھا اور دوستوں کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رُک رُک کر سانس درست کرنا پڑتا۔ ہم یہ بات بھی بھول گئے کہ اس عمر میں گھریلو ذمہ داریاں اور صحت کے مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ تاہم دُبئی سے آئے ہوئے مہمان ڈاکٹر زبیر فاروق اور کراچی سے مصدق لاکھانی کے آنے پر کافی لوگ جمع ہوئے۔ دوستوں کی غیر حاضریاں بڑھیں تو ایک لمبا سفر طے کر کے یہاں آنے اور اکیلے بیٹھے رہنے کے بجائے جی میں آیا کہ یہ دفتر بند کر دوں۔ عباس تابش نے پہلی ملاقات ہی میں کہا کہ دفتر بنانے سے پہلے مشورہ تو کر لینا تھا۔ اُس کا مشورہ تھا کہ کوئی ادبی پرچا نکال لوں۔ اُنھی دنوں مختار مسعود کے حوالے سے پڑھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد نئی مہم جوئی نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے دفتر اچھرہ میں منتقل کر لیا۔ پھر اسے بھی دو تین سال کے بعد بند کر دیا۔

لاہور شاید ضرورت سے زیادہ پھیل چکا ہے۔ امجد اسلام امجد کو ایک بار ایک مشاعرے کی صدارت کے لیے علامہ اقبال ٹاؤن میں مدعو کیا۔ اُس نے معذرت کر لی کہ بندہ ایک بار گھر پہنچ جائے تو پھر واپس شہر کا رُخ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ادبی میل جول خاصا کم ہو چکا ہے۔

....

خالد احمد کے بعد نجیب احمد‘ اعجاز کنور راجہ اور کچھ اور دوستوں نے الحمرا کی ادبی بیٹھک میں جمعہ کے جمعہ اکٹھے ہونے کا سلسلہ برقرار رکھا اور پھر یہ رابطہ بھی اختتام کو پہنچا۔ ٹیلی فون پر ملاقاتیں بھی کچھ کم ہو گئی ہیں۔

....

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد لاہور آیا تو لاہور ایسا نہ تھا۔ انارکلی بازار کے گردونواح میں گھوم لینے سے ساٹھ ستر فی صد شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ احمد ندیم قاسمی اور احسان دانش کے دفاتر نئی انارکلی میں تھے۔ اسرار زیدی بھی وہیں رہائش پذیر تھا۔ قائم نقوی پوسٹ ماسٹر جنرل کے ہیڈ کوارٹر لوئر مال میں، روحی کنجاہی اور صابر ظفر زرعی ترقیاتی کارپوریشن کے دفتر بنک اسکوائر میں تھے۔ حسین مجروح، شاہد شیدائی، سلمان بٹ اور رفیق اظہر حبیب بنک میں تھے۔ کیا شہر تھا اور کیا کیا لوگ۔ غمِ روزگار تھا مگر نہیں تھا کہ بندہ محفلیں ہی تیاگ دے۔ دوست احباب نکھر چکے۔ بوجوہ محفلوں میں کم کم جاتا ہوں۔ ایک شعر یاد آ گیا ہے..... سن لیں

رہتے بھی ہیں اس شہر میں رہتے بھی نہیں ہیں
اِک زعم کہ ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں

لاہور کی ادبی محفلیں اور ادبی رسائل و جرائد لاہور کے ماتھے کا جھومر تھے۔ کتاب بکتی اور پڑھی بھی جاتی۔ 1983ء، میرا افسانوی مجموعہ "جوگ اور سنجوگ" چھپنے کے لیے تیار ہو گیا تو پبلشر کی تلاش میں، میں اور قائم نقوی "التحریر" کے سیف اللہ خالد کے پاس پہنچے۔ سیف اللہ خالد نے کہا "قائم نقوی! اَدبی کتابوں کا زمانہ لد چکا۔ اب تو ٹیکسٹ بکس کا دور ہے۔ ٹیکسٹ بک فاؤنڈیشن سے اجازت نامہ لینے میں تھوڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ پہلی جماعت کا "اُردو کا قاعدہ" چھاپنے پر بھی سال بھر کی روٹیاں کھری ہوئے ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں اَب کون ادبی کتاب چھاپے اور بیچنے کی جھک جھک میں پڑے۔ میرے ادارے کا نام استعمال کر کے کتاب چھاپ لو۔ وہ وقت ہے کہ کتاب چھپتی تو ہے بکتی نہیں۔ ادب بے آبرو ہو گیا ہے۔ جینوئن لکھاری اور ہر وہ شخص جو سمجھوتوں کا قائل نہیں تھا گھاٹے میں رہا۔ میں نے ایک بار "بک سٹریٹ" کے کچھ بک سیلروں سے اپنا ناول بیچنے کے رکھنے کی بات کی تو ہر جگہ سے ایک جیسا پیار بھرا جواب ملا: "کیوں نہیں، نئے شیلف بنتے ہی آپ کی کتاب منگا لیں گے۔ اپنا فون نمبر چھوڑ جائیں"۔ کچھ کچھ ایسے لگتا ہے کہ لکھاریوں کی بھی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ وہ جان چکے ہیں کہ زندگی صرف ادب ہی نہیں، ادب کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے مگر ہم جیسے لوگ!

لاہور تو شاد رہے آباد رہے۔

☆☆☆☆☆

لاہور شہرِ ادب ہے

جمیل یوسف

لاہور بلاشبہ شہرِ ادب ہے۔ یونیسکو کے ارباب بست وکشاد فکر ونظر کی داد دینی چاہیے۔ انھوں نے بجاطور پر لاہور کو شہرِ ادب قرار دیا ہے۔ ویسے تو وقتاً فوقتاً لاہور کو باغوں کا شہر بھی کہا گیا ہے۔ ماضی قریب میں اسے کالجوں کا شہر بھی کہتے تھے، مگر اس شہر کی خوبی کی اصل شناخت یہی ہے کہ یہ شہرِ ادب ہے۔ سٹی آف لٹریچر۔ سب سے پہلے لاہور کے تعلیمی اداروں کو ہی لیجیے۔ برصغیر بلکہ پوری دنیا میں کون سی ایسی تعلیمی درسگاہ ہے، جس کو گورنمنٹ کالج لاہور کی طرح اقبال اور فیض جیسے عالمی سطح کے بڑے شاعروں کی مادرِ علمی ہونے کا فخر حاصل ہو۔ جہاں پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) جیسے نابغۂ روزگار ادیب اور دانشور اور درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے ہوں۔ جہاں اقبال کے استادِ گرامی پروفیسر آرنلڈ جیسے عالمی شہرت رکھنے والے اساتذہ مسندِ ارشاد پر رونق افروز رہے ہوں یہ تین چار شخصیات تو خیر نمایاں ترین اور مشہور ترین شخصیات ہیں ورنہ اگر صرف گورنمنٹ کالج سے وابستہ شعرا ادبا اور دانش وروں کا تفصیل سے تذکرہ کیا جائے تو ایک طویل مضمون صرف اسی ایک درسگاہ کے تذکرے کے لیے ناکافی ہو۔ علامہ اقبال بھی کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج کے اساتذہ میں شامل رہے اور ہاں نابغۂ روزگار انشا پرداز اور ''آب حیات'' کے مصنف محمد حسین آزاد کا ذکر تو رہ ہی گیا ہے جو اردو ادب کے روشن ترین میناروں میں سے ہیں۔ وہ بھی گورنمنٹ کالج کے اساتذہ کرام میں شامل رہے ہیں وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کالج تشریف لایا کرتے تھے۔ کئی آفتاب و مہتاب لاہور کی باقی درسگاہوں کے ماضی کے اُفق پر جگمگا رہے ہیں۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل علامہ عبداللہ یوسف علی جیسی علمی و ادبی شخصیت بھلا کس درسگاہ کے حصے میں آئی ہوگی۔ قرآن حکیم کے

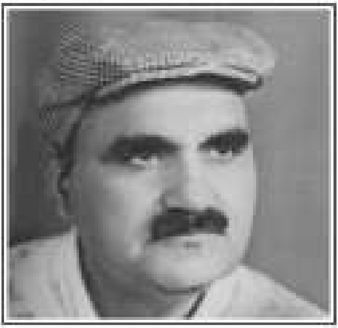

انگریزی زبان میں بے شمار تراجم و تفاسیر ہیں مگر کیا کوئی ترجمہ اور تفسیر علامہ عبداللہ یوسف علی کے ترجمے اور تفسیر ''دی ہولی قرآن'' کا مقابلہ کرسکتا ہے پھر اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر حمید احمد خان تھے، جو پرنسپل کے طور پر اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ پروفیسر حمید احمد خان پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ وہ ایک ناقابل فراموش علمی و ادبی شخصیت تھے۔

1969 میں غالب کی صد سالہ برسی پر انھوں نے غالب کی تمام تصنیفات و تخلیقات ازسرنو مدوّن کروا کے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع کروانے کا اہتمام کیا۔ مولانا حامد علی خاں کا مرتب و مدوّن کردہ دیوان غالب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس نسخے میں باقاعدہ اعراب کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو صحیح تلفظ کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ بے شمار نامور شاگردوں کے علاوہ اسلامیہ کالج کو سید ضمیر جعفری جیسے لافانی شاعر کی مادر علمی ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔

محترم سید عابد علی عابد جیسی نابغۂ روزگار شخصیت دیال سنگھ کالج کے پرنسپل کی کرسی پر رونق افروز رہی۔ میرے چچا پروفیسر انور علی بخشی کو جو گورنمنٹ کالج مری کے پرنسپل رہے، سید عابد علی عابد کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ پورے برصغیر میں سید عابد علی عابد جیسا فارسی اور اردو کا مسلم الثبوت استاد نہیں تھا۔ سید عابد علی عابد بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ اُن کی یہ غزل، اردو کی ایک شہکار اور لافانی غزل ہے، جو پچھلے ساٹھ سال سے مجھے زبانی یاد ہے میں اکثر اسے پڑھتا ہوں اور بے پایاں ادبی مسرت حاصل کرتا ہوں۔

چین پڑتا ہے دل کو آج نہ کل
وہی اُلجھن گھڑی گھڑی پل پل
میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی
اُن کے مرنے کا نام تاج محل
وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں کیا کیا ناقابل فراموش اور عہد آفریں اساتذہ مسند ارشاد پر متمکن رہے۔ مولانا محمد حسین آزاد جو تھے تو سرکاری طور پر گورنمنٹ کالج کے پروفیسر مگر وہ اورینٹل کالج میں بھی پڑھاتے تھے اس وقت اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج ایک ہی بلڈنگ میں ہوا کرتے تھے اورینٹل کالج کے اساتذہ میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی، مشہور شاعر اختر شیرانی کے والد گرامی، کا نام نامی ہے جن کی لافانی کتاب پنجاب میں اردو ایک اہم تصنیف ہے اور جس کا مطالعہ اردو زبان و ادب کے طلباء کے لیے ہمیشہ ناگزیر رہے گا پھر ڈاکٹر

ابواللیث صدیقی پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ، کس کس کا نام لیا جائے یہ سب شخصیات اردو ادب کا اثاثہ ہیں۔ ایسے لوگ کس شہر کو اور کس درسگاہ کو میسر تھے

لاہور کی عظیم درس گاہوں سے باہر نکل کر دیکھیں تو ممتاز اور بے مثالی ادیبوں، شاعروں کی ایک جگمگ جگمگ کرتی کہکشاں نگاروں کو خیرہ کرتی ہے۔ جن میں سے صرف چند اہم ترین نام ہی لیے جا سکتے ہیں۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، سید عبدالحمید عدم، سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ابن انشاء، احسان دانش، شورش کاشمیری، یوسف ظفر، حبیب جالب، قیوم نظر، ن م راشد، ایم ڈی تاثر، شہزاد احمد، ظہیر کاشمیری، احمد مشتاق، منیر نیازی، ناصر کاظمی، سیف الدین سیف، احمد راہی، استاد دامن، ساغر صدیقی، خالد احمد، اے جی جوش اور اگر میں پیدا ہونے والے اور لاہور میں قیام کرنے والے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں، تنقید نگاروں، کالم نگاروں اور صحافیوں کا خیال کروں تو کیسے کیسے نام یاد آتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج، فیاض محمود، ایم اسلم، حجاب امتیاز علی، میرزا ادیب، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، غلام عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، رضیہ بٹ، اے حمید، عبداللہ حسین، شفیق الرحمٰن، آغا بابر، اشفاق احمد، انتظار حسین، چراغ حسن حسرت، شہرت بخاری، مختار مسعود۔

نقادانِ ادب میں سید عابد علی عابد، پروفیسر حمید احمد خان، مولانا حامد علی خاں، ڈاکٹر وزیر آغا، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر جیلانی کامرانی، مظفر علی سید، سید علی عباس جلالپوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر وحید احمد قریشی، ڈاکٹر آفتاب احمد، ڈاکٹر جاوید اقبال اور اب دنیائے صحافت کے آفتاب و مہتاب۔ مولانا ظفر علی خان، شورش کاشمیری، حمید نظامی، مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، کالم نگاروں میں عبدالقادر حسن، حمید اختر، میم شین، دینی و مذہبی ادب میں مولانا سید عبداللہ مودودی، علامہ مشرقی، غلام احمد پرویز، نعیم صدیقی، امین احسن اصلاحی، ڈاکٹر اسرار۔

اس قلم برداشتہ فہرست میں ابھی وہ شخصیات شامل نہیں ہیں جو بفضلِ خدا ابھی تک زندہ سلامت ہیں اللہ تعالیٰ انھیں تادیر ہمارے درمیان زندہ سلامت رکھے۔ میں نے صرف ان اہلِ علم و ادب اور اہلِ قلم کو یاد کیا ہے، جن پر غالب کا یہ مشہور شعر صادق آتا ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

....

جو ادبی رسائل و جرائد لاہور کے طلوع ہوئے اور اور آسمانِ ادب کو چکا چوند کرتے رہے ان میں اپنے معیار اور ہمہ جہت تنوع کے اعتبار سے محمد طفیل کا نقوش سرِ فہرست ہے اردو ادب کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ایسا معتبر و مستند رسالہ کسی اور شہر سے نہیں نکلا۔ اس کے علاوہ ادب لطیف، نیرنگ خیال، ادبی دنیا، ہمایوں، الحمرا، اوراق، فنون، تخلیق اور بیاض، جیسے اہم ادبی جرائد یہاں سے اشاعت پذیر ہوئے اردو ڈائجسٹ کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے اور گورنمنٹ کالج لاہور کا مجلہ راوی اور اسلامیہ کالج کا کریسنٹ بھی ہیں یہ سب کچھ حافظے سے قلم برداشتہ لکھ رہا ہوں۔

لاہور کے علاوہ کس شہر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہاں حضرت داتا گنج بخشؒ جیسا ولی اللہ محو خواب ہو جس نے آج سے نو صدیاں پہلے عالمی شہرت یافتہ، تصوف و سلوک کی پہلی کتاب کشف المحجوب قلم بند کی ہو، جس کا ترجمہ بڑی عالمی زبان میں کیا گیا ہو، علم و ادب کے جو چشمے اس شہر خوبی کی خاک سے پھوٹے ہیں کیا عجب وہ سب اسی مرد حق آگاہ کا فیض ہو۔ یہ فیض صدیوں سے جاری و ساری ہے۔

گنج بخش فیض عالم، مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را راہ نما

....

علم و ادب کے حوالے سے لاہور کی یہی پہچان تھی اور اسی پہچان کے اثرات تھے کہ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو امریکہ کو یہاں اپنے ادب و ثقافت کے بیج بونے کا خیال آیا وہ لاہور میں ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتا تھا جو نمایاں اور قابل ذکر امریکی کتابوں کا ترجمہ کروا کے ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرے۔ اس مقصد کے لیے مال روڈ پر فیروز سنز کے تقریباً بالمقابل مکتبہ فرینکلن قائم کیا گیا اور اس ادارے کے انتظام و انصرام کے لیے ہمایوں اور الحمرا کے مدیر مولانا حامد علی خاں کو ڈائریکٹر مقرر کیا گیا اور ان کو اتنے خطیر مشاہرے پر رکھا گیا، جس کا تصور اُس وقت پاکستان میں نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت ملک میں کسی بھی سرکاری ملازم کی تنخواہ اتنی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک لش لش کرتی لمبی امریکن کار بھی اُن کو فراہم کی گئی وہ تقریباً 20 سال اس ادارے کے سربراہ رہے اور مختلف موضوعات پر 750 کے لگ بھگ کتابوں کا ترجمہ کروایا ترجمے کی درستی اور زبان و بیان کی صحت کی نگرانی خود کرتے تھے۔

لاہور کے حوالے سے کتابوں کا ذکر کرتے

ہوئے میں جناب پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی کی معرکتہ الآرا تصنیف ''عربی ادب قبل از اسلام'' کی طرف قارئین کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ صرف لاہور کا اعزاز ہی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کا اعزاز بھی ہے کہ ایک ایسی تصنیف اس شہر ادب میں منصۂ شہود پر آئی جو دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب کے شہکار ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جن ملکوں کی قومی زبان عربی ہے وہ عربی ادب قبل از اسلام کے بارے میں جاننے کے لیے اس کتاب سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کتاب کی زبان اور اس کا بیان غالب کے اس مصرع کی یاد دلاتا ہے:

ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا۔

عربی زبان کے محاوروں اور تشبیہات کی نزاکتوں اور لطافتوں کو جس خوبی سے مصنف نے اردو میں ڈھالا ہے اس کی تعریف و توصیف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس تصنیف نے اردو کو مزید باثروت کر دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب کاروں، موٹروں، ویگنوں اور رکشوں کا موجودہ پاگل کر دینے والا شور وغل نہیں تھا، لاہور مال روڈ پر تانگے چلا کرتے تھے اور اسے چھتنار درختوں کی وجہ سے ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا، یہاں ادب محوِ خرام نظر آتا تھا۔ 58-1957 میں جب میں یہاں گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور نیو ہوسٹل میں رہتا تھا شام کو ہم تین چار دوست ہوسٹل سے نکل کر سیر کے لیے پیدل باغ جناح (لارنس گارڈن) جایا کرتے تھے۔ میں نے کئی بار ادبی دنیا کے ایڈیٹر اور عظیم انشا پرداز مولانا صلاح الدین احمد کو کوٹ پینٹ میں ملبوس سولہ ہیٹ سر پہ سجائے ہوئے مال روڈ کی فٹ پاتھوں پر محوِ خرام دیکھا ہے۔ ایک دن صبح سویرے ساغر صدیقی کو کالا لباس پہنے اور اوپر کالی چادر اوڑھے انارکلی میں تیز تیز قدموں سے جاتے ہوئے دیکھا۔ آگے بڑھ کر پوچھا ''جناب جہاں جا رہے ہیں۔ کہنے لگے ''ازل سے ابد کی طرف۔'' منیر نیازی، سفید قمیض اور شلوار میں ملبوس ماڈل ٹاؤن کی بڑی سڑک کے فٹ پاتھ پر ٹہلتے ہوئے ایک دوست سے یوں گویا ہوئے۔ ''لوگ کہتے ہیں، میں نے دس سالوں سے کوئی نئی غزل نہیں کہی وہ غالب کو کچھ نہیں کہتے۔ اُس نے ڈیڑھ سو سال سے کوئی تازہ غزل نہیں کہی۔''

1970 میں لاہور چھاؤنی کے صدر بازار میں ایک چھوٹے سے مکان میں سید عابد علی عابد کو شوگر کے علاج کا ٹیکہ لگاتے ہوئے دیکھا، وہ چارپائی پر اپنی ننگی ران پھیلائے بیٹھے تھے اسی حالت میں مجھے اندر بلا لیا اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ فرمایا میں آپ کے مشاعرے میں واہ چھاؤنی

آجاؤں گا مگر آنے جانے کا کرایہ آپ کو پیشگی ادا کرنا ہوگا۔"
لاہور چھاؤنی میں صدر میں ہی ایک دوسری جگہ سید عبدالحمید عدم میرا انتظار کر رہے تھے مجھے انھوں نے بطور خاص ہدایت کی تھی کہ شراب کی بوتل بریف کیس میں چھپا کر لانا تاکہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے۔"
سمن آباد میں غالب روڈ پر ڈنمارک سے آئے ہوئے معروف شاعر محمد اقبال اختر، میرے ہمراہ قتیل شفائی سے ملنے گئے۔ انھوں نے روک لیا کہنے لگے "شام کا وقت ہے۔ شراب و کباب کے بغیر جانے نہیں دوں گا۔"
انارکلی میں ایک دکان کے پہلو سے تنگ سی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ اوپر 'فنون' کا دفتر تھا۔ وہاں احمد ندیم قاسمی تشریف فرما ہوتے تھے۔ ایک دوسرے چھوٹے کمرے عبداللہ قریشی بیٹھتے تھے ایک دن وہاں اقبال ساجد سے ملاقات ہوگئی۔ رخصت ہونے لگا تو اقبال ساجد ندیم صاحب سے بغیر سلام دعا کیے میرے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے درمیان میں انھوں نے مجھے روک لیا کہنے لگے "مجھے ایک سو روپے دیں"۔ میں نے بغیر کچھ کہے بٹوا نکالا اور سو روپے ان کی خدمت میں پیش کر دیے۔ وہ پیسے لے کر پھر واپس اوپر چلے گئے۔

ایک دفعہ الحمرا آرٹس کونسل کے ٹی روم میں جہاں کسی ادبی تنظیم کا ہفتہ وار اجلاس ہوا کرتا تھا، خالد احمد مل گئے غالباً 1998 کی بات ہے کہنے لگے "آپ نے 'بیاض' کے لیے کبھی کوئی چیز نہیں بھیجی۔ میں نے عرض کیا "جناب! آپ نے 'بیاض' کبھی مجھے بھیجا ہی نہیں۔" یاد نہیں کون سا مہینہ تھا۔ اُس مہینے سے آج تک 'بیاض' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ کیا محبت کرنے والے آدمی تھے۔
"ادب دوست" کے مدیر اعلیٰ اور لاہور کی ہردلعزیز ادبی شخصیت اے جی جوش پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ حلقے کی روایت یہ ہے کہ حاضرین مجلس میں سے کسی ادب پارے پر دورانِ بحث کوئی کچھ بھی کہتا رہے، اُسے ٹوکا یا روکا نہیں جاتا۔
ایک شخص غیر متعلقہ طور پر حضرت قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے بارے میں اپنے خبث باطن کا اظہار کرتا رہا۔ جوش صاحب کرسی صدارت پر بیٹھے پہلو بدل بدل کر اپنی باڈی لینگویج سے کرب کا اظہار کرتے رہے۔ اجلاس ختم ہوا۔ جوش صاحب اپنی چھڑی کے سہارے اُٹھ کر باہر نکلے۔ اُس شخص نے پھر کچھ کہنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ جوش (مرحوم) نے اپنی چھڑی لہراتے ہوئے اسے مخاطب کرکے کہا "سنو مسٹر۔ اب اجلاس ختم ہو چکا

ہے۔ اگر تم نے قائداعظم اور اقبال کی شان میں کوئی گستاخی کی اور کوئی نازیبا جملہ زبان سے نکالا تو میں یہ چھڑی تمہارے سر پہ دے ماروں گا۔"

پاک ٹی ہاؤس کا ذکر آ گیا ہے کیا دن تھے جب ہر شام کو یہاں مشہور و معروف ادباو شعرا کا ہجوم ہوتا تھا۔ اس زمانے میں لاہور کی سڑکوں پر آج کی طرح بے ہنگم شور وغل نہیں ہوتا تھا۔ لوگ آسانی سے آ جا سکتے تھے۔ علم و ادب کا ذوق رکھنے والے پورے ملک کے طول و عرض سے جب لاہور آتے تھے تو پاک ٹی ہاؤس کا چکر ضرور لگاتے تھے وہاں قتیل شفائی، حبیب جالب، انتظار حسین، مظفر علی سید، اور بعض اوقات احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، میرزا ادیب، شہزاد احمد، قیوم نظر، ظہیر کاشمیری، سجاد باقر رضوی، خالد احمد، اسرار زیدی، حمید اختر، اور کئی دوسری شخصیات سے ملاقات ہو جاتی تھی وہ اپنے محبوب شاعروں اور ادیبوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تھے:

کہاں گئے وہ زمانے، کہاں گئے وہ لوگ

....

پاک ٹی ہاؤس کا ادب اور ادیب دوست مالک جب رضائے الٰہی سے انتقال کر گیا تو اُس کے بچوں نے ادیبوں اور شاعروں کی اس بیٹھک کو خسارے کا کاروبار سمجھتے ہوئے پاک ٹی ہاؤس کی جگہ ٹائروں کی دکان شروع کر دی۔ یہ تاریخی ادبی ٹھکانہ چھن جانے پر لاہور کے شاعروں اور ادیبوں کا ایک وفد پنجاب کے وزیر اعلیٰ سے ملا اور اپنی محرومی کی فریاد کی۔ حکومت پنجاب نے پاک ٹی ہاؤس والی بلڈنگ مالکوں سے خرید کر وہاں پاک ٹی ہاؤس دوبارہ کھول دیا۔ اب یہ ٹی ہاؤس کوئی ادب دوست شخص نہیں چلا رہا۔ بلکہ حکومت کا ایک بے ذوق ملازم یا کوئی ٹھیکیدار چلا رہا ہے جسے ادب نوازی کا نہیں، منافع اندوزی کا شوق ہے۔ دو تین سال پہلے میں وہاں گیا تو میرے بیٹھتے ہی، بیرا مینو لے آیا۔ میں نے منیجر کو بلا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ حرکت پاک ٹی ہاؤس کی روایت کے سراسر خلاف ہے۔ یہاں آنے والوں کے سامنے کوئی مینو لا کر نہیں رکھتا تھا۔ یہاں تو اہل قلم اور ادب کے رسیا طلباء اور سیاح بیٹھنے، وقت گزارنے اور گپ شپ لگانے آیا کرتے تھے۔ اپنی مرضی سے جب چاہتے چائے کا یا کھانے کا آرڈر بھی دے دیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھار کوئی ادیب اور شاعر بل ادا کیے بغیر بھی اُٹھ جاتا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس کا (مرحوم) مالک اس کا مطلب یہ لیتا تھا کہ اس وقت صاحب کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پھر ادا کر دے گا۔ وہ تقاضا نہیں کرتا تھا۔ اب ایسے لوگ کہاں۔

اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

☆☆☆☆☆

میری ماں کا میکہ ___ لاہور

بشریٰ رحمٰن

وہ ملبے کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا۔ جس پر ہم دونوں ماں بیٹیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ادھر ادھر توڑ پھوڑ کرنے والی مشینیں بھی اپنا کام کر رہی تھیں۔ میری امی نے ویسے تو برقعہ پہنا ہوا تھا۔ مگر پورا نقاب الٹ دیا تھا اور بڑی اضطرابی کیفیت میں ملبے کے ڈھیر کو اور پھر سامنے بچی ہوئی ایک دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا اس دیوار کے ساتھ جڑے ہوئے جتنے گھر تھے وہ سب مشینوں نے کھرچ کر زمین بوس کر دیئے ہیں کیونکہ اونچی دیوار پر گھروں کے نشانات باقی رہ گئے تھے۔ دور تک اضطرابی کیفیت میں دیکھ کر میری امی نے اس کھرچی ہوئی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں ہمارا گھر تھا۔“ پھر ملبے کے ڈھیر سے اتر کر اس دیوار کے ساتھ یوں چمٹ کر کھڑی ہوگئیں۔ جیسے اس سے لپٹ کر رو رہی ہیں۔ فریاد کر رہی ہیں۔

پتہ نہیں کونسا سال تھا مجھے یاد نہیں ...... لاہور کے اندرون شہر میں ایک مشہور و معروف محلّہ ہوا کرتا تھا جسے شاہ عالمی محلّہ کہتے تھے۔ جب غلط العام ہوا تو سب اسے ”شاہلمی“ کہنے لگے۔ اس محلے میں میری نانی اماں کا گھر تھا۔ امی بتا رہی تھیں۔ یہاں گھر کا صدر دروازہ تھا۔ اس محلے میں سب سے بڑا ہمارا

گھر تھا۔ صدر دروازے کے ساتھ ایک تھڑا تھا، جو عام طور پر بڑے گھروں کے باہر ہوتا تھا۔ اس پر ایک برہمن استاد بیٹھا کرتا تھا، جسے سب "پانڈہ" کہتے تھے۔ پانڈہ محلے کے سارے بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص نہیں تھی۔ وہ اردو، حساب، انگریزی پرائمری تک پڑھاتا تھا۔ سارا دن محلے میں اک دونی دونی، دو دونی چار کا غلغلہ سنائی دیتا تھا۔ اس محلے میں ہندو مسلمان سب مل کر رہتے تھے۔ آپس میں لین دین ہوتا تھا۔ اُدھر بائیں طرف ایک تنگ گلی جاتی تھی جس میں ایک چار منزلہ مکان میں ایک بی بی رہتی تھیں۔ وہ مسلمان لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھاتی تھیں۔ سب انھیں 'بیوی جی' کہتے تھے۔ اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ جس طرح محلے والے 'پانڈے' کا احترام کرتے تھے اور اس کے ماہانہ لگا رکھے تھے۔ میری نانی اماں نے یہ تھڑا مفت ہی پانڈے کو دے دیا تھا۔ اندر چار منزلہ مکان تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی بیٹھک تھی جسے آجکل ڈرائنگ روم کہتے ہیں۔ اندر بڑا آنگن تھا۔ میری نانی اماں کے دو بھائی بال بچوں سمیت اس گھر میں رہتے تھے۔ پہلی منزل پر ایک بھائی۔ دوسری منزل پر نانی اماں تیسری منزل پر دوسرا بھائی بال بچوں اور دو بیویوں سمیت رہتا تھا۔ کیسا خوبصورت ماحول تھا۔ سب مل جل کر رہتے تھے۔ وہاں میری ایک ہندو سہیلی کا گھر تھا۔ وہاں۔ امی مجھے سارا نقشہ یوں بتا رہی تھیں جیسے انھیں سب ازبر ہو۔ حالانکہ عرصہ ہوا وہ بیاہ کر بہاول پور چلی گئی تھیں۔ تقسیم سے پہلے بہاول پور ایک دور دراز علاقہ ہی کہلاتا تھا۔

امی کا دل چاہ رہا تھا اس ٹوٹی پھوٹی دیوار کو جی بھر کر چوم لیں۔ اور ملبے کے اس ڈھیر پر اس طرح لوٹ پوٹ ہو جائیں کہ اپنے بچپن کے گھر کی اینٹیں اور خرمے چن کر اپنے پلو میں باندھ لیں۔ اور سسرال لے جائیں۔

ان کی آنکھوں سے بے رنگ آنسو بھی جاری تھے۔ آج یہ بات میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں کہ عورت کے دل میں میکہ اس طرح رہتا ہے۔ جیسے وہ یادوں کا لحاف ہو۔ نہ جانے وہ اس ملبے پر کھڑی کتنی دیر تک ماضی کے سنگ ریزے چنتی رہیں۔ میں صرف ان کی صورت دیکھتی رہی۔

معلوم نہیں کونسا سال تھا۔ جب حکومتِ پنجاب نے محلہ شاہ عالمی کو مسمار کر کے یہاں ایک بہت بڑی شاہ عالم مارکیٹ بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اور سب رہائشیوں کے گھر خرید لیے تھے۔

میری امی جان کے رشتے دار پورے لاہور میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہماری خالہ جان ریلوے کالونی میں رہتی تھیں۔ خالو ریلوے

میں افسر تھے۔ اس وقت گڑھی شاہو کا کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا نہ اس طرف سے زیادہ آمد و رفت ہوتی تھی۔ آمد و رفت کا ذریعہ لاہور کی مشہور ترین سڑک دو موریہ پل تھی۔ یہ سڑک جی ٹی روڈ سے گزرتی تھی اس کے اوپر سے ٹرین گزرتی تھی - اس کے دو دروازے تھے ایک دروازہ وسن پورہ اور شاد باغ کی طرف نکلتا تھا اور دوسرا دروازہ دلی دروازے اور یکی دروازہ کو جاتا تھا۔ اس طرف سے بھی سواری کے لیے صرف تانگے ہی چلتے تھے۔ خالہ جان کے گھر سے دو موریہ پل تک تانگے والا صرف دس آنے (پرانے) لیتا تھا۔ اور جب پل پار کر کے ہم نیچے اُتر آتے تو دلی دروزہ جانے تک تانگے والا صرف آٹھ آنے (پرانے) لیتا تھا۔

اندرون دلی دروازے امی جان کی ایک کزن رہتی تھیں۔ ہم سب ان کے گھر بہت شوق سے جاتے تھے۔ دلی دروازہ تھوک بیوپاری کا اس وقت بھی بہت معروف اور مشہور بازار تھا۔ اندر گلیوں میں لوگ رہتے تھے۔ یہ بہت تنگ گلیاں ہوتی تھیں ان میں پانی کی پائپ لائن بھی بچھی ہوئی تھیں اور عام طور پر یہ گلیاں غلاظت سے اٹی ہوتی تھیں۔ معلوم نہیں آج کے دور میں ان گلیوں کا کیا حال ہوگا۔ ان گلیوں میں بھی ایسے ہی گھر تھے۔ صدر دروازے کے ساتھ ایک بیٹھک پھر اوپر جانے والی سیڑھیاں۔ ایک کمرے کے اوپر دوسرا کمرہ، اور مزے کی بات یہ کہ ایک فیملی ایک ہی کمرے میں رہتی تھی۔ اندر ہی باورچی خانہ ہوتا تھا۔ بڑے بڑے پلنگ بچھے ہوتے تھے۔ ان کے نیچے چھوٹی چھوٹی پلنگڑیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ رات کو وہ چھوٹی پلنگڑیاں نکال کر ان پر بستر بچھا دیے جاتے تھے اور بال بچے ان پر سوتے تھے Attched Bath کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہر قدیم گھر کا بیت الخلا سب سے اوپر والی چھت پر ہوتا تھا۔ ڈائننگ روم کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ محمدی دسترخوان بچھایا جاتا اور سب مہمان اس پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ لاہور کے کلچر میں مہمان نوازی ان کی زندگی کا عنوان تھی۔ کسی مہمان کو کھانا کھلائے بغیر نہیں بھیجتے تھے۔ بازار سے چیزیں صاف ستھری ملا کرتی تھیں۔ کسی قسم کی ملاوٹ کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ہم بال بچے ان قدیم شہری گھروں میں آ کے بہت Enjoy کیا کرتے تھے - بعض شوقین لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پر کبوتر پال لیا کرتے تھے۔ شام کو ان کبوتروں کو اڑانے اور واپس بلانے کا منظر بھی دیدنی ہوتا تھا۔

دلی دروازے کے اندر ایک ڈبی بازار ہوتا تھا۔ معلوم نہیں اسے ڈبی بازار کیوں کہتے تھے مگر وہاں اشیائے خوردنی سے لے کر ملبوسات اور ہر قسم کی چیزیں فروخت

ہوتی تھیں وہاں دکانداروں کا کلچر بھی جداگانہ تھا۔
جب بھی عورتیں گزرتیں آوازہ لگاتے تھے۔
باجی جی کیہ لیناایں (باجی جی کیا لینا ہے)
آپاں جی کیہ لینااے_اماں جی کیہ لینا ایں___
وہ مسلسل اس قسم کے آوازے کستے رہتے تھے۔ شاید گاہکوں کو متوجہ کرنے کا ان کا یہی طریق کار ہو۔ میں چھوٹی سی تھی مجھے یاد ہے۔ ایک روز خرید و فروخت کے لیے میں سب بڑوں کے ساتھ وہاں سے گزری چلی جارہی تھی۔ ہمارے ساتھ ہماری ایک ممانی بھی تھیں۔
''جو خوش شکل بھی تھیں اور تنک مزاج بھی۔''
جب بار بار دکاندار انہی کو مخاطب کر کے کہنے لگے
آپاں جی کیہ لینااے (توانھوں نے جل کر کہہ دیا
تیرا کلیجہ لینااے_(تیرا کلیجہ لینا ہے)
دکاندار بھی حاضر جواب تھا۔ فوراً بولا
اندر آجاؤ___ بس پھر کیا تھا۔ میری ممانی نے چپل اتار لیا۔ اور دکاندار کی درگت بنانی شروع کر دی۔ ادھر ادھر سے لوگ بیچ بچاؤ کرنے کے لیے دوڑے آئے۔ عورت ذات کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔
ڈبی بازار کے بعد ایک سوہا بازار آتا تھا۔ جس کے اندر لاہور کے سارے سنار بیٹھتے تھے۔ یہ سب سونے کے زیورات کی دکانیں تھیں۔ اور زیورات سے بھری نظر آتی تھیں اس بازار میں آنا میری امی جان کا معمول تھا سب بہن بھائیوں کی شادیوں پر زیورات یہیں سے خریدے جاتے تھے۔ سنا ہے کہ یہ بازار اب بھی ویسا ہے اس کے بعد ایک کناری بازار تھا۔ یہاں سے شادی بیاہ کے کپڑے بنوائے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک کشمیری بازار تھا۔ باہر ایک بہت بڑا تانبے کے برتنوں کا بازار تھا۔ ہم سب بہنوں کے جہیز کے برتن وہیں سے خریدے گئے۔
لوگ بازار میں بہت سکون سے چلا کرتے تھے۔ کوئی تیزی میں نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں بھی سب سے بڑا اور مشہور انارکلی بازار تھا۔ بلکہ یہ ہی ایک برانڈ تھا۔ انارکلی بازار سے خرید و فروخت کرنا سٹیٹس سمبل تھا۔
آجکل کی طرح نہ بوتیک شاپ تھیں نہ ڈیزائنر کا کریز تھا۔ دھنی رام سٹریٹ میں چینی کے برتن ملا کرتے تھے۔ بانو بازار میں لڑکیاں چاٹ کھانے آتی تھیں۔
میری امی جان کے رشتے دار باغباں پورہ سے لے کر بادامی باغ تک رہتے تھے۔ تنگ گلیاں___ اندر سے کشادہ گھر، ایک ایک گھر میں کئی کئی خاندان___ خاندانوں کا

آپس میں ملتے رہنا۔ ایسی ہی تنگ گلیاں موچی دروازے کے اندر تھیں۔ ایسے ہی کئی کئی منزلہ گھر تھے۔ گھروں کو گھروں سے ملانے کے لیے ہمسایوں میں کھڑکیاں اور جھروکے رکھے جاتے تھے۔

میں بچپن میں امی جان کے ساتھ ہر گھر میں جاتی تھی۔ وسن پورہ بھی۔ شاد باغ بھی۔ وہ ماحول میرے معصوم ذہن میں اس طرح رچ بس گیا کہ...... کئی سالوں بعد میں نے اس ماحول پر ایک افسانہ لکھا تھا۔ سجدہ گاہیں پناہیں____''

لاہور کا حسن، لاہور کا ماحول، لاہور کی دلکشی سب میں نے اپنی ماں کے حسین وجمیل چہرے پر ہی دیکھی تھی۔ یوں تو امی جان پنجابی حسن کا شاہکار تھیں، مگر جب وہ لاہور سٹیشن پر اترتی تھیں تو ان کے چہرے کی گلابیاں ایک گلرنگ چمن کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔

امی جان کی وجہ سے ہم سب بچے لاہور کے سفر کو جنت کا سفر ہی سمجھنے لگ گئے۔ لاہور اور خیبر میل ہمارے لیے لازم وملزوم ہو گئے تھے۔ ہم سارے بہن بھائیوں کی تعلیم بھی لاہور ہی میں مکمل ہوئی لاہور ابتدا ہی سے علم وعرفان اور شعر وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ دور دور سے لوگ یہاں علم حاصل کرنے آتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ایک سکول جس کا نام مدرسۃ البنات تھا۔ وہ لاہور میں منتقل ہو گیا تھا اور 15 لیک روڈ پر سے نو تعمیر شدہ ''ہندو کالج موہن لال کالج کی عمارت الاٹ کر دی گئی تھی۔ سات جماعتیں میں نے اس سکول میں پڑھی تھیں۔ ان کا میڈیم عربی زبان تھا۔ آج بھی جب میں خواب دیکھتی ہوں تو وہی سکول میرے لاشعور سے نکل آتا ہے۔

اس سکول کی خوبی یہ بھی تھی کہ غیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعے طالبات کی کردار سازی کرتے تھے، جن میں، میں بڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ ایک سالانہ جلسہ ہوتا تھا۔ جس میں ایک بار محترمہ فاطمہؒ جناح کو چیف گیسٹ کے طور پر مدعو کیا گیا۔

شہر میں یوں بے ہنگم آبادی نہیں تھی۔ گلبرگ کا علاقہ ایک جنگل بیابان تھا۔ جہاں رات کو گزرتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے۔ اس وقت لاہور میں مشروم کی طرح آبادی نہیں بڑھتی تھیں۔ اس لیے سب سے زیادہ دیدہ زیب خوشگوار صاف ستھری آبادی ماڈل ٹاؤن کی تھی۔

نہر کا کنارہ بھی اندھیرے میں ڈوبا رہتا تھا۔ ہمارے خاندان کا یہ معمول تھا کہ سردیوں میں وہ لوگ بہاول پور میں آتے تھے۔ اور گرمی کی چھٹیوں میں ہم سب لاہور آتے تھے۔ ہم سب بال بچے بڑوں کے ساتھ رات کو سیر کے لیے نکلتے تو نہر کے کنارے چلے جاتے۔ نہر پر صرف لکڑی کے دو پل ہوا

کرتے تھے۔ مگر وہ علاقہ جگنوؤں کی وجہ سے اس طرح جگ مگ کرتا تھا جیسے کہ آسمان سے ستارے اتر آئے ہوں۔ ہم بچے بھاگ کر جگنو پکڑتے تھے اور اپنے اپنے پلو میں باندھ لیا کرتے تھے۔ ان دنوں چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں پر آئس کریم بیچنے کا رواج تھا۔ اکثر وہاں آئس کریم والے آجاتے اور ہم ان سے چار آنے اور دو آنے والی قلفیاں لے کر کھایا کرتے تھے۔ ان دنوں مال روڈ کو ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا۔ وہاں بھی رات کو لوگ باگ سیر کے لیے آتے تھے کوئی ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔ خواتین مزے سے ٹہلتی رہتی تھیں۔ آئس کریم والے وہاں بھی پہنچ جاتے تھے۔ پتہ نہیں وہاں کتنی دکانیں اور کتنے ہوٹل تھے۔ مجھے تو صرف شیزان ہوٹل۔ انڈس ہوٹل اور فلیٹیز ہوٹل کے نام ہی یاد آ رہے ہیں۔ مال روڈ سے گزر کر ہم چڑیا گھر جاتے تھے چڑیا گھر جانا گویا ہماری عید ہوتی تھی۔ شام کو وہاں گول گپے دہی بڑے اور آئس کریم والے باقاعدہ آجاتے تھے۔ غالباً 1955 یا 56 کا زمانہ تھا۔ دریائے راوی میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا۔ جس کا پانی جی پی او تک آ گیا تھا۔ ٹرینیں بند ہو گئی تھیں ہم سب چھٹیاں گزارنے لاہور آئے ہوئے تھے اور جب پانی اُتر گیا تو ایک رات جی پی او تک ڈرتے ڈرتے دیکھنے گئے تھے۔

ایبٹ روڈ اس زمانے میں لاہور کا ایک صنم خانہ تھا۔ لاتعداد سینما ہال تھے۔ جب نئی فلم لگتی تو ہجوم کی بے تابی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ بہت سے لوگ شوقیہ اس سڑک سے گزرتے تھے۔ ایکٹرسوں کی بڑی بڑی تصویریں دیکھنے کے لیے۔

جہاں اب بڑے بڑے شاندار الحمرا، ہالز بنے ہوئے ہیں۔ یہ محض ایک گراؤنڈ تھا۔ اس کے ایک کنارے پر شامیانے کی طرح کا ایک تھیٹر بنا دیا گیا تھا۔ وہاں اس زمانے میں بھی بڑے اچھے سٹیج ڈرامے ہوتے تھے۔ وہ کردار بعد میں بڑے بڑے نامور لوگ ہوئے نعیم طاہر، شعیب ہاشمی، سلیمہ ہاشمی، شمیم ہلالی، خالد عباس ڈار اور بہت سے لوگ جن کے اب نام بھی ذہن میں نہیں آ رہے۔ لاہور مشاعروں کا شہر تھا۔ آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ خواتین کے بھی بہت شاندار مشاعرے ہوتے تھے۔ اکثر مشاعروں کی صدارت میری امی جان بیگم نصرت عبدالرشید کرتی تھیں۔ میں نے بچپن میں انہیں سٹیج پر بیٹھے دیکھا اور شعروں کی داد پاتے سنا۔ میری بڑی بہن فرحت رشید بھی شاعرہ تھیں۔ وہ ترنم سے شعر سناتی تھیں۔ بچپن ہی سے ہماری تہذیب و شعر و ادب کا ذوق سرایت کر گیا تھا۔

ایسی ہی محفلوں میں ہماری ملاقات محترمہ بیگم سلمیٰ تصدق حسین سے ہو گئی تھی۔ وہ نئی

نسل سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اکثر ہمیں پاس بٹھا کر تحریک پاکستان کی باتیں سنایا کرتی تھیں اور وہ تمام روح فرسا قصے سنایا کرتی تھیں ۔ جب مسلمان عورتوں کو بازیافت کرا کے پاکستان لایا جاتا تھا وہ تحریک پاکستان کی سرگرم رکن رہی تھیں۔ انھوں نے قائداعظم سے بھی ملاقات کی تھی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح کی رفیق کار بھی رہی تھیں۔ ابتدا میں لوگوں میں اتنا سیاسی شعور نہیں تھا اور نہ ہر محفل میں سیاست پر بے تکان گفتگو ہوتی تھی۔

لاہور کو باغوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ سب سے خوبصورت اور قابل دید شالامار باغ تھا۔ صاف ستھرے فوارے چلتے رہتے تھے۔ دن میں کئی لوگ شالامار باغ دیکھنے جاتے تھے۔ پکنک منانے جاتے تھے۔ جب بھی ہمارا کوئی مہمان آتا ہم سب سے پہلے اسے شالامار باغ لے جاتے تھے۔ وہ اس کا حسن دیکھ کر مبہوت ہو جاتا تھا۔ پھر دنیا بھر کے جتنے حکمران آتے تھے ان کا استقبالیہ بھی شالیمار میں ہوتا تھا۔ سڑکیں سجائی جاتی تھیں۔ نہر کنارا سجایا جاتا تھا۔ مجھے یاد نہیں میں اس وقت کونسی کلاس میں پڑھتی تھی جب سب سے پہلے مسز کنیڈی آئی تھیں وہ ایک کھلی گاڑی میں صدر ایوب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ سڑک پر کھڑے لوگوں میں ہم نے بھی ہاتھ ہلائے تھے۔ ہمیں اس وقت وہ انتہائی خوبصورت لگی تھیں۔ خواتین نے حسب عادت ان کا ہیئر سٹائل نقل کر لیا تھا ایسے سینکڑوں واقعات ہیں جو میں لکھ سکتی ہوں مگر سب سے دردناک واقعہ یہ ہے کہ حال کے حکمرانوں نے شالامار باغ کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔ افسوس صد افسوس ــــ اگر وہ اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہتے تو پاکستان کے اندر ایک تاج محل ہوتا۔ اور بھی بہت سے تاریخی مقامات تھے۔ مقبرہ جہانگیر، ہرن مینار، مقبرہ نور جہاں اور سب سے بڑھ کر شاہی قلعہ ــــ شاہی قلعہ کی رونقیں آج بھی قائم ہیں۔ کیونکہ حکمرانوں کا رُخ اب اس طرح ہو گیا ہے۔ لوگ عام طور پر ہرن مینار پکنک منانے جایا کرتے تھے۔ روایت یہ تھی کہ ایک بار نور جہاں کا ایک ہرن کسی شکاری کے تیر کا نشانہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے پیارے ہرن کی یاد میں ہرن مینار تعمیر کر کے اسے پبلک کے لیے سیرگاہ بنا دیا تھا لاہور سے کچھ میل کے فاصلے پر جہانگیر کا عالیشان مقبرہ تھا ایک دنیا اسے دیکھنے کے لیے آتی تھی باقاعدہ ٹکٹ بھی لگتا تھا۔ ہمارا جو بھی مہمان آتا ہم اسے وہاں لے جاتے۔ اب تو خیر ایک زمانہ گزر گیا وہاں نہیں گئے، مگر جو لوگ جاتے رہے ہیں وہ بتاتے ہیں بعض بدباطن لوگوں نے وہاں سے بڑے بڑے صدر دروازے چرا لیے ہیں۔ اور بھی بہت کچھ نکال لیا ہے اور پہلے

کی طرح وہاں صفائی ستھرائی کا انتظام بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے ورثے تھے افسوس حکومتیں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں اور ان چیزوں کو اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رکھا۔ مقبرہ جہانگیر کے پہلو میں نور جہاں کا مقبرہ بھی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میٹرک میں اردو کی کتاب میں ہم نے ایک نظم پڑھی تھی:

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرامگاہ نور جہاں ہے

....

ان دنوں نور جہاں کے مزار پر کسی دلفگار نے یہ شعر لکھا ہوا تھا:

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے ہر بر دانہ سوزو نے صدائے بلبلے

....

بالکل ٹھیک نقشہ کھینچا تھا۔ مگر میں یہ سب یادیں اور باتیں اپنے بچپن کی تجوری سے نکال کر لکھ رہی ہوں ۔ آجکل ان قدیم تاریخی عمارات کا کیا حال ہے ۔ نہیں جانتی _ شاہی مسجد بھی قابلِ دید ہے ۔ آخری بار میں وہاں لیڈی ڈایانا کے ساتھ گئی تھی اور بعد ازاں مجھے ہیلری کلنٹن کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ اس وقت میں صوبائی اسمبلی کی رکن تھی ۔ دونوں خواتین نے باقاعدہ دوپٹہ پہنا تھا اور سر کو ڈھکا ہوا تھا۔

لاہور میں ایک اور شاندار تقریب میلہ چراغاں کی ہوتی تھی۔ اس میں اس قدر ہجوم ہوتا کہ جی ٹی روڈ سے گزرنا محال ہوتا تھا۔ یہ میلہ مادھو لال حسین کے مزار سے شروع ہوتا تھا۔ یہ میلہ آجکل بھی ہوتا ہے۔ مگر اب معلوم نہیں انتظامات کیسے ہوتے ہیں۔

لاہور ولیوں اور صوفیوں کا شہر بھی ہے۔ ایک خلقت صرف حضور داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کی خدمت میں سلام اور گزارشات پیش کرنے کو حاضر رہتی ہے ایک سروے کے مطابق ہاں ہر روز پچاس ہزار لوگ کھانا کھاتے ہیں یہ وہ کھانا ہے جو منتیں اتارنے والے اور عقیدت مند وہاں آکر لنگر کی صورت میں پکواتے ہیں۔

اتنا ہی عقیدت مندوں کا ہجوم میاں میر پر ہوتا ہے دن اور رات کی تخصیص نہیں ہے۔ شاہ جمال میں ہوتا ہے۔ یہیاں پاک دامن پر ہوتا ہے آپ کس کس کا نام لیں گے یہ زندہ لوگ ہیں۔ جنھوں نے دنیادار مردہ لوگوں کے دلوں کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

دس سال پہلے مجھے موچی دروازے کے اندر ایک ایسے مقام کا پتہ بتلایا گیا تھا جہاں صدیوں پہلے عالی مرتبت حضرت بختیار کاکیؒ نے قیام فرمایا تھا اور جاتے جاتے گھر والوں کو دعا دے گئے تھے کہ اس جگہ اس مقام پر جہاں انھوں نے رات گزاری ہے جو شخص دیا جلائے گا اور دعا مانگے گا سال سے پہلے اس کی دعا مستجاب ہوگی مراد پائے

گا- یہ لاہور شہر صوفیوں ولیوں اور بہت سے خفیہ اللہ والوں کی دعاؤں سے ہمیشہ ہر بلا سے محفوظ رہتا ہے-

1965 کی جنگ میں یہی دعائیں تو انڈین فوج کی ناکامی کا باعث بن گئی تھیں- اس پر ہمارے ادیبوں نے بہت کچھ لکھا تھا اب واہگہ بارڈر ہی دونوں ملکوں کے درمیان رابطہ ہے ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ واہگہ بارڈر سے جو بھی غیر ملکی لاہور آتے ہیں- لاہور کی آن بان دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں اور لاہور کو دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار کرتے ہیں مگر میں تو اس لاہور کو یاد کر رہی ہوں جو میں نے ہمیشہ اپنی ماں کے چہرے پر دیکھا تھا- گاڑی میں بیٹھتے ہی ان کا چہرہ گل و گلزار ہو جاتا تھا- آنکھیں قندیلیں بن جاتی تھیں- ماتھے پر کئی چاند نکل آتے تھے ہم سارے بچے لاہور کے سفر کو زندگی کا خوبصورت ترین سفر سمجھنے لگ گئے تھے- بھوئے آصل، کوٹ رادھا کشن، رائے ونڈ، لاہور چھاؤنی اس کے بعد __ لاہور جنکشن __ سارے سٹیشن رٹے ہوئے تھے-

لاہور شہر کی ایک ضخیم تاریخ ہے اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے- مینار پاکستان کا ذکر پھر ہو گا- اور ان شاء اللہ آئندہ کسی مہینہ لکھا جاتا رہے گا- ہماری ماں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو لاہور میں بیاہ دیا- اور خود ہمارا میکہ بن کے بہاول پور میں بیٹھی رہی- مگر وہ یہیں لاہور شہر میں ہمارے دل میں رہتی ہیں- اسی لیے اس ایک نشست میں جو وقت کی کمی کے باعث ملی ہے- میں نے وہ لاہور لکھا جو اپنی ماں کی آنکھوں سے دیکھا تھا-

اب لاہور پلازوں اور ملٹی سٹوری بلڈنگز کا ایک جنگل ہے- آبادی بڑھ گئی ہے- اتنے ہوٹل اور ریستوران کھل گئے ہیں کہ لگتا ہے گھر میں کوئی کھانا نہیں کھاتا- دنیا کا ایک کلچر ہوتا جا رہا ہے اور ساری دنیا کے ملک اس کلچر میں گھسنے کی کوشش کرتے جا رہے ہیں-

اتنی جلدی تبدیلیاں آ رہی ہیں کہ قلم اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے-

ہم چھ بہن بھائی تھے اور سب کی تعلیم لاہور میں ہوئی- میں خیبر میل کے ذریعے لاہور آتی تھی جب میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے جرنلزم میں داخلہ لیا تھا-

امن وامان کا وہ عالم تھا کہ میں تنہا ہی داخلہ لینے آئی- داخلے کے بعد ہوسٹل میں خود بندوبست کیا اور ہمیشہ خیبر میل سے آتی اور جاتی تھی-

کس قدر خوبصورت پرامن سجا سجایا تھا میرا پاکستان __ میرا لاہور کوئی وہ لاہور مجھے لوٹا دے-

بس یہی کہہ سکتی ہوں-

پھر دکھا دے اے تصور وہی صبح و شام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

ماں سے وابستہ یادیں لکھتے لکھتے میں پرانی گلیوں اور قدیم روایات کے کوچے میں جانکلی! معاف کیجیے ماضی ہمیشہ ماں کے دوپٹے کے پلو سے بندھا رہتا ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لاہور قدیم ہو یا جدید ایک بات لاہور کے بارے میں مستحکم اور مستقیم ہے، جس کو اب دنیا بھر میں تسلیم بھی کیا جا رہا ہے یعنی لاہور ہمیشہ سے ادب پروری اور سخن شناسی کا محور اور مرکز رہا ہے۔ ادب اور شعر و فن یہاں اس طرح پھلتا ہے۔ جیسے بوگن ویلیا کی بیل بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

ایسی ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں لاہور میں پیدا ہوئیں کہ آج کا ادب ان پر ناز کر رہا ہے۔ یہ بھی ایک تاریخ ساز عمل ہے وہ پنجاب بھر کے نورتن پتہ نہیں کس کششِ ثقل سے کھنچے ہوئے لاہور آجاتے ہیں۔ پھر لاہور ان کے پاؤں پکڑ لیتا ہے اور وہ شعر و ادب کی دنیا کو فتح کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ لاہور کے لوگوں کو زندہ دلان لاہور کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے لوگوں کے اندر وسعت قلبی اور اخلاص کی دولت ہے۔

کوئی فلسفہ و فکر کا دانشور، کوئی شعر و سخن کا فرہاد کوئی حرف و آگہی کا نثر نگار یا کوئی بھی سیاست دان۔ (ایسا کیوں نہ کہیں)

لاہور میں داخل ہوا۔ لاہور نے جی آیا نوں کہہ کے اسے دل میں بٹھا لیا۔ کرسی پیش کر دی اور تاج پوشی کے قابل بنا دیا۔

علامہ اقبال کے ذکر کے بغیر شعر و ادب کا ذکر کیسے ہوگا؟ اللہ نے ان کو شعر و سخن کا ایک عظیم مقصد دے کر منتخب فرمایا تھا۔ پیدا تو سیالکوٹ میں ہوئے۔ گھر لاہور کو بنالیا۔ جو آجکل ان کا میوزیم ہے) ہم نے اسے طالب علمی کے زمانے میں جن ادیبوں اور شاعروں کو بہت پڑھا تھا۔ بقول جدید لغت جن لوگوں کے ''فین'' تھے۔ ان شخصیات سے بالمشافہ لاہور میں ہی ملنے کا اتفاق ہوا شادی کے بعد میرا شہر بھی لاہور بن گیا۔ لاہور تقریبات کا شہر ہے۔ لاہور اداس شاموں کو زندہ کر دیتا ہے۔ لاہور کو پذیرائیوں کا فن آتا ہے۔ (معاف کیجیے رسوائیوں کا بھی) لاہور ہی کی بہت سی ادبی محفلوں میں شعر و ادب کی قدآور شخصیات سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ کبھی کبھی قسمت اتنی یاور ہوئی کہ ان کے ساتھ سٹیج پر بیٹھنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اس تھوڑے وقت میں اس چھوٹے سے مضمون میں ان ملاقاتوں کا طویل تذکرہ تو نہیں ہوسکتا۔ مگر ان کے ناموں کے دیئے جلا کر اس محفل میں رکھے جاسکتے ہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی، جناب ڈاکٹر وزیر آغا ان کے حوالے سے خوبصورت رسائل نقوش، اس کے خاص نمبر، فنون، اوراق، ادب لطیف، داستان سرائے، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ہاجرہ

مسرور، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، ظہیر بابر ان کے اخبار۔ عبدالعزیز خالد ایک بڑے شاعر۔ جناب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ان کا ہفتہ وار "لیل و نہار"..... جناب مرزا ادیب، جناب انتظار حسین، ڈاکٹر انور سجاد، حمید کاشمیری، ڈاکٹر وحید قریشی۔ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، سیف الدین سیف، قتیل شفائی، جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی، محترمہ فہمیدہ ، عبادت بریلوی، عبداللہ حسین، سید ضمیر جعفری، کرنل محمد خان۔ اور بے شمار بڑے لوگ۔ ناموں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو تقدیم اور تاخیر سے بے نیاز یادوں کی اندھیری کوٹھڑی سے نکلتا چلا آ رہا ہے۔ مضمون کا ظرف وسیع نہیں اور وقت کی مہلت بھی نہیں ملی۔ سب نام نہیں لکھے جا سکے۔ لاہور ایک Trand Setter شہر ہے۔ 60 کی دہائی میں جناب الطاف حسین قریشی نے اردو ڈائجسٹ نکالا۔ تو ملک بھر میں ڈائجسٹوں نے ادبی پرچوں کو مات دے دی۔ انہی ڈائجسٹوں نے آج ٹی وی کو بڑے اچھے ڈرامہ نگار دیئے ہیں۔

ایک زمانے میں سرور سکھیرا نے نئی طرز کا بڑے سائز میں رنگین رسالہ "دھنک" نکالا۔ تو ایسے پرچوں کا رواج پڑ گیا۔

میری لائبریری نے پاکٹ سائز کی کتابیں شائع کیں جنھیں آسانی سے ہم سفر بنایا جا سکے۔ تو اسی سائز میں کتابیں چھپنے لگیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پبلشر ادیب و شاعر کو قابلِ صد احترام سمجھتا تھا۔ (افسوس آج پبلشر عزت مآب ہے اور ادیب شاعر جناب جناب ہے؟)

لاہور کسی اور چیز میں خود کفیل ہوا ہو یا نہیں۔ مگر ادیب اور شاعر پیدا کرنے میں ہمیشہ خود کفیل رہا ہے۔ ایک کے بعد ایک کھیپ ماشاء اللہ چلی آ رہی ہے۔ اور لٹریچر کی دنیا میں اپنا اپنا حصہ ڈال رہی ہے۔ لاتعداد اخبار سیکڑوں کالم نگار بے شمار ادبی پرچے لاعداد ادیب۔

شاعر و دوسرے فکر و فن کے ساتھ مصور بھی موسیقار بھی۔ قوال بھی۔ ثقافت کا حصہ ہے۔ برائیاں بھی اور نت نئی رعنائیاں بھی۔ خداوند تعالیٰ لاہور کی خوبصورتیوں اور خود آرائیوں کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔ اور یہ سلسلہ یونہی ہمیشہ نئے سلسلوں کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ دیکھیے یہ سلسلۂ فکر و فن صدیاں طے کرتا ہوا ہمارے "بیاض" تک آ پہنچا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سب اہلِ فکر و فن اور پورے وطن کو ہمیشہ عافیت اور سلامتی کے ساتھ رکھے۔ آمین۔ علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم کے چند اشعار اس سلسلے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ!
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے حیات!
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات!

☆☆☆☆☆

انجنیئرنگ یونیورسٹی لاہور۔ ادب کا دبستان

غافر شہزاد

جامعہ ہندسیہ المعروف انجنیئرنگ یونیورسٹی لاہور ایک ایسا تدریسی ادارہ ہے جو وطن عزیز میں انجنیئرنگ کے مختلف شعبوں میں تیکنیکی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ذہین نوجوان تیار کرتا ہے۔ دنیا بھر میں اس یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبا نے ملک کا نام روشن کیا ہے۔ مگر انجنیئرنگ میں تعلیم حاصل کرنے والوں نے فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں میں بھی نام اور شہرت کمائی ہے۔ جنید جمشید اور جواد احمد کہ جنہوں نے گلوکاری میں ایک نیا ٹرینڈ سیٹ کیا، ان کا تعلق بھی اسی یونیورسٹی سے تھا۔ عزم الحق کہ جو ٹیلی وژن ڈراموں میں لیڈنگ رول کرتے رہے، وہ بھی اس ادارے سے وابستہ رہے۔ علم و ادب کے ساتھ جڑی کئی اہم شخصیات بھی یہاں سے فارغ التحصیل ہوئیں۔ حسن جعفر زیدی کا پاکستانیات کے حوالے سے نمایاں کام ہے اگر چہ وہ الیکٹریکل انجنیئر ہیں۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کے جوائنٹ سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ فیصل عجمی کے ساتھ ہمارا تعلق فنون کے حوالے سے تھا، وہ خوبصورت غزل گو شاعر ہیں اور

دیار غیر میں مقیم ہیں - کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں انھوں نے رہائش اختیار کرنے کی کوشش کی مگر بوجوہ یہاں کے سیاسی ومعاشی حالات، انہیں واپس دیار غیر میں جانا پڑا- ان کا رسالہ بھی نہایت معیاری تھا- -معروف شاعر توقیر احمد شریفی بھی الیکٹریکل انجنیئر ہیں

جب ہم یونیورسٹی میں داخل ہوئے، یہ 1984ء کا زمانہ تھا- ہمارا داخلہ ابتدائی طور پر مکینیکل انجنیئرنگ کے شعبہ میں ہوا تھا مگر ایک سمیسٹر پڑھنے کے بعد ہمیں شدید احساس ہو گیا کہ مکینیکل کی ڈگری ہمارے معاش کا ہمارے تخلیقی مزاج کے مطابق بندوبست نہیں کر پائے گی- اس لئے اگلے برس ہم نے آرکیٹیکچر کے شعبہ میں داخلہ لے لیا جہاں ہمیں اپنے تخیل اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا پورا پورا موقع ملا- اس وقت انجنیئرنگ یونیورسٹی کے سینئیر طالب علموں نے 'دائرہ' کے نام سے ایک ادبی تنظیم بنا رکھی تھی جس کے ہفتہ وار اجلاس سبزہ زار میں جمعہ کی سہ پہر میں کھلے آسمان تلے ہوتے تھے- 'دائرہ' کی ان نشستوں میں ہم نے بھی اپنی شاعری اور افسانہ تنقید کے لیے اپنے سینئیر دوستوں کے سامنے رکھا- اس وقت ہم احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت شائع ہونے والے ادبی مجلّہ 'فنون' میں ایک شاعر کے طور پر متعارف ہو چکے تھے- 'دائرہ' کے انتظامی امور کو دیکھنے والوں میں محمد جمیل آفاقی، ندیم فاضل ایاز، نثار محی الدین اور بعد میں ان کے بننے والی شریک حیات قمر النساء کہ جوان کی کلاس فیلو اور خوبصورت شاعرہ بھی تھیں، شامل تھے- محمد جمیل آفاقی کے افسانے فنون میں چھپتے رہے، وہ بعد میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے بیوروکریسی میں چلے گئے، ندیم فاضل ایاز جو کہانی لکھتے تھے، مکینیکل انجنیئرنگ کرنے کے بعد پہلے لاء کیا پھر انگلینڈ سے اعلی ڈگری حاصل کی، انسانی حقوق کی ایک این جی کے ساتھ وکالت کی پریکٹس کر رہے ہیں - نثار محی الدین کہ جو الیکٹریکل انجنیئرنگ میں ڈگری یافتہ تھے، جبو لان میں تحقیق اور انتظامی شعبہ میں چلے گئے اور انہوں نے گھروں اور عمارتوں کو کم قیمت اور ٹھنڈا بنانے کے لئے نئی نئی تیکنیک اور نئے نئے میٹیریل متعارف کروائے، مگر اس سارے سفر میں 'دائرہ' کو فعال بنانے والے ان دوستوں نے اپنے تخلیقی سفر کو بھلا دیا، جیسا کہ انجنیئرنگ اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے-

میں 'دائرہ' اور اس کے بعد آنے والی

لٹریری تنظیم 'لریکل فورم' کہ جس کے روح رواں رحمان حفیظ تھے، کے زمانی سنگم پر تھا۔ لریکل فورم کا قیام 1991ء میں عمل میں لایا گیا۔ میرا اپنے سے ان سینئیر دوستوں کے ساتھ بھی رابطہ تھا، کہ جو اب تک قائم ہے اور بعد میں آنے والی شعرا کی ایک پوری کھیپ کے ساتھ بھی متعارف ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ مجھے تلاش بھی رحمان حفیظ نے کیا اور لٹریری سوسائٹی کی نشستوں میں مدعو کیا۔ اس وقت کیمپس ڈائجسٹ اور ایکو میگزین نکلتے تھے۔ کیمپس ڈائجسٹ کے مدیر رحمان حفیظ جب کہ میں ایکو کا مدیر منتخب ہوا۔ رحمان حفیظ کی انتظامی صلاحیتوں اور اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیتوں کا حاصل 'انحراف' کی صورت میں اسلام آباد کی علمی و ادبی فضاؤں میں ہمارے سامنے موجود ہے جہاں ایک اور نسل علمی و ادبی میدان میں اپنا نام اور مقام بنا چکی ہے۔ مجھے شاہین عباس، نوید صادق، آصف شفیع، ادریس بابر، سلیم ساگر، شاہد فرید شاہد، عبدالرزاق ایزد، محمد نصر اللہ نصر، محمود احمد اعوان، طیب رضا، احمد فاروق، ابوبکر مغل، توصیف خواجا، ذوالفقار عادل، منظر اعجاز منظر، احمد شہریار، کاوش ابن واثق، اکبر ناصر خان، فہد سوز، نعیم اللہ انمول و دیگر شعرا سے متعارف کروانے والے رحمان حفیظ ہی تھے۔ اُس وقت میرے افسانوں کا مجموعہ ''تصویریں سانس لیتی ہیں'' (1990) اور شاعری کا مجموعہ ''چراغ آنکھوں میں'' (1991) شائع ہو چکے تھے۔

آصف شفیع اور نوید صادق نے جب 'پہلی دھوپ' کے نام سے انجینیر نگ یونیورسٹی کے شعرا کا انتخاب کیا اور اس کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو یہ بھی رحمان حفیظ ہی تھے جنہوں نے دوستوں کو قائل کیا کہ اس شعری انتخاب کا آغاز غافر شہزاد سے ہونا چاہیے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ غافر شہزاد ادبی حلقوں میں ایک پہچان رکھتے ہیں جب کہ دیگر شعرا میں اکثریت ان کی ہے کہ جو ادبی حلقوں میں اس کتاب کے توسط سے متعارف ہونے جا رہے ہیں۔ 'پہلی دھوپ' کی اشاعت نہ صرف انجینیر نگ یونیورسٹی بل کہ پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں کے حوالے سے بھی ایک واقعہ تھا اور اس نے تاریخ مرتب کی ہے۔ اس کے فلیپ احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، امجد اسلام امجد اور خورشید رضوی نے لکھے تھے۔ ان سینئیر شعرا کے لکھے حروف نے اس کتاب میں شائع ہونے والوں کو ایک اعتبار بخشا۔ شہزاد احمد

نے فلیپ میں انجینیرنگ یونیورسٹی کو دہلی اور لکھنؤ کے متوازی ایک الگ دبستان قرار دیتے ہوئے لکھا کہ لاہور میں گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج کے بعد یہ تیسرا دبستان ابھر رہا ہے۔ کتاب کی اشاعت کے بعد اس تشویش کا اظہار کیا کہ یونیورسٹی کے سلیبس کو چیک کیا جانا چاہیے کہ آخر ان طالب علموں کو کیا پڑھایا جا رہا ہے کہ یہ اتنی اچھی شاعری کر رہے ہیں۔

رحمان حفیظ ایک خوبصورت غزل گو کے طور پر جانے جاتے ہیں 1990ء کی دہائی کے شعرا کے انتخاب پر انہوں نے فرداً فرداً شعرا کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیا ہے جو نہایت اہم تنقیدی محاکمہ ہے جس میں غزل کے بدلتے ہوئے مزاج کے بارے میں اشارے موجود ہیں۔ شاہین عباس اور ادریس بابر نے بھی غزل میں ہی اپنی پہچان بنائی ہے اور ان کا نام بھی نئی نسل کے نمائندہ شعرا میں احترام سے لیا جاتا ہے۔ ادریس بابر کے عشروں نے تو نئی نسل کو خاص طور پر متوجہ کیا ہے جب کہ شاہین عباس کی غزل نئے آفاق اور نئی جہات کی تلاش میں ہے جہاں بڑے بڑوں کے پر جلتے ہیں۔ نوید صادق نے غزل اور نظم کے ساتھ ساتھ تنقیدی مضامین اور 'کارواں' کی ادارت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور وہ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا الگ تنقیدی ضابطہ بنا لیا ہے۔ ذوالفقار عادل کی حال ہی میں شائع ہونے والے شعری مجموعے نے غزل کے سنجیدہ حلقوں کو اپنی جانب بھرپور طریقے سے متوجہ کیا ہے، وہ کئی نئے مضامین لے کر غزل میں آئے ہیں۔ آصف شفیع مسلسل لکھ رہے ہیں، دیارِ غیر میں مقیم ہونے کے باوجود وہ پاکستان کی علمی و ادبی فضا سے جڑے ہوئے ہیں۔ سلیم ساگر کے لئے بھی شاعری ایک سنجیدہ تخلیقی سرگرمی ہے۔ محمود احمد اعوان نے اپنا فوکس تبدیل کرتے ہوئے پنجابی زبان میں اظہار کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے۔ ان کی پنجابی شاعری کو پنجابی زبان کے سینیئر لکھاریوں نے بہت سراہا ہے۔ توصیف خواجا اگر معاشی مجبوریوں اور انگلینڈ میں ہجرت سے دوچار نہ ہوتے تو وہ اردو نظم کی ایک نہایت توانا آواز ہوتے۔ وہ چند برسوں تک لاہور بھی مقیم رہے مگر اپنی نوکری کی مصروفیت ان کو مرکزی دھارے میں نہ لا سکی۔ اکبر ناصر خان نے سول سروس جائن کر لی اور اب وہ پولیس کے ایک ادارے کو جدید تقاضوں کے مطابق چلانے میں مصروف ہیں۔ طیب رضا ایک خوبصورت شاعر اور محبت کرنے والے انسان، اپنی نوکری کی مجبوریوں کے آگے بے بس ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

لاہور کا ادبی افق ___ تنقیدی رویے

حلقہ اربابِ ذوق لاہور کا ادارہ کم و بیش آٹھ دہائیوں سے ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیے ہوئے ہے۔ حلقہ کا اجلاس ہر اتوار کو شام پاک ٹی ہاؤس میں منعقد ہوتا ہے۔ تنقیدی اجلاس میں پہلے سے اعلان کردہ پروگرام کے تحت کوئی مضمون، افسانہ، خاکہ، انشائیہ اور اس کے بعد کوئی غزل یا نظم تنقید کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ اجلاس کے معاملات ایک سینئر ادیب شاعر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جو صدارت کر رہا ہوتا ہے۔ حاضرین صدر کے توسط سے ہی اپنی بات آگے بڑھاتے ہیں، جس کی تخلیق زیرِ تنقید ہوتی ہے، اسے گفتگو کی اجازت نہیں ہوتی۔ یونس جاوید نے اپنی کتاب میں ایسے جلسوں کی روداد کا تذکرہ کیا ہے جس سے جلسوں کی اخلاقیات کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

راقم نے دو سال تک حلقہ اربابِ ذوق کے سیکرٹری کے طور پر خدمات سرانجام دیں اور دو سالوں میں ہونے والے 101 جلسوں کی روداد دو جلدوں میں ''لاہور کا ادبی منظر نامہ'' کے نام سے اور ان جلسوں میں برائے تنقید پیش کی جانے والی تخلیقات کو ''منتخب تحریریں'' کے عنوان سے شایع کیا۔ ان جلسوں میں ہونے والی گفتگو سے حلقہ کے جلسوں میں ہونے والی تنقید کے معیار اور مزاج پر بات ہوسکتی ہے جس سے اس عہد میں تخلیقات اور تنقید کا پتہ چلتا ہے۔ ان دو برسوں میں حلقہ کے جلسوں کی نوعیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عمومی اجلاس، خصوصی اجلاس اور ماہانہ تخلیقی شخصیت کے ساتھ منعقد کیے جانے والے اجلاس۔ ہر مہینے کے چار جلسوں کی کچھ یوں تقسیم کی گئی تھی۔ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں 1980ء کی دہائی میں متعارف ہونے والی کسی نہ کسی شخصیت کے ساتھ خصوصی اجلاس۔ کم و بیش ہر مہینے اہم

غافر شہزاد

ادبی شخصیات میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کے یوم پیدائش یا یوم وفات کے حوالے سے خصوصی اجلاس جب کہ تیسری قسم کہ جو عمومی ہے، اس میں حلقہ کے تنقیدی اجلاس کا فارمیٹ وہی رکھا گیا جو کئی دہائیوں سے چل رہا تھا، یعنی ایک نثری تحریر جس میں افسانہ، مضمون، خاکہ یا انشائیہ اور شعری تخلیق میں غزلیں یا نظمیں تنقید کے لیے پیش کی گئیں۔ اگر کسی مہینے میں کسی ادبی شخصیت کے ساتھ تقریب نہ ہوتو اس ایک ہفتے میں شائع ہونے والی کسی اہم کتاب اور صاحبِ کتاب کے ساتھ شام کا اہتمام کیا گیا۔

1980ء کی دہائی سے تعلق رکھنے والی دس تخلیقی شخصیات (شفیق احمد خان، اعجاز رضوی، امجد طفیل، فرحت عباس شاہ، جمیل احمد عدیل، ڈاکٹر جاوید انور (مرحوم)، اختر شمار، جواز جعفری، عباس تابش اور سعد اللہ شاہ) کے حوالے سے نہایت کامیاب اجلاس ہوئے۔ نئی شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے سے ان دو برسوں میں خالد احمد، زاہد مسعود، ڈاکٹر ضیاء الحسن، سونیا خان، نجیب احمد، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، شفیق احمد خان، ڈاکٹر شگفتہ زکریا، منصور آفاق کے لیے خصوصی تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ اسی طرح مجید امجد، میراجی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، اختر حسین جعفری، گابریئل گارسیا مارکویز، احمد فراز و دیگر شخصیات کے حوالے سے خصوصی اجلاس ہوئے۔ کچھ اہم موضوعات پر بھی خصوصی اجلاس کروائے گئے جن میں 'اردو ناول۔ ماضی، حال اور مستقبل' اور" اردو افسانہ۔ کل، آج اور کل"، "اکیسویں صدی میں شاعری کا جواز' صوفی شعرا اور پنجابی ادب جیسے موضوعات شامل تھے۔

جب بھی کسی کو کوئی تخلیق تنقید کے لیے پیش کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، اس کی توقعات کچھ اور ہوتی ہیں۔ ایک تعداد ان ادیبوں شاعروں کی ہے کہ جو یہ توقع کرتے ہیں کہ انہیں صرف صدارت کے لیے ہی بلایا جانا چاہیے، اس لیے اگر ان کو یہ کہہ دیا جائے کہ آپ نے کوئی تخلیق تنقید کے لیے پیش کرنا ہے، تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ بعض تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اب بھی انہوں نے تنقید کے لیے ہی تخلیقات پیش کرنا ہیں تو صدارت کب کریں گے؟ کچھ احباب کہتے ہیں کہ شیڈول کیا ہے، اور اگر کسی نوجوان یا غیر معروف تخلیق کار کی تخلیقات شیڈول کی گئی ہوں، تو ان کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی سینئر کی کوئی تخلیق اگر شیڈول ہوتی تو وہ صدارت کر سکتے تھے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں کہ جب اجلاس میں حاضری قدرے کم ہوتی، اکثر صاحبان صدارت کے لیے راضی نہیں

ہوتے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس طرح ان کا صدارت کا موقع ضائع ہو جائے گا۔
صدارت کے لیے آنے والے کئی صاحبان اس دن سیکرٹری حلقہ کا خود کو مہمان تصور کرتے ہیں اور اجلاس سے پہلے، اجلاس کے دوران اور اجلاس کے بعد پاک ٹی ہاؤس میں ہونے والے تمام اخراجات کی ذمہ داری سیکرٹری کے کاندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔ کئی سینئر ارکان کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو اس روز گھر سے لانے اور پھر واپس چھوڑ کر آنے کے لیے ٹرانسپورٹ بھی مہیا کی جائے۔ حلقہ کے ایسے ارکان بھی ہیں جو سارا سال اس لیے حلقہ میں نہیں جاتے کہ اُن کو صدارت کے لیے دعوت نہیں دی گئی۔
حلقہ کے اجلاس کے آغاز میں جب کارروائی پڑھی جاتی ہے تو کئی ارکان گذشتہ اجلاس میں اپنے کہے گئے الفاظ کے بارے میں نہایت محتاط رویہ اپنائے ہوتے ہیں اور اُن کے خیال میں جو بات احاطہ تحریر میں نہیں لائی جاتی، اس پر اصرار کرتے ہیں کہ انہوں نے تو یہ بھی کہا تھا، یہ بات کارروائی کا حصہ کیوں نہیں بنائی گئی؟ اور صدر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کارروائی میں سے یہ الفاظ حذف کر دیں یا ان الفاظ کا اضافہ کر دیں۔ ایسے ارکان خاص طور پر اجلاس کے آغاز میں ہی آجاتے ہیں تاکہ گذشتہ اجلاس کی کارروائی سن سکیں۔
مضامین پر ہونے والی گفتگو میں کچھ حاضرین کا یہ وطیرہ بن گیا ہے کہ وہ پہلے انتظار کرتے ہیں کہ کچھ اور احباب گفتگو کر لیں، پھر اپنا ایک ذہن بناتے ہیں اور پھر گفتگو کرتے ہیں۔ اس گروپ میں ایسے ارکان کی اکثریت ہے کہ جنہیں اپنی رائے پر اعتماد نہیں ہوتا، اور وہ اجلاس میں اس جانب چل پڑتے ہیں جدھر ہوا چل رہی ہوتی ہے۔ حلقہ میں اگر کسی کا مضمون یا افسانہ پیش کیا جانا ہو کہ جس نے کسی گذشتہ اجلاس میں موصوف کی تخلیق پر سخت تنقید کی ہوتی ہے تو ایسی صورت میں جیسے ہی تخلیق کی خواندگی ختم ہوتی ہے، وہ صاحب فوراً تخلیق کے خلاف ایسی تقریر کر دیں گے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن جس نے تخلیق پیش کرنا ہوتی ہے، وہ بھی اپنے ساتھ کچھ حواری لے کر آیا ہوتا ہے جو ایسی صورت حال کو کنٹرول کرتے ہیں، اور اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں کہ خلاف کی گئی تقریر کا نہ صرف اثر زائل ہو جائے بلکہ کچھ مثبت تاثر بھی بنے کہ جسے کوئی دوسرا شخص آگے بڑھا سکے۔ ایسے جلسوں میں صورت حال میدانِ کارزار جیسی ہوتی ہے۔
شاعری کے حوالے سے تو یہ آسانی ہو جاتی ہے کہ کہیں نہ کہیں وزن کی کوئی غلطی، کہیں مصرع میں کسی حرف کے گرنے پر اعتراض کہ جس کی

اجازت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی۔ بحر اور ردیف قافیے کے استعمال پر اعتراض، یا دو مصرعوں کے مابین تعلق نہ ہونے یا ابہام ہونے کے سبب تنقید کے کئی مواقع نکل آتے ہیں۔ شاعری میں ایک آسانی یہ بھی ہوتی ہے کہ پیش کردہ نظم یا غزل کی کاپیاں کروا کر حاضرین کو دی جاتی ہیں، وہ ایک ایک مصرع پر غور کر سکتے ہیں، اس طرح ایک اچھا مکالمہ ہو جاتا ہے۔ یہ سہولت افسانے یا مضمون کی صورت میں نہیں ہوتی۔ اس لیے افسانہ پر تو وہی گفتگو کر سکتا ہے کہ جس نے توجہ سے افسانہ سنا ہوتا ہے، اس کے کردار اور واقعہ پر دھیان دیا ہوتا ہے جب کہ مضمون کے حوالے سے گفتگو کے بہت سے مواقع نکل آتے ہیں۔ مضمون کے موضوع پر حاضرین کو تقریریں کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے اس لیے مضمون کے متن پر کم اور اس سے جڑے موضوع پر زیادہ دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات موضوع سے ہٹ جانے کے سبب نقطہ اعتراض اٹھانے پر اجلاس میں بدمزگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر صدر کا اختیار کمزور ہو تو اجلاس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

چوں کہ اجلاس ہفتہ وار ہوتا ہے اور ہر ہفتے تخلیقات تنقید کے لیے پیش ہوتی ہیں، ایک لحاظ سے یہ گفتگو کرنے والوں کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ ایک غزل کو پرکھنے یا ایک افسانہ پر تنقید کرنے کے لیے ایک رکن کے پاس کتنے زاویے ہو سکتے ہیں، سننے والے کچھ جلسوں کے بعد اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کون کیا گفتگو کرے گا اور کن باتوں کی جانب اشارہ کرے گا، کون سی باتیں اس کے لیے قابل گرفت ہوں گی۔ ایسی صورت حال میں اکثر یکسانیت اور بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ تخلیق کار ایسا افسانہ یا نظم پیش کر دیتا ہے کہ جسے سمجھنے میں کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ اس وقت صاحبِ صدارت کے لیے بھی ایک مشکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہ بار بار حاضرین کو گفتگو کی دعوت دیتا ہے اور حاضرین چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں، اگر کسی کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے تو وہ معذرت کر لیتا ہے کہ ابھی وہ پیش کی جانے والی تخلیق کی خواندگی میں مصروف ہے۔ ایسی خاموشی اور چپ کی صورت حال میں حلقہ کا سیکرٹری اگر گفتگو کا خوگر ہو تو وہ مدد کے لیے آتا ہے۔ اگر صاحب صدارت گفتگو کے میدان کا شناور ہو تو وہ بھی کچھ پہلوؤں پر بات اس طرح کرتا ہے کہ افسانہ یا نظم کو سمجھنے یا اس کی پرتیں کھولنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اُس اجلاس کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جس

میں پیش کی جانے والی تخلیقات پر بھرپور اور طویل گفتگو ہوتی ہے۔ اس بات پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ ایسا افسانہ یا نظم اجلاس میں ضرور رکھی جاتی ہے کہ جس کے موضوع پر حاضرین سہولت سے بات کر سکیں اور صدارت کے لیے بھی ایسے ادیب یا شاعر کو ترجیح دی جاتی ہے جو گفتگو آگے بڑھا سکے۔ حلقہ کے کچھ ارکان ایسے ہیں جو کہیں نہ کہیں اردو زبان و ادب کی تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ ان کے لیے کسی بھی غزل یا نثر پارہ پر تنقید یا تحسین آسان کام ہوتا ہے۔ لیکن ان کا انداز مدرسانہ ہوتا ہے جسے زیادہ تحسین کی نگاہ سے حاضرین نہیں دیکھتے۔ مگر ایسے نقادین کی مجبوری ہوتی ہے، ویسے جہاں کوئی بات نہ بن رہی ہو، وہاں ایسے نقادین کی موجودگی کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔

بعض نقاد ایسے بھی ہیں جو حلقہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے گھر سے تیاری کر کے آتے ہیں۔ کسی تنقیدی کتاب سے تنقیدی تھیوری کے خیالات ذہن نشین کر کے آتے ہیں اور جہاں بھی گفتگو کے دوران مناسب لگتا ہے، وہ تھیوری پیش کر دیتے ہیں۔ وہ حاضرین جن کو ان کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا، وہ ان سے خوب متاثر ہوتے ہیں مگر ان کے اس انداز سے آگاہ حلقہ کے ارکان، جیسے ہی وہ گفتگو کا آغاز کرتے ہیں، چہرے پر ناخوشگوار تاثرات لے آتے ہیں۔ ان کے سامنے دراصل ایسے دو نمبر دانشور نقادوں کی قلعی کھل چکی ہوتی ہے۔

حلقہ کے اجلاس میں باقاعدگی کی کئی وجوہات ہیں۔ جو فارمیٹ ابتدا سے طے کر دیا گیا ہے، وہ ایسا کھلا ہے کہ اس میں تبدیلی کی کوئی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ کوئی حلقہ کا ذاتی طور پر مالک نہیں ہے، سب ارکان برابر کے حصہ دار ہیں، سب میں حق ملکیت یکساں طور پر ہے۔ مگر حلقہ کے اس فارمیٹ کی وجہ سے ایک خاص قسم کے تنقیدی رویے نے جنم لیا ہے، جسے حلقہ ارباب ذوق کی تنقید کیا جاتا ہے۔ عام ادبی تقریبات میں اگر کوئی تنقیدی نقطہ نظر سے کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں گفتگو کرے تو کہا جاتا ہے، یہ حلقہ کا اجلاس نہیں ہے۔

حالات جیسے بھی ہوں، بات کسی بھی حوالے سے کی جائے، اس بات سے اختلاف ممکن نہیں کہ حلقہ نے نوجوان شعرا اور ادیبوں کی تسلسل سے تربیت کی ہے اور انہیں اعتماد بخشا ہے۔ ادب کی دنیا کے نووارد جب حلقہ کے جلسوں میں تخلیقات پیش ہوتے اور سینئر ادیبوں اور شاعروں کو اس پر تنقید کرتے دیکھتے اور سنتے ہیں تو اُن کی نہ صرف تربیت ہوتی ہے بل کہ اُن میں ایک اعتماد بھی پیدا

ہوتا ہے کہ ان کی سوچ اور ان کا تنقیدی زاویہ بالکل درست ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق اگرچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے تین سال بعد آغاز ہوا مگر انجمن کے مقابلے میں حلقہ کے اجلاس تسلسل سے ہو رہے ہیں جب کہ انجمن کی سرگرمیاں کئی دہائیاں معطل رہنے کے بعد ابھی چند سال پہلے دوبارہ شروع ہوئی ہیں۔ دونوں ادبی تنظیمیں ہیں، ایک کے نزدیک اگر ادب برائے زندگی ہے تو دوسری تنظیم کے ارکان 'ادب برائے ادب' کے ہم خیال ہیں۔ مگر وقت اور سماجی سمجھ بوجھ نے ادب کے بارے میں اس نظریاتی بعد کو بھی ختم کر دیا ہے۔ ترقی پسندوں کے ہاں اگر تخلیقی جمالیات کی اہمیت کو مان لیا گیا ہے تو دوسری جانب حلقہ اربابِ ذوق سے متعلق ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں سماجی اور عصری شعور کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کر لیا ہے۔

آج اکیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں اس بات کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ ادب کے یہ دونوں پرانے ادارے فعال کیے جائیں۔ ادیبوں اور شاعروں کو وقت کی اس اہم ضرورت کو تسلیم کرنا چاہیے اور عملی طور پر ان اداروں کی سرگرمیوں کو فعال بنانا چاہیے ورنہ اس وقت ان غیر ادیبوں اور متشاعروں کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے کہ جو جینوئن لکھنے والوں کو اُن کے منصب سے محروم کرنے والے ہیں، ان کے تخلیقی ہونے کا اعزاز بھی اُن سے چھیننے والے ہیں، اس لیے کہ ایک سینئر ادیب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آج کے دور میں ادبی سرگرمی ایک سماجی سرگرمی اور میل جول کا ذریعہ بن چکی ہے اور ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے اور ادبی تقریبات کا انعقاد ایسے ہی انداز سے کروانا چاہیے۔ اس بات کو مان لینے کے بعد نہ تو ادب رہے گا اور نہ ادیب، بل کہ وہ سرمایہ دار طبقہ کہ جن کے پاس وقت بھی ہے اور پیسہ بھی، ہر طرف وہی نظر آئیں گے۔ اور شہر میں ایسے سرمایہ دار ضرورت مند بھی موجود ہیں جو معمولی قیمت پر تخلیق کاروں سے اُن کی تخلیقات خرید کر اپنے نام سے پڑھنے کی روایت شروع کر چکے ہیں۔ ادب قابلِ فروخت جنس بنتے جا رہا ہے اور دنیا کی منڈی میں اس وقت چین چھایا ہوا ہے جو آپ کی قوتِ خرید کے مطابق ہر معیار کی جنس تیار کر کے آپ کے گھر کے دروازے تک پہنچانے کے سب انتظامات کیے بیٹھا ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ایسا ہی کاروباری رویہ ادب کے ایوانوں میں بھی گھس آئے گا۔

☆☆☆☆☆

بیاض/ لاہور......ادب عالیہ کی آماجگاہ

صدیوں سے لاہور کو تہذیب و تمدن اور ادبیات عالیہ کا مرکز و محور مانا گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ لاہور کو بیرون جات سے آنے والے دانشوروں اور ادیبوں نے رونقیں بخشیں۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، لاہور کو سیالکوٹ سے آنے والے علامہ اقبال نے بنایا، سجایا اور ادبیات عالیہ کا گہوارہ بنایا۔ پچھلی صدی میں جتنے بھی قد آور نامی گرامی اور ذی وقار دانش ور آئے، وہ مضافات سے، دہلی سے، امرتسر سے، سیالکوٹ وغیرہ سے آکر لاہور میں رچ بس گئے اور اسے ادبی وقار اور فنی عظمت سے ہم کنار کرنے میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔

احمد ندیم قاسمی انگہ سے اٹھے اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے بالآخر لاہور کے ماتھے کا جھومر بن گئے۔ وہ مختلف جرائد ،اخبارات کی ادارت کے جوہر دکھاتے رہے۔ ان کے دم قدم سے فنون ایسا معرکہ آرا ادبی پرچہ منصۂ شہود پر آیا، جو خوبصورت تخلیق کاروں کی کاوشوں اور ان کی قلم کاریوں کی بہترین نرسری بنا۔ بلکہ اسے ادبی یونیورسٹی کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان کے زیر سایہ جن ادبا و شعرا نے پرورش پائی ان میں خالد احمد کا نام نامی اسم گرامی نہایت نمایاں ہے۔ انہوں نے بھی لاہور کی مجلسی زندگی میں ادبیات کے شجر سایہ دار کی آبیاری کی۔ فنون کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لیکن اس سے کافی حد تک منفرد انداز میں جدید ادب تخلیق کرنے والوں کا کھلے بازوں سے استقبال کیا۔

پچھلی ربع صدی سے بھی زائد عرصہ پر محیط یہ غیر معمولی شہرت کا حامل بیاض ہزاروں حمد و نعت نگاروں ،ادیبوں ،شاعروں ،دانشوروں ،افسانہ نگاروں، مزاح نگاروں اور دیگر اصناف سخن میں بھی معرکہ ارائی

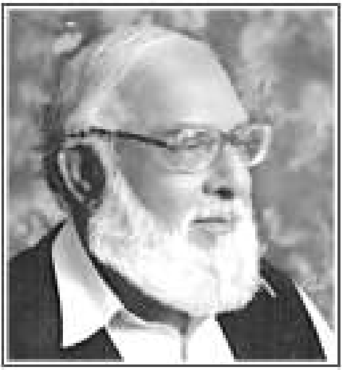

سید ریاض حسین زیدی

کرنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتا رہا ہے اور اب بھی لے رہا ہے۔

میرے خیال میں اس وقت لاہور کو اعلیٰ ادبی مرکز بنانے میں نہایت بے لوث، بے طمع اور بے لاگ مرکز ادب بنانے میں بیاض سب پرچوں پر بازی لے گیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب لطیف، الحمرا، تخلیق، اور اسی انداز کے اور بھی قابل احترام جرائد میدان ادب میں اپنے دم قدم سے حوصلہ افزا اضافوں کا موجب بنے ہوئے ہیں۔

لیکن بیاض نے کسی تفریق کے بغیر دائیں بائیں کی اڑچن میں پڑے بغیر اور ہر قسم کے تحفظ سے بے نیاز ہو کر جو بھی قدرے بہتر تخلیق کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے، اسے اپنے صفحات میں کھلے دل سے جگہ دی ہے۔

بیاض کو میں اس لیے بھی اول نمبر کا مرکز ادب ٹھہراتا ہوں کہ اس نے ہر لکھنے والے کی تصویر بھی اس کی تخلیق کے ساتھ چھاپنے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔کم از کم اس نوعیت کی بہترین سرگرمی اور شاندار روایت کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔اس پر طرہ یہ کہ بیاض کو فیاضانہ انداز میں ہزاروں کی تعداد میں اپنا ڈاک خرچ خود لگا کر اپنے معزز قارئین کو فراہم کرنے میں جو منزلت پائی ہے، اس کو ہرگز ہرگز کوئی دوسرا پرچہ نہیں پہنچتا۔

بیاض اس لیے بھی لاہور کے بہترین ادبی مراکز کا سرخیل ہے کہ اس نے اپنے قارئین سے کسی قسم کے چندے کی وصول یابی کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ورنہ دیگر جرائد تو اپنے بہترین لکھنے والوں سے بھی سالانہ چندہ وصول کرنے میں ذرا بھی ڈھیل کا مظاہرہ نہیں کرتے (اگرچہ اس کی معقول تاویلات بھی ہیں)

بیاض سب کے لیے سب کو ہر کسی کو میسر ہے۔ادھر تیس یا اکتیس تاریخ آئی یا یکم نے اپنا چہرہ دکھایا بیاض نے دروازے پر دستک دے کر چاہنے والوں کی خوشیاں دوبالا کر دیں۔ذرا بھی انتظار کی زحمت اٹھانے کی نوبت نہیں آنے دی۔

میں دل پر ہاتھ رکھ کر اور بغیر کسی ذہنی تحفظ کے علی الاعلان کہتا ہوں کہ لاہور کو بہترین ادب کا اس صدی میں گہوارا بنانے، اس کے گیسو سنوارنے اور ادبیات عالیہ کی مختلف اصناف کو بے تعصب اور بے لوث انداز میں پروان چڑھانے میں بیاض پیش پیش ہے۔اس کا ثواب لازماً خالد احمد کو جاتا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں:

خالد تیرے کمال نے دھومیں مچائیاں
لاہور کو ادب کی جو شانیں دکھائیاں

☆☆☆☆☆

لاہور کی یادیں

آفتاب احمد ملک

دوستوں کی یادگاریں چند البم رہ گئے
وقت آگے بڑھ گیا پیچھے مراسم رہ گئے
ساتھ والے گھر کے سارے لوگ ہجرت کر گئے
اور لب پہ اَن کہے لفظوں کے ماتم رہ گئے
دیکھتے ہی دیکھتے سب کشتیاں اوجھل ہوگئیں
اور ساحل پہ فقط لہروں کے سرگم رہ گئے

....

عمر عزیز کی اَن گنت سنہری یادگار یادوں کا ریلا 71 سال کی حافظے کی لائبریری میں ہلچل مچاتا ہے تو داتا کی نگری ''شہرِ ادب'' لاہور کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ کُتب و جرائد میں پڑھنا سننا الگ مشاہدات سیر و تفریح، احباب کی محفلوں کا رنگ اہور ہے۔ تخلیقِ پاکستان کے بعد شہرِ سخن لاہور کو گھوم پھر کر دیکھا اور تادم تحریر دیکھ رہا ہوں۔ شہرت ادب کی علمی، ادبی، دینی و سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ بعض سے خط و کتابت بھی رہی۔ علمی و ادبی مجالس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ تاریخی عمارت کی تاریخ پڑھنے کے علاوہ ظاہری آنکھ نے بھی دیکھا۔
نواب زادہ نصراللہ خان کا تعلق خان گڑھ سے تھا۔ سیاسی و ادبی محفلوں کے سرخیل لاہور میں سکونت پزیر تھے - شاعری، سیاست حقہ برداری لازم و ملزوم۔ اُن کی تقاریر میں کشش اور برجستہ اشعار کا انبار ہوتا تھا - ضیا الحق کے مارشل لاء میں نواب صاحب کو چوک اعظم کے ریسٹ ہاؤس میں وقتی طور پر نظر بند کر دیا - دورانِ ملازمت بارہا قدم بوسی کے لیے خان گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ واپسی پر آموں کے تحائف دینا نہ بھولتے۔ دورانِ قید ان کی شاعری میں باغیانہ روش نمایاں ہوتی۔
سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی رحلت کے بعد شاگرد رشید، شعلہ بیان مقرر سیاسی رہنما ہفت روزہ چٹان کے چیف ایڈیٹر آغا شورش کاشمیری (1917-1975) کا طوطی بولتا تھا - بارہا سیاسی جلسوں میں مدِ مقابل

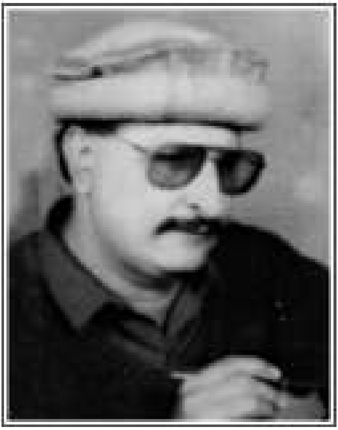

دوستوں کو للکارتے سنا۔ جب تک زندہ رہے چٹان بولتا رہا۔ اب شورش کہاں شور ہی شور ہے؟ (شورش کاشمیری نمبر یکم نومبر 1976) کے بعد چٹان گم شدہ __ البتہ 1970 سے 1976 تک چٹان کے شمارے محفوظ ہیں:

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

....

دفتر چٹان میکلوڈ روڈ پر بارہا ملاقاتیں رہیں۔ ان کی علمیت، صحافت، خطابت کا ایک زمانہ معترف ہے۔

وہ ایک شخص ہے شورش اسے ہلاک کرو
یہ بات عام ہے لاہور کے حسینوں میں
میں جانشین ہوں شورش، ظفر علی خان کا
میرے خلاف بڑا بغض ہے لعینوں میں
(چٹان لاہور 5 مارچ 1973)

پروفیسر جعفر بلوچ کا آبائی قصبہ لیہ تھا۔ ملازمت گورنمنٹ کالج لاہور، ایک درجن کتب کے خالق لیہ کے احساس کو شہر ادب میں ادبی تقاریب میں مدعو کرتے۔ علمی و ادبی مقتدر شخصیت اس وقت دار فانی میں نہیں شہر خموشاں کے مستقل مکین ہیں، (لیہ۔ تاریخ و ثقافت 2010) میں ان کی خدمات کا تفصیلی تذکرہ ہے __ (صفحہ 246-252)

پروفیسر شیر محمد گریوال تاریخ کے پروفیسر، مترجم، مبصر، مورخ اور مصنف گورنمنٹ کالج فیصل آباد، چکوال اور لاہور، اقبال کے شاہینوں کو درس خودداری دیتے رہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی انگریزی میں جامع تاریخ بھی مرتب کی۔

(A History of Govt-College- Lahore 1964-1989)

اخبارات و جرائد میں مختلف تاریخی موضوعات پر تحقیقی مقالات تحریر کیے۔ متعدد مواقع پر لائبریری میں گھنٹوں بحث و مباحثہ رہتا۔ شعبہ تاریخ کے ممتاز استاد تھے۔ ہسٹری کانفرنس اسلام آباد میں تقریر کرتے وقت حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے تھے۔ (28 جون 2005)

ان کی کتابیں میری لائبریری میں ہیں اور اخبارات میں شائع ہونے والے اردو / انگریزی کے تفصیلی مطبوعہ مقالات بھی تنہائی کے لمحات کا سہارا ہیں۔ (1972-2014)

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی (1930-2009) امروہہ سے کراچی ہجرت کر آئے۔ رئیس امروہوی اور جون ایلیا نے کراچی کو مستقل مسکن بنا لیا۔ خیال صاحب نے لاہور شہر کا رُخ کیا۔ سید عبدالحمید عدم کے ساتھ بیکار دن اور خوشگوار راتیں گزارنے کے بعد لیہ کی راہ لی جہاں تا

مرگ سکوت پذیر ہے۔ شاعرِ فکر و انقلاب نے نثر و نظم میں 20 کتابیں شائع کیں۔ شعری مجموعوں کی تعارفی تقاریب شہرِ ادب میں ظہیر کاشمیری اور ڈاکٹر روح الامین یزرک کے تعاون سے منعقد ہوتی تھیں۔ راقم بطور سیکرٹری انفارمیشن خیال اکادمی اور نظامت کے فرائض کی ادائیگی کے لیے خیال صاحب کے ساتھ ساتھ رہتا۔

ممتاز عالم دین، مفسر مصنف سید ابوالاعلیٰ مودودی اور حفیظ جالندھری سے خط و کتابت رہی مولانا باقاعدہ نماز عصر کے بعد اچھرہ میں مہمانوں سے بلاتکلف دنیا بھر کے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرتے جبکہ حفیظ جالندھری کسی نہ کسی تقریب رونمائی میں مل بیٹھتے تھے۔

ڈاکٹر طارق درانی (1953-2013)

18 سال تک داتا دربار پر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد صحت یاب ہوئے تو نیشنل پارک شہرِ ادب کے مکین ٹھہرے۔ نعت گو شاعر، دو کتابوں کے مصنف، معالج اور روحانی شخصیت بیشمار خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وادی طاؤس (کلر کہار) کی پہاڑی پر مسجد اور بابا فضل حسین شاہ کا مزار تعمیر کرایا۔

جسٹس عبدالجبار خان ماہنامہ ''نوائے پٹھان'' لاہور کے منتظم اعلیٰ اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مبلغ تھے۔ سالانہ ادبی میگزین کی تقریب میں ہم جیسے ادب نواز صحافیوں کو خصوصی شیلڈز اور سرٹیفکیٹس عطا کرتے۔ ان کی رحلت کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

شہرِ اقبال میں اقبال ڈے کے حوالے سے جسٹس جاوید اقبال کو بارہا سُنا۔ ان کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ نیز منیر نیازی، احسان دانش کو کئی مشاعروں میں سُننے کا اتفاق ہوا۔

شہرِ ادب میں اب بھی آمد و رفت کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ جسٹس رستم علی ملک کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر شبیر احمد قادری (منہاج یونیورسٹی) 40 اردو / انگریزی کتب کے مصنف و اسلامی سکالر ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی، بریگیڈیئر (ر) محمد یوسف اور برادرم فضل اکبر لاہوری سے کتابوں کا تبادلہ، باہمی ملاقاتوں کا سلسلہ قلبی و روحانی تسکین کا باعث ہے۔ بقول آغا شورش کاشمیری کہ:

کچھ گئے وقتوں کی یادیں
کچھ گریبانوں کے چاک
کچھ ادب کے سلسلے
کچھ شاعری کے ماہ و سال
چند نظموں کی رفاقت
چند افسانوں کے ساتھ
اس طرح بکھیرے پڑے ہیں
جیسے تاروں کی بارات

☆☆☆☆☆

لاہور کے فلسفی ادیب قاضی جاوید کی رحلت

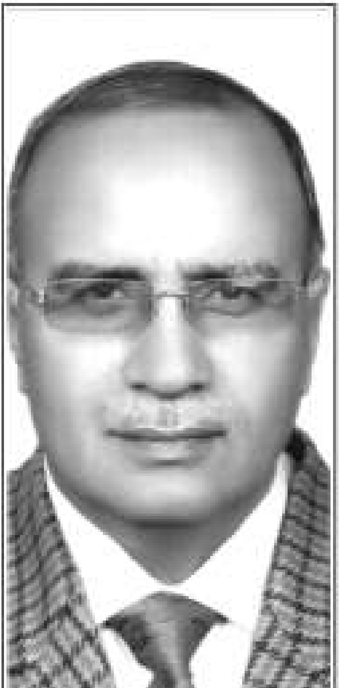

ممتاز راشد لاہوری

لاہور میں زبان و ادب سے وابستہ جن قلمکاروں کا زیادہ واسطہ فلسفہ، تصوف اور نفسیات سے رہا اُن میں ڈاکٹر محمد اجمل، شہزاد احمد، مرزا اطہر بیگ، عبدالرشید، ڈاکٹر عطیہ سید، شاہد مسعود ہاشمی، ڈاکٹر عارفہ سید، واصف علی واصفؔ، پروفیسر محمد جواد اور ڈاکٹر امجد طفیل کے نام اہم ہیں۔ مگر قاضی جاوید کا نام اس فہرست خاصا نمایاں ہے جن کی پوری عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گزری۔ ان کا خاندان اندرون موچی دروازہ لاہور سے تھا مگر یہ خاندان پھر شمالی لاہور کے علاقہ وسن پورہ میں جا بسا تھا۔ قاضی جاوید 1946ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ ان کے تعلیمی مراحل، ادبی سفر اور ملازمت کے مراحل لاہور ہی میں گزرے۔ وہ 1988ء سے 2009ء تک اکادمی ادبیات پاکستان ادبیات پاکستان (پنجاب) کے سربراہ رہے جس کا مرکزی دفتر لاہور میں تھا۔ ایک دور میں یہ مرکز مین بلیوارڈ (علامہ اقبال ٹاؤن لاہور) پر ہنزہ بلاک میں بھی رہا۔ اس فلیٹ نما عمارت کے فرسٹ فلور پر اُن کے دور میں بیسیوں ادبی تقریبات منعقد ہوئیں۔ مجھے سب سے پہلے 2004ء میں انھیں وہیں ملنے کا موقع ملا۔

میں نے انھیں اپنی کچھ کتب بھی پیش کیں جو انھوں نے بڑی خوشدلی، خندہ پیشانی اور متبسم چہرے کے ساتھ وصول کیں۔ میں بسلسلۂ روزگار نومبر 1977ء سے قطر میں تھا۔ 1993ء میں ہم آصف بلاک علامہ اقبال ٹاؤن میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہ جگہ اکادمی ادبیات کے مذکورہ بالا دفتر سے چار پانچ منٹ کی پیدل مسافت پر تھی۔ میں قطر سے سالانہ چھٹی پر آتا تو اس مرکز کی کسی نہ کسی تقریب میں ضرور شرکت رہتی تھی۔ اپریل 2014ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد میں مستقلاً واپس لاہور آن بسا۔ تب قاضی جاوید ریٹائر ہو چکے تھے اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے سربراہ کے بطور ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ ان کا دفتر نظریہ پاکستان ٹرسٹ کی عمارت (متصل پرل کانٹی نینٹل ہوٹل، مال روڈ لاہور) میں گراؤنڈ فلور پر تھا۔ گاہے گاہے اُن سے وہاں ملاقاتیں رہنے لگیں۔ تب اکادمی ادبیات لاہور کا دفتر 203-آصف بلاک میں آ چکا تھا اور کوئی دو تین سال بعد 2016ء میں 22-جے گلبرگ لاہور میں مستنصر حسین تارڑ کی پرانی کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا۔ اکادمی کی وہاں کی تقریبات میں بھی قاضی جاوید آتے رہتے تھے جہاں اُن کے پرانے دفتری ساتھی بڑے مؤدبانہ انداز میں اُن کی آؤ بھگت کرتے تھے اور بلاشبہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر محمد جمیل ان میں پیش پیش ہوتے تھے۔ قاضی جاوید کے اعزاز میں وہاں ایک تقریب ہوئی تو اطمینان اور مسرت کے ان کے اندرونی جذبات اُن کی دمکتی آنکھوں اور مسکراتے ہوئے لبوں سے نمایاں تھے۔ میرے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب کی صدارت انہی نے کی تھی۔ میں نے اپنے اظہارِ خیال میں کہا کہ ہماری تحریریں تو اوپر اوپر کی سطح کی تحریریں ہوتی ہیں۔ گہری اور پُرمغز تحریریں دیکھنا ہو تو قاضی جاوید اور اُن جیسے لکھے قلمکاروں کو دیکھا کریں۔ میرے ان ریمارکس پر اُن کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ فلسفہ وغیرہ کی ان کی کتب اور مقالہ جات کا سفر لگاتار اور ساتھ ساتھ جاری رہتا تھا۔ قاضی جاوید قہقہہ لگا کر ہنسنے والوں میں تو شامل نہیں تھے مگر حسِ مزاح سے بالکل بھی عاری نہیں تھے۔ کسی کا پُرلطف جملہ انھیں ہشاش بشاش کر دیتا تھا۔ وہ تادیر دوسروں کی باتیں سُننے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بحث مباحثہ میں پڑتے ہی نہیں تھے۔ ایک محفل میں مشرقی پنجاب کے اپنے دورے کا ذکر کر رہے تھے اور کہنے لگے کہ وہاں چنڈی گڑھ میں لوگوں کا نظم و ضبط مثالی تھا۔ لائن بنا کر بس کا انتظار کرنا ور بوفے ڈنر میں بغیر کسی ہڑبونگ کے اپنی باری پر اپنی پلیٹ میں کھانا لیتے دیکھا تو اپنے وطن پاکستان کی اس سے برعکس

صورتحال کا دکھ ہوا۔ قاضی جاوید جب چنڈی گڑھ کی اس مثالی صورتحال کو پورے انڈیا کی روٹین قرار دینے لگے تو بعض شرکائے محفل نے انھیں ٹوک دیا اور کہا انڈیا کے بیشتر علاقوں میں صورتحال ہمارے ملک جیسی ہی ہے۔ اس پر قاضی جاوید بحث میں نہیں الجھے اور خاموش ہو گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اصل میں وہ دل سے چاہتے تھے کہ پاکستانی بھی نظم و ضبط کے عادی ہو جائیں مگر ان کی دلیل کارگر نہیں ہوئی تو انھوں نے بحث میں مزید الجھنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

قاضی جاوید 14 نومبر 2020ء کو علالت کے سبب فوت ہوئے۔ ان دنوں ان کی رہائش آر بلاک ماڈل ٹاؤن میں تھی۔ علالت کے دوران وہ اس گھر کے قریب ہی واقع اتفاق ہسپتال میں زیر علاج بھی رہے۔ ان کی نماز جنازہ وہیں آر بلاک مارکیٹ کے سامنے واقع وسیع و عریض گراؤنڈ ہی میں ہوئی۔ اکادمی ادبیات، ادارۂ ثقافت اسلامیہ اور اس ادارے سے قریبی دیگر ادبی اداروں کے سٹاف کے کافی افراد جمع تھے۔ لاہور کے لگ بھگ بیس اہل قلم بھی جنازے میں شریک تھے۔ میں نے وہاں ہر کسی کو قاضی جاوید کے اوصاف بیان کرتے ہی دیکھا۔ وہ ماڈل ٹاؤن لاہور کے مرکزی پارک میں صبح کی سیر کے عادی تھے بلکہ وہاں آنے والے ادبی دوستوں کی منڈلی بھی جمائے رکھتے تھے۔ انھوں نے وہاں اہتمام کے ساتھ بھی کئی ادبی اجتماع منعقد کیے۔ ان کے ماڈل ٹاؤن پارک کے دوستوں کی ایک معقول تعداد بھی جنازے میں شریک تھی۔ ان کی وفات کے تین روز بعد اکادمی ادبیات لاہور میں ان کے لیے تعزیتی ریفرنس میں ہوا جس میں دس سے زائد اہل قلم نے اُن کے بارے میں تحسینی کلمات ادا کیے میں نے بھی کچھ واقعات بیان کیے۔ نظامت بھی میرے ہی ذمہ تھی۔ صدارت پروین ملک نے کی اور مہمانِ خصوصی پروفیسر سعادت سعید تھے۔ قاضی جاوید کے صاحبزادے نے بھی شرکت کی اور برادر نسبتی جاوید پاشا نے بھی۔ انھوں نے (مرحوم) کے کئی گھریلو واقعات بھی سنائے جن میں ان کی فہم و فراست کے کئی پہلو نمایاں تھے۔ قاضی جاوید کے سسر نامور نغمہ نگار ناظم پانی پتی تھے، ناظم پانی پتی کے بڑے بھائی نامور فلمی ہدایتکار ولی لاہوری تھے جنھوں نے اپنے عہد کی نامور فلم ہیروئن ممتاز شانتی سے شادی کی تھی۔ اس تعزیتی ریفرنس میں ان حوالوں سے بھی گفتگو رہی۔ قاضی جاوید پنجابی ادب کی سب سے بڑی تنظیم "پنجابی سنگت پاکستان" کے بنیادی رکن بھی تھے۔ مجموعی طور پر انھوں نے اپنے انداز کی بھرپور زندگی گزاری۔ اللہ انھیں روح کی آسودگی بخشے۔

☆☆☆☆☆

شہرِ لاہور! تیری رونقیں اور محبتیں دائم آباد

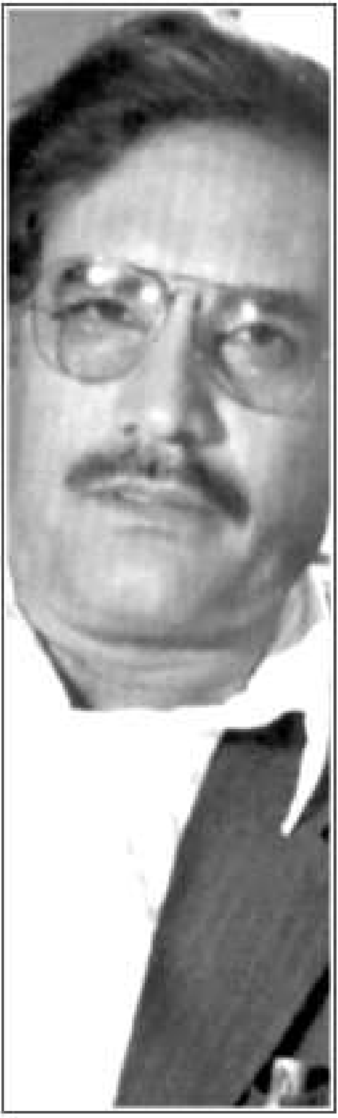

شوکت محمود شوکت

اپنے پرکھوں اور بزرگوں سمیت، دوستوں سے بھی اکثر سنا کرتے تھے کہ ''جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا'' اس لحاظ سے ہمارا سالِ پیدائش 1995 ہی ہے کہ پہلی بار ہم نے ''شہرِ لاہور'' میں قدم رنجہ فرمایا۔ وہ بھی اس لیے کہ ہم، سی ایس ایس کا امتحان غلطی سے پاس کر بیٹھے تو فیڈرل پبلک سروس کمیشن، اسلام آباد سے ہمیں ایک سرکاری خط موصول ہوا کہ کلیۂ فنون (بی اے) کی اصل سند پیش کی جائے، سو ہم پنجاب یونیورسٹی، لاہور، کلیۂ فنون (بی اے) کی سند کے حصول کے لیے، ہمراہ زاپنے ہم دمِ دیرینہ، ممتاز خان ایڈووکیٹ جا پہنچے۔ مذکور اصل سند ایک گھنٹے کے اندر ہی مل گئی۔ اس ک بعد، ہم نے انارکلی کا رخ کیا، انارکلی سے ہوتے ہوئے ''پاک ٹی ہاؤس'' پہنچے مگر اسے بند پایا، شاید ان دنوں ''پاک ٹی ہاؤس'' بند پڑا تھا یا ہوسکتا ہے اسی ایک دن کے لیے بند ہوا ہو، بہرحال، وہاں سے سیدھا مینارِ پاکستان چلے آئے، پھر شاہی قلعہ دیکھا اور پھر ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے مزار پر حاضری دی۔ شام ہونے کے قریب، لاہور ریلوے سٹیشن سے ایک

ریل کار کہ جسے ناشت کوچ کہتے تھے، میں سوار ہوئے اور اپنے شہر کے لیے عازم سفر ہوئے یوں لاہور کو الوداع کہا، یہ ہمارا پہلا لاہور کا دورہ تھا، جسے ادبی دورہ تو نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ علیم دورہ ضرور تھا۔

لاہور کے دوسرے دورے کی روداد کچھ یوں ہے، کہ 12 فروری 2002 میں ہمیں اپنے وکالت کا لائسنس (License) لینے کے لیے، ہمراہ عزیزی احمد حسن، پنجاب بار کونسل، لاہور پیش ہونا پڑا، وہاں ضروری دستاویزات جمع کرانے کے بعد، اپنے ایک عزیز دوست محبوب الرحمٰن خٹک سے ملنے ''ٹاؤن شپ'' چلے گئے جہاں پر ان کا اپنا نجی کالج، ''مثالی ذکریا کیڈٹ کالج'' کے نام سے نہ صرف طلبا اور ان کے والدین کی نظر میں مقبول تھا بل کہ حکام اعلیٰ بھی اسے نظرِ تکریم سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ان دنوں لاہور میں بسنت کا موسم شروع ہے لہٰذا آپ کچھ دن یہاں قیام کرلیں۔ بسنت تو خیر، ہم نے کیا منانی تھی، تاہم لاہور کے ''پاک ٹی ہاؤس'' میں کسی علمی اور ادبی پروگرام میں شرکت کرنا ایک آرزوئے دیرینہ تھی، اس آرزو کی تکمیل کی خاطر ہم اور احمد احسن دوسرے دن ہی ''ٹاؤن شپ'' سے تقریباً ظہر کے قوت ''پاک ٹی ہاؤس'' پہنچے، الحمدللہ! ''پاک ٹی ہاؤس'' کو کھلا پایا، ہم نے دو چائے کا آرڈر دیا، وہاں جناب سائیں اختر حسین سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، انھوں نے اپنی ایک پنجابی نظم ''اللہ میاں تھلے آ...... اپنی دنیا ویہندا جا'' خوب صورت انداز میں سنائی، جس سے ہم حقیقتاً محظوظ ہوئے، گفتگو کے دوران میں انھوں نے ہمارے علم میں یہ بھی اضافہ کیا کہ اس مشہور و معروف مصرعے'' یہ راز اب کوئی راز نہیں، سب اہلِ گلستاں جان گئے'' کا پس منظر کیا ہے؟ اور اس کا دوسرا مصرع کس طرح ہے؟ پھر انھوں نے اس شعر کا دوسرا مصرع یوں سنایا:

ع: ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہے، انجام گلستاں کیا ہوگا

اس کے بعد قریب ہی ایک نوٹس بورڈ پر نظر پڑی، جس پر کسی افسانہ نگار (نام ذہن میں نہیں رہا) کے افسانے پر تنقیدی اجلاس کی بابت چھوٹا سا اشتہار چسپاں تھا، جسے آج ہی چار بجے سہ پہر شروع ہونا تھا، جس کی صدارت برصغیر کے نام ور اور معروف افسانہ نگار، محقق اور ناقد ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے کرنی تھی۔ ہم انتظار میں بیٹھے رہے، ''پاک ٹی ہاؤس'' کے اوپر والے ہال میں تقریباً پانچ بجے یہ اجلاس شروع ہوا اور ساڑھے آٹھ بجے رات اپنے اختتام کو پہنچا۔

اس اجلاس کے اختتام پر اکاؤنٹینٹ جنرل آفس (AG Office) کے ایک آڈیٹر شاعر سے ملاقات ہوئی (اب ذہن میں ان کا نام نہیں رہا) انھوں نے اگلے دن سہ پہر چار بجے اکاؤنٹینٹ جنرل آفس میں ہمیں بہ طور مہمانِ خصوصی مشاعرے کے لیے مدعو کیا، اگلے دن ہم، ہمراہ احمد حسن اور محبوب الرحمٰن خٹک اکاؤنٹینٹ جنرل آفس پہنچے، ٹھیک چار بجے مشاعرہ شروع ہوا، جس کی صدارت، ملک کے معروف و مشہور شاعر اور سی ایس پی آفیسر جناب کرامت بخاری کر رہے تھے اور ہمیں مہمانِ خصوصی کا اعزاز بخشا گیا- تلاوت کلام پاک سے اس مشاعرہ کا آغاز ہوا، تلاوت کلام پاک کے بعد بارگاہِ رسالت مآب میں نعتِ رسولؐ مقبول کے پھول نچھاور کیے گئے، نعتِ رسولؐ مقبول کے اختتام پر جناب کرامت بخاری نے ہمارے لیے خوش آمدید اور عزت افزائی کے کلمات کہے اور ساتھ ہی انھوں نے یہ گزارش بھی کی کہ انھیں ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے لہٰذا، وہ اپنا کلام پہلے سنانے کے خواہش مند ہیں اور باقی مشاعرے کی صدارت بھی مہمانِ خصوصی (شوکت محمود شوکت) ہی کریں گے، اس طرح جناب کرامت بخاری نے سب سے پہلے اپنا کلام سنایا، انھوں نے دو غزلیں پیش کیں، جس پر انھیں خوب داد ملی، پہلی غزل کہ، جس کی ردیف "مٹی کا ہے" تھی، اس کا مطلع، آج بھی حریم دل میں محفوظ ہے، ملاحظہ کیجیے:

یہ جہانِ آب و گِل ہے یہ نگر مٹی کا ہے
راستے سب گرد ہیں، سارا سفر مٹی کا ہے

....

جناب کرامت بخاری نے اپنا کلام سنانے کے بعد اجازت طلب کی اور جاتے جاتے، ان کے فن اور شخصیت پر، احسان اللہ ثاقب کی مرتبہ کتاب "کرامت بخاری فن اور شخصیت" اپنے دستخط کے ساتھ ہمیں عنایت کی- یہ ایک یادگار مشاعرہ تھا، جو رات آٹھ بجے اختتام پزیر ہوا، اکاؤنٹینٹ جنرل آفس میں شریک شعرائے محفلِ مشاعرہ اور دیگر اہلکاروں نے بہت زیادہ عزت بخشی، جو آج بھی مکینِ دل ہے اور جس کے لیے، میں آج بھی مذکورہ تمام اصحاب ذی وقار کا سپاس گزار ہوں-

لاہور کے تیسرے دورے کی روداد کچھ یوں ہے کہ ہمیں ڈائریکٹوریٹ آف سٹاف ڈویلپمنٹ (DSD)، لاہور سرکاری ٹریننگ کے لیے اپریل 2009 میں جانا پڑا یہ ایک مہینے کی ٹریننگ تھی- اس ٹریننگ کے دوران

میں لاہور کے تقریباً سارے بڑے اور تاریخی مقامات دیکھے، جن میں سے مزار داتا گنج بخشؒ، مزار اقبالؒ، بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، مینار پاکستان، پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس، لاہور میوزیم، واہگہ بارڈر، شاہدرہ، شالیمار باغ، وغیرہ شامل ہیں ان کے علاوہ 'طارق عزیز شو' میں بھی دوبار "الحمرا" جانا ہوا، پہلی بار "الحمرا" میں ہماری نشست، سٹیج سے کافی فاصلے پر تھی لہٰذا طارق عزیز (مرحوم) کا دیدار دور ہی سے نصیب ہوا، دوسری بار ہمیں سٹیج کے سامنے قریب دوسری قطار میں نشست میسر آئی، طارق عزیز (مرحوم) کئی بار ہمارے سامنے سے گزرے، بڑی خواہش تھی کہ وہ کچھ ہم سے بھی سوال وجواب بھی کریں لیکن یہ خواہش تشنہ ہی رہی- اس ٹریننگ کے اختتام (آخری ہفتے) پر ہم اور ہمارے ایک کولیگ، محمد حنیف کمبوہ (سحر خیالی)، پراجیکٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر شکیل احمد کے پاس گئے اور مشاعرے کے اہتمام کی اجازت طلب کی، جو انھوں نے باکمال خوشی اور رضامندی دے دی لہٰذا، ہم نے ڈائریکٹوریٹ آف سٹاف ڈویلپمنٹ (DSD)، لاہور میں ایک شاندار مشاعرہ کا اہتمام کیا، جس کی صدارت کے لیے، باہمی مشاورت سے ڈاکٹر انور سدید (مرحوم) کا انتخاب کیا گیا، اس مشاعرے کے انعقاد سے تین روز قبل ہم اور محمد حنیف کمبوہ (سحر خیالی) ان کو دعوت دینے کے لیے، ان کی رہائش گاہ (ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن) جا پہنچے، جب ہم نے اپنا مدعا بیان کیا، یعنی انھیں مشاعرے کی دعوت دی، تو انھوں نے نہ صرف یہ دعوت بہ خوشی قبول کرلی، بل کہ چائے سے ہماری تواضع بھی کی، ڈاکٹر انور سدید (مرحوم) سے ہماری یہ ملاقات، پہلی اور آخری ثابت ہوئی تاہم، یہ ایک یادگار ملاقات تھی، جو آج بھی ذہن وقلب پر نقش ہے- جب کہ مہمانانِ خصوصی کے اعزاز سے ڈاکٹر عبدالکریم خالد اور ہمیں (راقم الحروف) کو نوازا گیا- مشاعرہ مقررہ تاریخ، 6 مئی 2009 کو شام چھے بجے شروع ہوا، ڈاکٹر انور سدید (مرحوم)، بہ وجہ ناسازیٔ طبع تشریف نہ لا سکے، ان کی غیر موجودگی میں، ڈاکٹر شبیہ الحسن (مرحوم) نے احسن طریقے سے صدارت کی ذمہ داری نبھائی، بہر حال، یہ ایک کامیاب مشاعرہ رہا، ہمیں ڈاکٹر شبیہ الحسن (مرحوم) سے پہلے، دعوتِ کلام دی گئی، ہم نے اپنی طویل نظم "مشورہ" پیش کی، جس کے مندرجہ ذیل دو بند بہت پسند کیے گئے، قارئینِ 'بیاض' کے ذوقِ طبع کے لیے مذکورہ بند پیش ہیں:

یہ کب میں نے کہا تھا تم سے اے میرے دلِ ناداں!
اسے تم رونقِ بزمِ جہانِ علم و فن سمجھو

اسے تم آبروئے گلشنِ شعر و سخن سمجھو
اکڑ جائیں کبھی تم پر قیامت، ہجر کے لمحے
تمھیں زیبا نہیں ہرگز، اسے وعدہ شکن سمجھو

یہ کب میں نے کہا تھا تم سے اے میرے دلِ ناداں!
محبت مونسِ غم ہے، محبت درد کی دارو
محبت مخزنِ راحت، محبت مدرک خوشبو
محبت نظمِ عالم ہے، محبت انجمن آرا
محبت ظلمتِ شب میں کوئی دیپک، کوئی جگنو

الغرض! یہ مشاعرہ رات دس بجے اپنے اختتام کو پہنچا، جس کے آخر میں تمام شعرائے کرام اور سامعین کو پُر تکلف عشائیہ سے نوازا گیا۔ مزید برآں، اسی ٹریننگ کے دوران میں ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے اپنی کتاب "چند اور مضامین" عنایت کی، ہم نے ڈاکٹر صاحب سے کتاب لینے کے بعد فوراً، استفسار کیا کہ جناب اِیہ "چندا، ور مضامین" سے کیا مراد ہے؟ تو ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ صرف آپ نے کتاب کا سرنامہ غلط نہیں پڑھا، بل کہ میرے اکثر احباب اسے "چندا، ور مضامین ہی پڑھتے ہیں حال آں کہ اس کتاب کا نام "چند، اور مضامین" ہے اور ہمارے پاس، اپنے اس سوال پر مسکرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

مذکورہ تین دوروں کے بعد، پھر تو گویا، لاہور اکثر آنا جانا رہا، نظریۂ پاکستان ٹرسٹ، ایوانِ کارکنانِ تحریکِ پاکستان، 100 شاہراہ قائداعظم، مادرِ ملت پارک، لاہور تو کئی بار اجلاسوں میں شرکت کے لیے جانا ہوا، جہاں کافی مشاہیرِ علم و ادب اور بڑی سیاسی شخصیات سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ خصوصاً، ایک اجلاس میں وطنِ عزیز پاکستان کے سابق صدر، محترم جناب محمد رفیق تارڑ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، جب ہم نے ان سے آٹو گراف مانگا تو انھوں نے باکمال شفقت اور مہربانی، پیش کرہ قرطاسِ ابیض پر یوں تحریر کیا "پاکستان سے محبت کرو" اور نیچے اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ دوسرے سال جب مذکورہ اجلاس میں شرکت کے لیے جا پہنچے تو ڈاکٹر اجمل نیازی نے پرتپاک خیر مقدم کیا (کی تصویر لف ہذا ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ جو خط، پہلے تین دوروں میں اُٹھایا تھا، وہ اب نہیں ملتا، شاید عمر کا تقاضا ہے یا ذوقِ نظر جمود کا شکار ہو گئی ہے۔ لیکن، لاہور، واقعی لاہور ہے، جس نے ہمیشہ ہمیں محبتوں سے نوازا، اور آج بھی ہمارے دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلتی ہے کہ "شہرِ لاہور! تیری رونقیں اور محبتیں دائم آباد۔"

☆☆☆☆☆

میلے سے پاوری تک کا سفر (لاہورا سپیشل)

یہ میں ہوں---یہ لاہور ہے ---- اور یہاں پاوری ہو رہی ہے -----

سب سے پہلے تو مبارک باد کہ اس قوم کے منہ سے بھی خیر کا کلمہ نکلا--- پاوری تو ہمیشہ سے ہی ہوتی رہی ہے-- لیکن اس قوم نے اپنے منہ شریف سے اب پھوٹا ہے----

بات ہو رہی ہے لاہور شہر کی--- تو جی لاہور شہر کی کیا ہی باتاں---- جو ایک مرتبہ لاہور شہر سے چلا جائے اس کا نہ دل لگتا ہے اور نہ ہی دا--- داتا کی نگری میں کچھ ایسی ہی کشش ہے-- یہ شہر پہلے تو باغوں کے شہر کے نام سے جانا جاتا تھا--- اب اس کی پہچان کے مختلف زاویے ہیں--- کھابوں کا شہر--- ڈھابوں کا شہر ----- بابوں کا شہر---رنگینیوں کا شہر-- حسین نظاروں کا شہر-----

واقعی جنیں لور نئی تکیا او جمیا ای نئی-----

بات شروع ہوئی تھی لوریوں کی پاوری سے--- جو کہ صدیوں سے چلی آ رہی ہے--- پہلے پہل کسی کے گھر منڈا کھنڈا ہونا---- تو لور کی تنگ گلیوں میں دور دور تک خوشی کا سماں نظر آتا تھا--- کاکے پٹا کے نے رورو کے سیاپا ڈالنا کہ منڈا شہر لاہور دا ---معرض وجود میں آ گیا ہے---- لیکن اب اسی منڈے کو پیدا ہوتے ہی پتہ ہوتا ہے کہ میں لاہوری منڈا ہوں وہ بھی براون ---- اس لیے وہ پیدا ہوتے ہی چپ چاپ نرس کو دیکھنے پر ہی فوکس کرتا ہے--

اسی طرح لور شہر کے تہوار بھی موقع کی مناسبت سے بدلتے گئے ----- پہلے میلے ٹھیلوں میں رونقیں لگا کرتی تھیں--- تی تیانیاں بے بے سے کٹ کھا کے چوری چوری میلوں میں جایا کرتی تھیں---- پر اب ماوں، بہنوں، بیٹیوں کو پتہ ہے کہ ٹرینڈ بدل گیا ہے--- اور فیشنی کڑیاں جس طرح کی تقریبات میں جاتی ہیں---- وہ کچھ اس طرح ہیں --- -برائیڈل شاور ---بے بی شاور ---اچھا پھر شاور؟--- حتیٰ کہ ---شاور ہی شاور-----

سیدہ آمنہ ریاض

اب بات ہو جائے کچھ لاہوری کھابوں کی--- تو لاہوریے عرصہ دراز سے کھانے پینے کے شوقین ہیں--- چرغے اڑانے اور لسی کے گلاس کھڑکانے میں لاہوریوں کو کوئی مات نہیں دے سکتا- اب ہر چیز فیشن کے زمرے میں آ گئی ہے---

منڈے کڑیاں ماں باپ سے کٹ کھا کے چار دن کمرے سے شرمندگی کے مارے نکلتے نہیں تھے--- لیکن اب جیسے ہی کٹ پڑتی ہے ویسے ہی سوجی ہوئی بوتھی انسٹاگرام پہ نظر آ جاتی ہے-- ود لیٹیسٹ ہیش ٹیگو--- اگلے ہی لمحے کمنٹ میں چار من چلے اپنی تصویر اپ لوڈ کرتے ہیں جن میں کسن کی اور جھتو وکھی ہونے کے مناظر صاف دکھائی دیتے ہیں کہ بیٹا تو اکیلا ہی نہیں اس دنیا میں کٹ کھانے آیا ہوا---

لاہور شہر میں آپ کو ہر طرح کا بندہ نظر آئے گا--- گھر سے اچانک دہی لینے کے لیے نکلنے والا بندہ--- بیوی کی ڈانٹ سن کر فوراً برتن دھونے والا بندہ---- بیگم کو ڈانٹ کر ساتھ ہی معافی مانگنے والا بندہ---- سڑکوں پہ کڑیوں کو دیکھ کو شوخی مارنے والا بندہ--- محفلوں میں دوسروں کی بیویوں کی حد سے زیادہ تعریف کرنے اور واپس گھر آ کر اپنی بیوی سے چھتر کھانے والا بندہ-----

اسی طرح عورتوں کی وسیع تعداد بھی آپ کو ایویں ہی نظر آئے گی--- بچے پہ بچہ پیدا کرنے والی عورتیں ----- غمگین عورتیں ----- پارلروں میں نت نیا فیشل کھڑکانے والی عورتیں---- شوہر سے ایک مکا کھا کر چار مکے مارنے والی عورتیں ----- جلسوں میں جانے والی عورتیں ----- دروازے میں کھڑی ہو کر ایک منٹ کا کہہ کر گھنٹہ لگانے والی عورتیں--- میلاد کروانے والی خالص اسلامی عورتیں-----

لاہوریوں کو ہر وقت شادی والے گھر کا ماحول چاہیے ہوتا ہے---- کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے--- بچہ پیدا ہونے سے لے کر اس بچے کا بچہ ہونے تک تمام مناظر اب لائیو دکھائے جاتے ہیں--- چونکہ یہ زندہ دلان لاہور ہے اس لیے قدم قدم پہ آپ کو زندہ دلی کے ثبوت ملیں گے---

آپ کسی خالص لاہوریے کے گھر چلے جائیں- آپ کو مار کے بھیجیں گے وہ اس طرح کے اگر آپ کو شوگر ہے تو گن پوائنٹ پہ آپ کو چینی والی چائے پلائیں گے--- آپ بلڈ پریشر یا دل کے مریض ہیں تو آپ کو چوندے چوندے دیسی گھیو کے کھابے کھلائیں گے---- آپ انکار کر کے دکھائیں---- البتہ اب نئے ٹرینڈ کے مطابق پیزا، برگر فوڈ پانڈا کیا جا سکتا ہے-

چلو جی ساتوں کی! الوریوا!تسی ہسدے روو--- تے وسدے روو---

☆☆☆☆☆

لاہور، شہرِ ادب...... ہم سب کا معشوق

شہرِ لاہور کو یونیسکو نے دنیا کے 39 ادبی شہروں میں شامل کرلیا ہے۔ لاہور کو ادبی شہر قرار دینا ہم سب کے لیے قابلِ فخر بات ہے۔ یونیسکو کے اس اقدام سے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا مثبت تشخص اُجاگر ہوگا۔ لاہور صدیوں سے تہذیب وثقافت کا اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں سے اٹھنے والی تحریکوں میں ادبی شخصیات کا کردار اہم رہا۔ ہم اس شہرِ بے مثال کے بارے میں سنا کرتے تھے کہ یہ راوی کنارے نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں میں بستا ہے اور یہ جملہ تو زبان زدِ عام تھا کہ ”جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ دنیا میں آیا ہی نہیں“ چنانچہ ہم نے بھی لاہور دیکھنے اور دنیا میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔ لاہور کو پہلی بار 98ء میں میٹرک کی چھٹیوں کے بعد دیکھا۔ بچپن میں دیکھا ہوگا کہ زندگی کے ابتدائی چھ، سات سال رائے ونڈ میں گزرے، جو لاہور سے 30, 35 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ ابو ریلوے میں ملازم تھے۔ ان کا تبادلہ رائے ونڈ ہوا تو بچپن کا بیشتر حصہ اسی شہر میں گزرا۔ لیکن دیکھنا تو اسے ہی کہیں گے۔ جو یادوں میں بھی محفوظ ہو۔ ان دنوں بڑے بھائی لاہور میں غازی آباد میں ایک فرم میں کمپیوٹر آپریٹر تھے۔ انھوں نے کہا کہ میٹرک کی چھٹیوں کے بعد لاہور آجاؤ۔ تمھیں یہاں کی سیر کراتے ہیں۔ چنانچہ انہی چھٹیوں میں پہلی بار لاہور جانا ہوا اور مینارِ پاکستان، بادشاہی مسجد، شالامار ماغ اور شاہی قلعہ جو کبھی پی ٹی وی پہ دیکھا کرتے تھے۔ اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔

ایک سال میں دو، تین بار لاہور کا چکر نہ لگے تو بے چینی رہتی ہے۔ ایک پڑھنے لکھنے والے شخص کے لیے لاہور جانا اور اُردو بازار جانا لازم وملزوم ہیں۔ کرونا وائرس کی وجہ سے ادبی میلے ٹھیلے کم ہوئے تو لاہور جانے کا

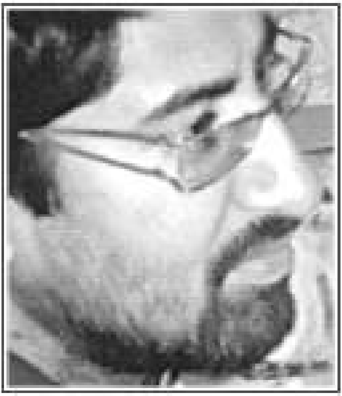

رانا محمد شاہد

سلسلہ رُک گیا- چند ہفتے پہلے ایک دوست نے کہا کہ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ 6 ماہ گزر گئے- لاہور کا چکر نہ لگا-

لاہور ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے- اَن گنت تاریخی مقامات ہیں- ہر سال لاکھوں سیاح ان تاریخی مقامات کو دیکھنے آتے ہیں- اس کے ساتھ لاہور ایک ثقافتی شہر ہے- علم و ادب کا گہوارہ ہے- اس کے ادبی مراکز تاریخی حیثیت رکھتے ہیں- وہ پاک ٹی ہاؤس ہو یا مختلف ادبی بیٹھکیں- لاہور نے ادب پر گہرے نقوش چھوڑے- ایسی بہت سی ادبی شخصیات گزری ہیں، جو لاہور آئیں اور پھر اسی شہر نے انھیں پہچان دی - علامہ اقبال نے سیالکوٹ سے لاہور کا رُخ کیا تو شاعرِ مشرق بن گئے میٹرک کے اُردو کے پرچے میں فیل ہونے والے سعادت حسن کو لاہور نے منٹو کی پہچان دی اور وہ ارود کے سب سے بڑے افسانہ نگار کہلائے اسی طرح فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ناصر کاظمی، بانو قدسیہ، واصف علی واصف، مرزا ادیب، قتیل شفائی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور بہت سے نام ہیں، جنھیں لاہور نے شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا اور انہی شخصیات کی وجہ سے آج لاہور کو "شہرِ ادب" قرار دیا گیا-

لاہور باغوں، خوابوں، بابوں اور کھابوں کا شہر بھی ہے- حقیقت تو یہ ہے کہ لاہور جیسی رنگا رنگی دنیا کے شاید ہی کسی دوسرے شہر میں ہو- کرشن چندر نے کہا تھا کہ "لاہور آدمی کو بوڑھا نہیں ہونے دیتا- انھوں نے تو یہاں تک لکھا کہ:

"لاہور، میرا سدا جگمگاتا فانوس بدن شہر اپنی لافانی جوانی کے لیے مشہور ہے- اس شہر میں رہ کر کوئی بوڑھا ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دے اور منڈی بہاؤ الدین، بستی چھپڑاں والا یا چک نمبر 420 میں جا کر سکونت اختیار کرے اور لاہور کے نام کو بٹہ نہ لگائے-"

راجندر سنگھ بیدی ایک جگہ لکھتے ہیں- "عشق کے لیے لاہور سے بہتر کوئی جگہ نہیں" تقسیم کے وقت کشیدہ حالات کے پیشِ نظر لاہور سے چلے گئے تھے- مگر اس کی یاد انھیں مرتے دم تک تڑپاتی رہی- ایک انٹرویو دیتے ہوئے لاہور کا ذکر آیا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیے- اردو ادب کے ان بڑے فکشن نگاروں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کو 1947 میں ہمیشہ کے لیے لاہور سے جدا ہونا پڑا، مگر اس کے باوجود اس شہر کی یاد ان کے دل سے نہ گئی- مستنصر حسین تارڑ نے ایک دفعہ بتایا کہ جب انور سجاد ہندوستان گئے اور بمبئی میں بیدی سے ملے تو انھوں نے کہا کہ لاہور جانے کو بہت جی

چاہتا ہے اس پر انور سجاد نے کہا کہ جم جم آئیں۔ بیدی نے کہا اب لاہور میں مجھے پہچانے گا کون تو انور سجاد نے جواب دیا۔ آپ آئیں تو سہی لوگوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے سواگت کے لیے موجود ہوگی۔ اس پر راجندر سنگھ بیدی زاروقطار رو دیے۔ معروف مزاح نگار کنہیا لال کپور کی لاہور سے محبت سب سے مثالی تھی۔ لاہور کا تصور کر کے اُن کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھتی تھی۔ لاہور ایسا شہرِ پُرکمال ہے کہ جسے کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی نے رو رو کر یاد کیا۔ البتہ کنہیا لال کپور کا معاملہ بالکل الگ تھا۔ لاہور سے جانے کے بعد وہ موگا (بھارتی پنجاب کا ایک علاقہ) میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ علمی و ادبی حوالے سے ایک خشک اور بے آب و گیاہ زمین تھی۔ ان سے جب پوچھا جاتا کہ وہ موگا جیسے علاقے میں کیوں آن بسے تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے کہ جب تک ہندوستان لاہور کا ثانی پیدا نہیں کرتا۔ میرے لیے ہندوستان کے تمام شہر اور قصبے برابر ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے ایک مضمون سے بھی کنہیا لال کپور کی لاہور سے بے لوث محبت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ”دروغ بر گردن راوی ان کی لاہور سے محبت کا یہ عالم ہے کہ رات کو لاہور کی طرف پیر کر کے کبھی نہیں سوتے۔ کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ جب یہ لاہور میں تھے تو نہ جانے کس طرح سو جاتے تھے۔ سنا ہے کہ موگا میں بھی لاہور ہی کے خواب دیکھتے ہیں۔ دہلی کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ انارکلی کی ایک جھلک پر سینکڑوں کناٹ پلیس قربان کیے جا سکتے ہیں۔“

پطرس بخاری کہا کرتے تھے

”لاہور کے کاٹے کا علاج نہیں“

وہ عاشق حسین بٹالوی بخاری صاحب لاہور سے محبت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب وہ بیوروکریسی میں آنے کے بعد سرکاری دورے پر لاہور آتے تو بڑے حاکمانہ انداز میں کسی بڑی ہوٹل میں ٹھہرتے اور مجھے کہتے ”عاشق صاحب جی چاہتا ہے۔ رات کو چھپ کر چونے منڈی چلیں، خلیفے کی دکان کے کباب کھائیں۔ گرمیوں کے موسم میں چوک وزیر خاں جا کر فالودہ کھانے کی خواہش کا اظہار کرتے۔ اصل بات یہ تھی کہ لاہور پہنچتے ہیں بخاری صاحب کے زمانہ طالب علمی کا کھلنڈرا پن تازہ ہو جاتا تھا۔ لاہور کے در و دیوار اور کوچہ و بازار سے انھیں عشق تھا۔ جب بھی لاہور آتے۔ عہدِ رفتہ کی تمام گستاخیاں، بے خوابیاں، دلچسپیاں اور ہنگامے جاگ اُٹھتے“

بخاری صاحب کہا کرتے تھے۔

"لاہور ہم سب کا معشوق ہے"

اے حمید باکمال لکھاری تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، مشاہدے اور تبصرے ان پر ختم تھے۔ محبت اور ماضی میں گم رہنے والے اس ادیب کی تحریروں میں نمی، خوشبو، ٹرین کے ڈبوں کی ٹھک ٹھک اور کشمیری چائے کے بلبلوں کی پھک پھک بھی ملتی تھی۔ منظروں، خوشبوؤں، ذائقوں، لوگوں اور جگہوں کا یہ عشق لاہور سے اپنی محبت کا اظہار کچھ یوں کرتا ہے۔

"لاہور کا نام آتے ہی طلسم و اسرار کی الف لیلیٰ کا ایک باب کھل جاتا ہے۔ خود اس نام میں ایک طلسم ہے۔ ایک پراسراریت ہے۔ اس کا جادو ان پر بھی چل جاتا ہے۔ جو جادو پر یقین نہیں رکھتے۔ میری رائے میں لاہور محض ایک شہر نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے۔ یہ کیفیت جب اس شہر کی نیم روشن گلیوں، اس کے پرانے تاریخی باغوں میں چلنے پھرنے کے بعد دل کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتی ہے تو پھر انسان پر اس کیفیت اور حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شہر سے اس کی روح کا رشتہ بہت پرانا اور کبھی نہ ٹوٹنے والا ہے۔"

ایک اور جگہ اے حمید لاہور سے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "کہتے ہیں کہ لاہور کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر ماڈرن ہو جانے کے باوجود لاہور آج بھی اپنی پرانی تاریخ میں ہی زندہ و پائندہ ہے۔ اس کی ٹھنڈی نیم روشن قدیم گلیوں میں سے گزرتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ ابھی کسی نہ کسی گلی میں سے سلطان محمود غزنوی نکل کر سامنے آ جائے گا۔"

ناصر کاظمی نے کہا تھا۔

شہرِ لاہور تیری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

....

کتابوں کی اشاعت کے حوالے سے لاہور کے اُردو بازار کو آج بھی مرکزیت حاصل ہے۔ پاکستان کے بڑے اشاعتی ادارے لاہور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکھاریوں کی اکثریت لاہور سے ہی کتاب شائع کروانے کو ترجیح دیتی ہے۔ مرکز ہونے کی وجہ سے نسبتاً کم پیسوں میں کتاب شائع ہو جاتی ہے۔ کتابت سے وابستہ مشہور کاتب لاہور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ لاہور سے بہت سے مشہور ادبی جریدے شائع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ جن میں نقوش، فنون، سویرا، ادبی دنیا، ادب لطیف، الحمرا اور بیاض شامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

نظم

یہ جو لاہور کو ایک شہرِ ادب کا ہے رتبہ ملا
یہ اُسی کا نہیں شہر والوں کا بھی ایک اعزاز ہے
کس قدر شہر ہیں
کرہَ ارض پر یوں تو بکھرے ہوئے
ایک سے ایک ہے خوش نما، خوش نظر
پھر بھی اے دوستو! اک حقیقت ہے یہ
ان میں کم کم ہیں جو
وقت کے دشت میں
اپنی پہچان رکھتے ہوں کچھ اس طرح
اُن کی تاریخ صدیوں پہ پھیلی بھی ہو
اور وہ آج بھی
ویسے ہی بارور اور آباد ہوں
جوش اور جذبے کی مہکار سے اب بھی معمور ہوں
ایسے مسرور ہوں
یہ ادب شاعری اور تہذیب کی جو روایت یہاں
کب سے موجود تھی
آج اُس کو جو دنیا نے تعظیم دی
وہ تو سب کے لیے باعثِ فخر ہے
آؤ مل کر جہاں بھر میں پھیلے ہوئے
اہلِ علم وادب سے یہ جھک کر کہیں
شکریہ دوستو، شکریہ اس محبت اور عزت کا جو
آپ نے ہم کو دی
شکریہ اس حقیقت کی تسلیم کا
شکریہ اس انوکھی سی تعظیم کا
شہر لاہور کا یہ نیا مرتبہ
صرف اس کا نہیں آپ سب کے لیے ایک
اعزاز ہے
ایک آواز ہے
سازِ امروز میں اپنی موجودگی نقش کرتی ہوئی
ایسی آواز ہے
جس کے ملنے سے اب
عالمی امن کے اس رواں گیت میں ہم
بھی شامل ہوئے
رنگ محفل ہوئے
اس تعلق کا اور رشتہ درد کا یہ جو آغاز ہے
ایک وعدہ ہے یہ اک ارادہ ہے یہ
اب سے اس گیت کو مل کے گائیں گے ہم
یہ جو اعزاز اس شہر کو ہے ملا
اس کی خوشبو کے ہی ساتھ جائیں گے ہم
شعر و علم وادب کی یہ ہمت فزا
دلربا روشنی
جس کے باعث ملی ہے یہ حُرمت ہمیں
اس کی تعظیم کرتے رہیں گے سدا
اے رفیقانِ تہذیب و علم وادب
دوستانِ جہاں، شکریہ شکریہ

امجد اسلام امجد

شہرِ ادب کا مہتاب بیاض

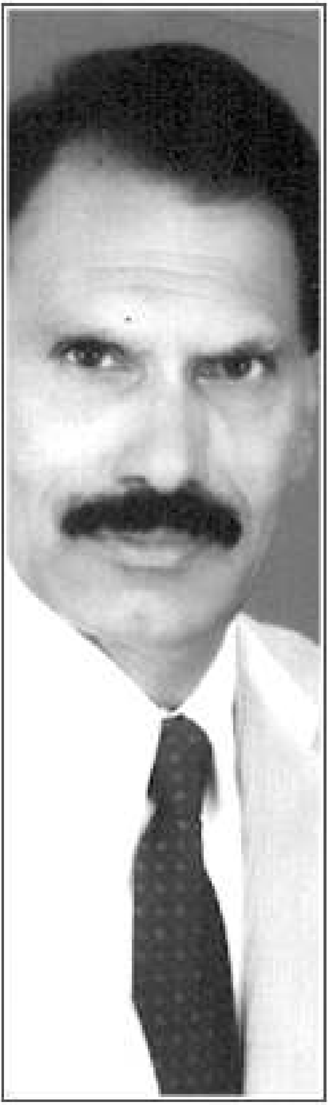

احمد جلیل

لاہور آفتاب ہے مہتاب ہے بیاض
بحرِ ادب کا قیمتی گہراب ہے بیاض

لاتا ہے ہر مہینے نئے برگ و بار یہ
کتنی رُتیں گزر گئیں شاداب ہے بیاض

ہے معتبر یہ علم و ادب کا اشاریہ
اہلِ ادب کے واسطے سُرخاب ہے بیاض

تعبیر بن گیا ہے یہ خالدؔ کے خواب کی
اُس کے ہی رتجگوں کا حسیں خواب ہے بیاض

یونیسکو نے جبھی تو دیا ہے اسے خطاب
لاہور شہر کا ادب آداب ہے بیاض

معیار بن گیا ہے ادب کا یہی جلیلؔ
اب تو ادب حرم کا یہ محراب ہے بیاض

شہرِ لاہور

آپ، ہم لوگ جس میں رہتے ہیں
لوہ کا شہر اِس کو کہتے ہیں!!

سات دن اور آٹھ میلے ہیں
لوگ کس وقت کام کرتے ہیں

بارہ دروازے، تیرہویں موری
شہرِ دل میں اُترتے رستے ہیں

ٹیڑھی گلیاں، جڑے مکان یہاں
فاصلے قربتوں میں سمٹے ہیں

جن کو آثار دنیا کہتی ہے!!
بام و در، شہ نشیں، دریچے ہیں

قلعہ لاہور! تیرے سینے میں
بیں صدیوں کے راز بستے ہیں

شاہی مسجد کے چار مینارے
سطوتِ شاہ کے قصیدے ہیں

شہر سے دور ہٹ گیا راوی
برج قلعے کے اب بھی اونچے ہیں

رائے راجو کہ ہار کر جیتا
شیخ ہندیؒ تو ہند جیتے ہیں

حضرتِ داتا گنج بخشؒ کے ہاں
کشف محجوبیت کے کھلتے ہیں

اوڑھ کر شاہ حسینؒ چولے کو
مادھو ہر شام کو نکلتے ہیں

جب بھی میلہ چراغاں لگتا ہے
سات رنگ آسماں پہ اُڑتے ہیں

راگ، دربار، اب نہیں سجتا
لوگ سب اپنی نیند سوتے ہیں

اک میاں میر قادریؒ کے سبب
وحدتِ حق کے دیپ جلتے ہیں

تیاگ ڈالا شکوہِ سلطانی
شہ بدخشیؒ کے زور چلتے ہیں

میرؒ، ملاؒ، میاںؒ، معالیؒ سب
میم تک جانے والے رستے ہیں

ایک سنگت میں ڈھول اور دھمال — در مزار جمالؒ بجتے ہیں
رنگ دیتے بسنتی چولے کو — جوگی، سادھو، فقیر آتے ہیں
شاہ عنایتؒ کے دوار میں اب تک — بلھے شاہوںؒ کے گھنگرو بجتے ہیں
تا ابد زندگانی کا محور — خانقاہیں ہیں اور تکیے ہیں
جو بھگت سنگھ زیب دار ہوا — دائمی زیست کے کرشمے ہیں
فیضؔ، اقبالؔ اور ندیمؔ کے دل — ارضِ لاہور میں دھڑکتے ہیں
کوئی منٹوؔ، منیرؔ ہو یا حفیظؔ — خاکِ لاہور کے دفینے ہیں
چھوڑ کر میں جہاں چلا جاؤں — یہ مرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
جو بھی آتا ہے، جا نہیں پاتا — لوٹ جائے تو ناگ ڈستے ہیں
اک تمنا ہے جو نہیں مرتی — ٹوٹ جاتے ہیں جو ارادے ہیں

غافر شہزاد

نام روشن دہر میں دائم رہے لاہور کا

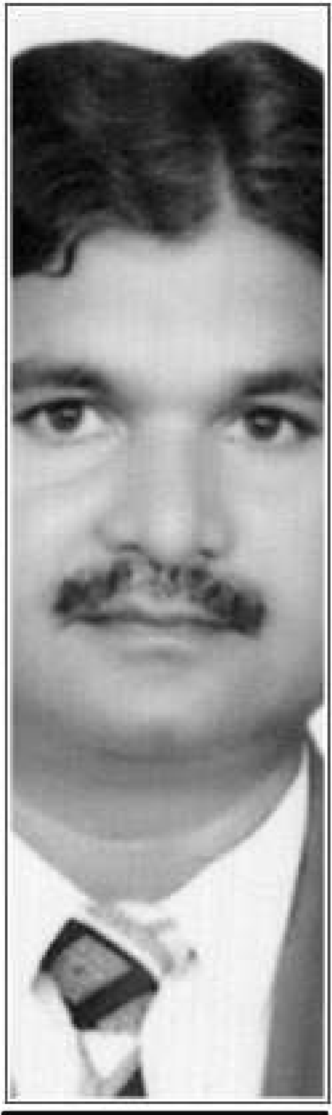

زندگانی کی علامت ہے فضا لاہور کی
یار مجھ کو راس ہے آب و ہوا لاہور کی

تم ذرا وابستگی دیکھو مری لاہور سے
سن رہا ہوں دشت میں بھی میں صدا لاہور کی

لوٹ آتا ہوں دیارِ غیر سے میں دوستو
کھینچ لاتی ہے مجھے مہر و وفا لاہور کی

آج میرا دل فسردہ ہے ذرا سا اس لئے
یار مجھ کو بات کوئی تو سنا لاہور کی

تجھ کو میرے پیار کا پھر بھی نہ اندازہ ہوا
میں نے تجھ سے بات کی ہے بارہا لاہور کی

اک سے بڑھ کر ایک شاعر اس چنیدہ شہر کا
شان ہیں یہ شاعرانِ خوش نوا لاہور کی

جانتا ہے ہر گلی کوچہ مجھے لاہور کا
سیر کرتا رہ گیا میں سر پھرا لاہور کی

بھول جاؤ گے زمانے کی سبھی رنگینیاں
دیکھ لو گے رونقیں جو تم ذرا لاہور کی

نام روشن دہر میں دائم رہے لاہور کا
روشنی پھیلے جہاں میں اے خدا لاہور کی

انصر حسن

ساڈا سوہنا اے پنجاب او مترو

ہر پاسے پھل تے بوٹے نیں
سنگ پکے تے ان ٹوٹے نیں
ایہدے سبھاں دے سنگ سُوٹے نیں
ایہدے واسی لاجواب او مترو
ساڈا سوہنا اے پنجاب او مترو

ایہدا وڈا شہر لہور اے
جس دی اپنی شان تے نوہر اے
جیویں پکھوآں وچ چکور اے
جتھے رہندے داتا صاحب، او مترو
اڈا سوہنا اے پنجاب او مترو

ہر ذرہ تاریاں وانگوں اے
ہر بندہ پیاریاں وانگوں اے
ایہ چن لشکاریاں وانگوں اے
اُتے چمکاں مثل آفتاب او مترو
ساڈا سوہنا اے پنجاب او مترو

سوہنے پنڈے تے شہر وی ایہدے نیں
پہلے پچھلے پہر وی ایہدے نیں
جنگل بیلے نہر وی ایہدے نیں
دل نوں کرن جے سیراب او مترو
ساڈا سوہنا اے پنجاب او مترو

اس وچ دریا پنج بہندے نیں
وچ خوشیاں وگدے رہندے نیں
ورہیاں دی کہانی کہندے نیں
جیویں سوہنی ڈبی چناب ، او مترو
ساڈا سوہنا اے پنجاب او مترو

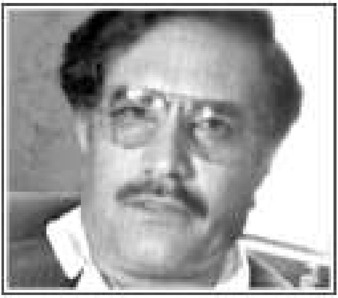

شوکت محمود شوکت

”شہرِ ادب لاہور ہے“

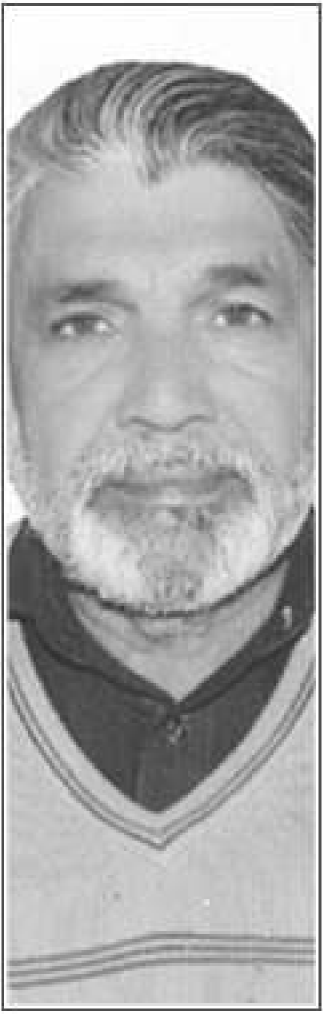

دیکھیے شہرِ ادب لاہور ہے
شاعروں کا منتخب لاہور ہے

اہلِ دل ، اہلِ خرد ، اہلِ ’بیاض‘
سچ تو یہ ہے سب کا سب لاہور ہے

ملتا جُلتا ہے فلک کے چاند سے
کشورِ علم و ادب لاہور ہے

میں تو وابستہ ’بیاضِ‘ دل سے ہوں
میری شہرت کا سبب لاہور ہے

گرم ہے آرائشِ کاکُل ندیم
جگمگاتا شہرِ شب لاہور ہے

سلیم اختر ندیم

------------ انتخاب ------------

- خالد احمد -

-------- نعمان منظور --------

سرِ میدانِ کارزارِ حیات
ذہن بھی دل کے ساتھ جنگ میں تھا

"یہ شہر آباد ہو"

علم و فن میں نام ہے جس کا وہ شہر لاہور ہے
گھر گھر چرچا عام ہے جس کا وہ شہر لاہور ہے

عمرِ رفتہ کی سبھی یادیں یہاں محفوظ ہیں
ان سے وابستہ سبھی باتیں یہاں محفوظ ہیں

اس کو جو عزت ملی ہے میرے رب کی دین ہے
اس کو جو شہرت ملی ہے میرے رب کی دین ہے

اس کو جو بھی جانچنا چاہے کسی سے کم نہیں
ہم سبھی یہ جانتے ہیں دشمنوں میں دم نہیں

میری رب سے یہ دعا ہے یہ شہر آباد ہو
اس کا جو بھی ہو مکیں وہ بھی سدا دلشاد ہو

نیاز خان اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بکھری پڑی ہیں چار طرف سبز پتیاں
خالد ملا نہ سایۂ اشجار دوستی

اپنے لاہور کے لیے نظم

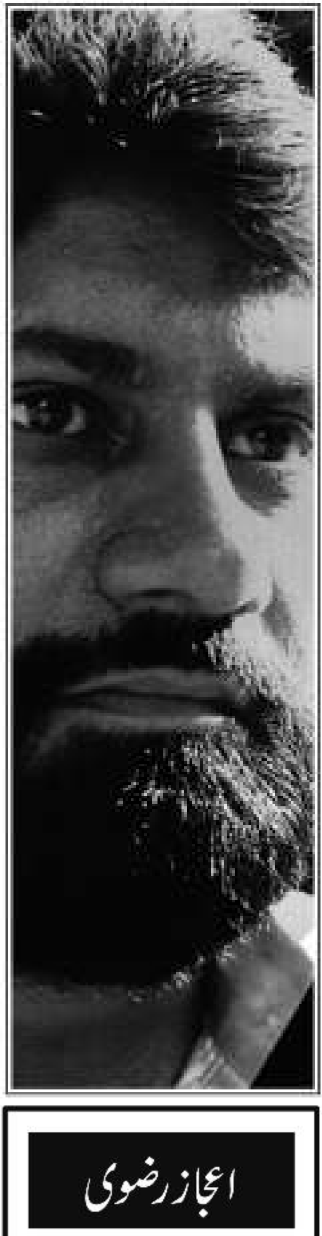

کتنی صدیوں نے سنوارا تجھ کو
تو مری جان
مرا چین بھی ہے
تیری آغوش میں گزرا بچپن
تو کبھی باپ کبھی ماں کبھی بھائی ٹھہرا
تیری انگلی تری آغوش ترے ہاتھوں نے
مجھ کو جینے کا ہنر بخشا ہے
اک سڑک ایک گلی ایک مکاں
آج بھی دل کے کسی گوشے میں
رات دن نوحہ کناں رہتے ہیں
تیرے رستوں تری گلیوں ترے بازاروں میں
آج بھی تیرا ملاقاتی ہوں
تیری مٹی مرے ماں باپ کی چادر ٹھہری
اور اب میں اسی چادر کے لیے
رات دن سجدے کیے جاتا ہوں
اے مرے شہر مرے دل کے مکیں
تیرا ہر رستہ مرے پوتے کی ہو راہ گزر
رکھیو تو خیر خبر

اعجاز رضوی

لاہور میری جان

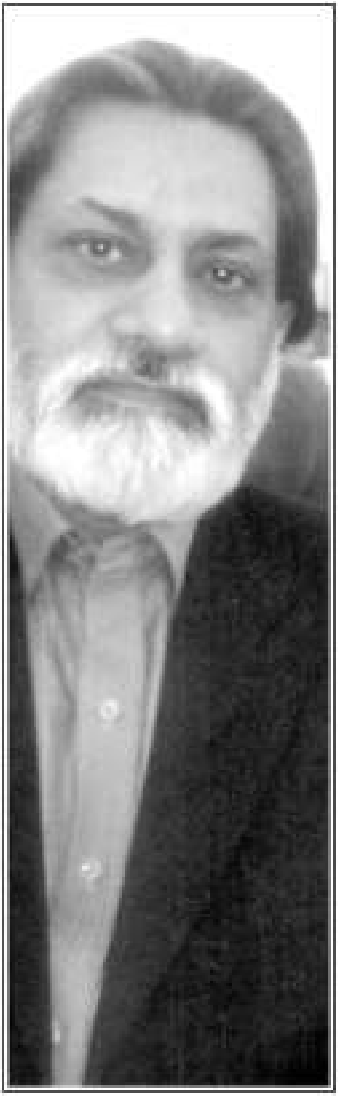

اعجاز رضوی

مجھے شہر لاہور سے پیار ہے
میں ہر صبح اُس کو پیار سے دیکھتا ہوں
اور ہر شام اس کو گالیاں دے کر سو جاتا ہوں
میں ہر نئی بلڈنگ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں
مگر سڑکوں پر ہچکولے کھاتے اور
پاتال میں رینگتے لوگ مجھے غمگین کرتے ہیں
میں کھلونوں سے بھری دکانیں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں
مگر دکان سے باہر گم سم بچہ مجھے مار ڈالتا ہے
میں ہر روز نئے منظر ڈھونڈنے نکلتا ہوں
مگر یکسانیت سے بھری جیبیں لے کر گھر آجاتا ہوں
تھکن زدہ لباس خوابوں کی واشنگ مشین
میں دھوتا ہوں
دریائے راوی باغ جناح
اور مال روڈ مجھے تھپکی دیتے ہیں
سکول اور قبرستان میرے ساتھ دھمال ڈالتے ہیں
گھنٹوں کانٹوں بھرے بستر پر خود سے لڑتا ہوں
اور ایک فاتح کی طرح
پکار پکار کر کہتا ہوں،

مجھے اپنے شہر سے پیار ہے
مجھے اپنے شہر سے پیار ہے

لاہور کے لیے

قطعات

رہیں آباد ہر گھڑی لاہور
تیرے چوپال، چائے خانے ترے
چشمِ بد سے رہیں سدا محفوظ
تیرے بازار ، آستانے ترے

تمام دُکھ مرے خود میں سمیٹ لیتا ہے
یہ وصف آج بھی لاہور کے مزاج میں ہے
ہر ایک شخص کو رکھے پناہ میں اپنی
کمال خوبی مرے شہر کے رواج میں ہے

وسیم عباس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دیوان خالد پڑھے گا یہاں
ہم نوا کیا ، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

جاذبِ نظر شکیل اور نمی دانم

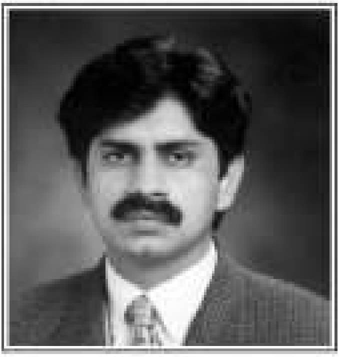

شکیل جاذب اگر شاعر نہ ہوتا تو کسی فلم کا ہیرو ہوتا۔ اس کا دراز قد، پُر بہار چہرہ، لہجے کا دھیما پن اور کھلتی ہوئی گہری مسکراہٹ پر جانے کتنی پریاں فدا ہوئیں مگر اس نے کبھی اپنی فنکارانہ خوبیوں پر توجہ نہ دی اور شاعر بن گیا اور شاعر بھی ایسا کہ اس کے اشعار بھی اس کی شخصیت کی طرح بھرپور اور دلکشی لیے ہوئے۔ پڑھنے اور سننے والے کو اپنے سحر میں لیے کس رومان بھری وادی میں چھوڑ آئیں:

تغافل بھی برتنا دھڑکنیں ہمراز بھی کرنا
کسی کا ہو کے بھی رہنا، نظر انداز بھی کرنا
نگاہیں پھیرنا اور دیکھنا چشمِ تصور سے
مقفل کر کے دروازہ، دریچہ باز بھی کرنا
کسی کے روبرو ایسا کہاں آسان ہوتا ہے
خموشی کا بھرم رکھنا، سخن آغاز بھی کرنا

....

غزل شروع ہوتی ہے تو کسی پہاڑی جھرنے کی طرح بہتی جاتی ہے۔ نمونے کا شعر لکھتے ہوئے قلم کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اوق سے اوق مضمون بھی جب اس کے قلم سے گزرتا ہے تو پانی ہو جاتا ہے۔ وہ انتہائی میٹھے لہجے میں بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے اور اس کا یہی سلیقہ اور قرینہ اس کی شعر گوئی میں بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اپنے لہجے کی طرح وہ اپنے رویے میں بھی تہذیب کی خوشبو ساتھ لے کر چلتا ہے:

پھر تجھے اور مجھے اور کہیں جانا ہے
ہمسفر ساتھ تو چل جتنی سڑک باقی ہے

....

شکیل جاذب سے میری پہلی ملاقات پی ٹی

ارشد جمال

وی کے ایک مشاعرے کے دوران ہوئی میں اُن دنوں پی ٹی وی ہوم اسلام آباد میں سکرپٹس ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ پی ٹی وی پالیسی کے مطابق شعرائے کرام کا کلام دیکھتے ہوئے جب شکیل جاذب کا کلام دیکھا تو اس کے کلام کی ندرت نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے کلام میں اخلاص کی وہ روشنی تھی جو شعر کہنے والے کے نازک احساس کی عکاسی کرتی ہے۔ مجھے شکیل جاذب بھی اچھا لگا، کلام بھی اس کے لہجے کا ٹھہراؤ بھی اور رچاؤ بھی۔ یہاں تک کہ میں نے پروڈیوسر سے کہہ دیا کہ وہ میزبانی کے فرائض بھی شکیل جاذب کو ہی سونپ دے۔ ہمارا تجربہ کامیاب رہا اور شکیل جاذب نے اپنے حسنِ بیان سے مشاعرے کو چار چاند لگا دیے اور شکیل جاذب نہ صرف مشاعرے کا بلکہ دیگر پروگراموں کا بھی میزبان بن گیا، جن میں ٹاک شوز اور موسیقی کے پروگرام بھی شامل تھے۔

رفتہ رفتہ شکیل جاذب سے دوستی ہو گئی۔ شکیل جاذب ایک معروف شاعر اور کمپیئر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر بھی فائز ہے۔ اس کے فرائضِ منصبی کے حوالے سے اس پر بعض اہم اور بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں مگر جب بھی اُسے کسی مشاعرے یا کسی دوسرے پروگرام کی میزبانی کے لیے بلایا گیا تو اس نے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ وقت نکال کر میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ قدرت نے اسے ہر موضوع پر بولنے کا ملکہ ودیعت کر رکھا ہے لہٰذا پروگرام ادبی ہو، مذہبی ہو، سائنسی ہو یا معاشی شکیل جاذب اس کی میزبانی کو نبھانے کا فن اچھی طرح جانتا ہے۔ کبھی کسی پروڈیوسر کو مایوس نہیں کرتا۔

شکیل جاذب پچھلی کئی دہائیوں سے شعر کہہ رہا ہے مگر اسے پڑھنے اور سننے کا مجھے بہت کم موقع ملا ہے بس وہی کلام، جو اس نے مشاعرے میں پڑھنا ہوتا تھا وہی مجھے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ وہ ایسا شاعر بھی نہیں ہے دوسروں کو اپنا کلام سنانے کا شوق ہو۔ اس کی پہلی کتاب ''جب سانس میں گرہیں پڑتی ہیں'' مجھ تک نہ پہنچ سکی سوائے پڑھنے کا موقع بھی نہ ملا۔ جب افتخار عارف اور عصرِ حاضر کے دیگر شاعر شکیل جاذب کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں تو اسے پڑھنے کا اشتیاق اور بھی بڑھنے لگا۔ حال ہی میں شکیل جاذب کی دوسری کتاب ''نمی دانم'' منظرِ عام پر آئی ہے اور اس کی ایک کاپی مجھے بھی ملی ہے۔ میں شکیل جاذب کو پڑھنا چاہتا تھا سو پہلی فرصت میں مطالعہ شروع کر دیا۔ ''نمی دانم'' میں نعتیں، منقبت، سلام، مدح، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ شکیل جاذب نے تمام اصنافِ سخن میں اپنی محبت، عقیدت اور شعریت کے جوہر دکھائے ہیں۔ شکیل

جاذب نے اپنی دلکش اور عمدہ سخن وری سے "نمی دانم" میں ایک چمن کھلا دیا ہے۔

شکیل جاذب کا فکری نظام اور جمالیاتی رچاؤ، خیال کو ایسے قرینے سے شعر میں ڈھالتا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے اس کی لفظی اشکال اور تراکیب و توازن کا حسن، حسنِ فطرت کے انداز میں وجود پاتا ہے۔ اس کے مزاج کا ٹھہراؤ اور اس کے وجدان کی گہرائی زندگی کے آئینے میں ایک ایسے عکس کا اضافہ کرتی ہے جو نیا ہونے کے باوجود بہت مانوس اور دل کے قریب محسوس ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کے تصور میں بننے والی تصویر کسی ابہام کے بغیر واضح طور پر دکھائی دینے لگتی ہے۔

جاذب چراغ عشق سے روشن ہے کائنات
اس روشنی میں کچھ بھی چھپا دیکھتے نہیں

....

ایک شاعر کی حیثیت سے شکیل جاذب محض ہجر کا رونا ہی نہیں روتا وہ اپنے محبوب کے حسن کی تصویر کشی کائنات کے فریم میں رکھ کر ایک ایسے زاویے سے کرتا ہے کہ اس کے محبوب کا حسن آفاقی روپ دھار لیتا ہے:

یہ جو اب لگتا ہے رنگِ آسماں دیکھا ہوا
آپ کی آنکھوں سے پہلے تھا کہاں دیکھا ہوا

....

اردو کی کلاسیکی شاعری پر نظر ڈالیں تو غزل کے اشعار کے موضوعات کسی حد تک محدود رہے ہیں۔ زندگی کو ایک باغ کی صورت دکھایا گیا ہے، جس میں کبھی بہار آتی ہے اور کبھی خزاں اور اس کے لیے باغ کے ہی سارے استعارے برتے گئے ہیں۔ پھر ایک خیالی محبوب جو انتہائی خوبصورت مگر خودسر، نامہربان اور بے وفا، ہر عاشق کو اس کے ہاتھوں قتل ہونے اور ستم سہنے کی تمنا، تیسرا بڑا موضوع میخانہ اور رندانہ انداز میخانے فضا کو شعری استعاروں میں ڈھالا گیا، چوتھا شیخ اور واعظ کے نظریات سے روگردانی پانچواں محبوب کی سراپا نگاری زلف و رخسار قد و قامت پر طبع آزمائی اور چھٹا کلاسیک شاعری کا پسندیدہ ترین موضوع یاسیت رونا دھونا کبھی محبوب کی بے وفائی کا کبھی ہجر کا کبھی گردشِ حالات کا جس میں شاعر کے دل کا اضطراب، اشکوں، نالوں اور آہوں سے اظہار پاتا ہے۔

یہ موضوعات جدید غزل میں بھی موجود ہیں کیونکہ یہ ایک مضبوط روایت کا حصہ بن چکے ہیں ہر شاعر کے شعری مطالعے اور خیال کی ترکیب میں یہ ہدایت ایک انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان موضوعات سے بچ نکلنا کسی بھی شاعر کے لیے آسان نہیں ہوتا لیکن عہد حاضر کے کچھ شعرا نے اس روایت میں رہتے ہوئے ایک نئی روایت کو جنم دیا ہے ان شعرا میں شکیل جاذب بھی شامل ہیں۔

شکیل جاذب محبت کو زندگی کا جواز بناتا ہے۔ محبت کے علاوہ وہ ہر ایک خواہش کو محض کھیل تماشا اور کھلونے خیال کرتا ہے:

وہ تو میں بس پیار کر بیٹھا کسی سے اے خدا
ورنہ تیرے ان کھلونوں سے بہلتا کون تھا

....

گویا محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو جاودانی ہے دیگر سب فانی ہے۔ شکیل جاذب کا دل محبت کے احساس میں لپٹا ہوا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سوائے محبت کی آرزو کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا:

مجھ نہال آرزو سینے میں کیا رکھتا ہوں میں
کوئی بھی موسم ہو یہ پودا ہرا رکھتا ہوں میں

....

محبت کی آرزو کو ہر موسم میں شگفتہ رکھنے کی آرزو، دراصل ایک ایسے انسان کی روحانی تربیت کی رغبت رکھتی ہے جو زندگی اور فطرت کے ماحول میں کسی تخریب کا باعث نہیں بنتی۔ شکیل جاذب اسی فطری محبت کی تجسیم اور تفہیم چاہتا ہے مگر زندگی کے تقاضے اور اسکی مصروفیات اس جذبے کی نقش گری کا وقت ہی نہیں دیتیں۔ وہ زندگی کی بے مصرف مصروفیات کے چنگل سے نکل کر اپنی دنیا میں محبت کے جذبوں کو استوار کرنا چاہتا ہے۔ جب اسے ایسا کرنے کی فراغت نہیں ملتی تو اس کی یہ آرزو ایک دکھ کے پیکر میں ڈھل کر اس کی پلکوں پر کسی آنسو کی طرح چمکنے لگتی ہے:

ہم سے اک نقش کی تفہیم بھی جاذب نہ ہوئی
دستکیں دیتے رہے آنکھ پہ منظر کیا کیا

....

وہ اس محبت کے جذبے کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جب وہ اس جذبے کے سحر سے نکل کر کاروبار دنیا میں مصروف ہوتا ہے تو بہت جلدی روب جاتا ہے، تھک جاتا ہے گھبرانے لگتا ہے۔ وہ سانس لینے کے لیے پھر اسی جذبے کی محبوب صورت دیکھنے کی تمنا کرتا ہے تاکہ وہ اپنے احساس کی سانس بحال کر سکے:

تو نہ دیکھے تو عجب حبس میں دم گھٹتا ہے
تیرے دیکھے سے میں برسات میں آجاتا ہوں

....

شکیل جاذب کی مصروفیات میں اور بھی بہت کچھ ہے یاد رکھنے کو جسے وہ اپنی ڈائری میں یا موبائل کی نوٹ بک میں لکھ کر رکھتا ہے کہ نئے دن کی مسافت میں اسے کس کس مرحلے سے گزرنا ہے وہ دن میں بے شمار لوگوں سے ملتا ہے ان سے مالی معاملات پر طویل بحثیں کرتا ہے مگر شام کو جب وہ گھر لوٹ رہا ہوتا ہے تو وہ دن کے بکھیڑوں کو بھول چکا ہوتا ہے اور وہ اسی ایک لمحے کو اپنے دل کی شاخ پر کسی تازہ گلاب کی طرح کھلتا ہوا دیکھتا ہے جس میں کسی کے لمس کی خوشبو گلاب کی پتیوں پر شبنم کی طرح چمک

رہی ہوتی ہے:

لپٹا ہوا ہے جسم سے اک لمس مستقل
کہنے کو آپ مجھ سے فقط لمحہ بھر ملے

....

جہاں تک شکیل جاذب کی سخنوری کے ہنر کا تعلق ہے اسے اپنے خیال اور الفاظ پر پوری طرح دسترس ہے۔ وہ ہزاروں بار کہے ہوئے مضمون کو بھی جب شعر کی صورت میں ڈھالتا ہے تو اُسے ایک ایسے نئے پہلو اور زاویے کے ساتھ کہتا ہے کہ آئینے میں اس کا عکس بالکل نیا دکھائی دینے لگتا ہے۔ کربلا کی پیاس پر لاکھوں شعر کہے جا چکے ہیں مگر شکیل نے اس مضمون میں بھی ایک ایسی ندرت پیدا کر دی ہے ایک ایسا استعارہ بنا دیا ہے جو اس پیاس کو ایک نیا آہنگ فراہم کر دیتا ہے۔ ایک نئے دکھ سے آشنا کرتا ہے:

اک جوئے اشک رواں ہے کہ جو تھمتی ہی نہیں
جانے کن پیاسوں نے دعا مانگی تھی پانی کی

....

اسی طرح مرزا غالب کی زمین میں شعر کہنا ”اسد اللہ خاں قیامت ہے۔ میں نے جب بھی غالب کی زمین میں کسی شاعر کی غزل پڑھی ہے تو دل نے یہی کہا کہ بات بنی نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ غالب کی زمین میں غزل کہنے والے غالب کے مضامین اور لہجے کو بھی غزل میں لانے کی کوشش کرتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں۔ شکیل جاذب نے غالب کی زمین میں غزل کہتے ہوئے غالب کی زمین میں فصل اپنے مضامین اور لہجے کی بوئی ہے:

دن رات چہچہاتے ہیں دل کی منڈیر پر
یادوں کے پنچھیوں کو بھی کوئی شجر ملے

تم تک تو خیر مجھ کو پہنچ پانا تھا کہاں
اس جستجو میں کچھ نئے رستے مگر ملے

....

غزل پڑھتے ہوئے ذرا بھی دھیان غالب کی طرف نہیں جاتا یہی شکیل جاذب کی عمدہ ہنرکاری ہے کہ وہ بنے بنائے رستے پر بھی اپنے انداز اور اپنی رفتار کے ساتھ چلتا ہے۔ شکیل جاذب نے ابھی تک کے شعری سفر میں جو کمالات دکھائے ہیں وہ اس کی فکری عمارت کا ڈھانچہ مضبوطی سے قائم کر چکے ہیں۔ دنیائے شعر و سخن میں اس کے مقام کا تعین ہو چکا ہے مگر اس کے سخن کا سفر ابھی باقی ہے۔ ابھی اسے شعر کی مزید بلندیوں تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ نئی منزلوں کی طرف قدم بڑھانا ہے۔

اس قیدِ بام و در سے نکل جانا چاہیے
وحشت کو گھر نہیں کوئی ویرانہ چاہیے

☆☆☆☆☆

شاعرِ شب ریز

اُردو ادب کے ناقدوں کو ایک سخت گیر گروہ شاعر اور شاعری سے مایوس ہو کر کہیں گم سا ہو گیا ہے - اس گروہ کا خیال ہے کہ جدیدیت کا ملمع چڑھا کر نئے شاعر حضرات پرانے شاعروں کے سرقے میں مصروف ہیں- یوں اُنکی رائے میں اب شاعری میں کوئی بات نئی بات نہیں رہی- دوسری طرف فیس بک پہ شاعری کے طوفان نے ناقدانِ فن کو مخمصے میں ڈال رکھا ہے کہ وہ جدید شاعروں کی شاعری اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا کس معیار پر تعین کریں- یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جس طرح ساغر صدیقی کے استحصال کے باعث بہت سے موقع پرست لوگ شاعروں کی فہرست میں نام لکھوانے میں کامیاب ہو گئے تھے - اسی طرح فیس بک اور یوٹیوب کے استعمال سے بہت سے لوگ غیر ملکی شاعروں کی شاعری پر سرقے کی واردات میں لگے ہوئے ہیں - اساتذہ کے کلام کے مطالعے اور چند خالص معتبر شاعروں کی صحبت میں بیٹھ کر ہم نے یہ دریافت کیا ہے - کہ شاعری شوقیہ عمل نہیں ہے یہ ایک سنجیدہ فکری اور جذباتی تحریک ہے جو حقیقی شاعر کے اندر قدرتی طور پر موجزن رہتی ہے - شوقیہ شاعروں کو ہم نے مزاحیہ اور پھر سوقیانہ شاعری کرتے کرتے تھکتے ہوئے جمود کا شکار ہو کر دستبردار ہوتے دیکھا ہے - سچا، تخلیقی اور حقیقی شاعر انسان اور انسانی قدروں کیلئے قدرت کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے - جب تک انسان اپنے مکمل قدرتی عناصر اور اوصاف کے ساتھ زندہ رہ کر تمدن اور معاشرت کا پابند ہے وہ خوشی غمی اور فطرت کے حسن کی تمام وارداتوں اور کیفیات کے تجربے سے گزرے گا- ذہین اور حساس لوگ متحرک رہیں گے - جذباتی اور رومانی دل پھڑکے گا جذبوں سے دھڑکنے والا دل شاعر کو لکھنے اور سوچنے پر مائل رکھے گا - سچا شاعر شعر لکھے بغیر زندہ

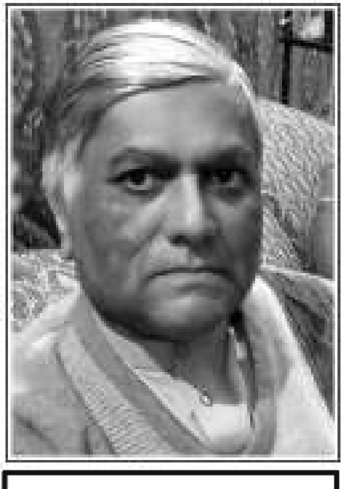

کلیم خارجی

نہیں رہ سکتا۔اس موقع پر ملتان کے شاعر شاکر شجاع آبادی یاد آگئے ۔ جو جسمانی عارضے کے باوجود شاعری اور تخلیقی توانائی سے محروم نہیں ہوئے ۔قدرت شاعر پیدا کرتی ہے۔ ان سے شاعری کرواتی ہے۔ اور لکھواتی ہے اُردو شاعری کے حوالے سے رجائیت کے سینکڑوں اسباب ہیں۔ کل کے بانکے اور منچلے لڑکے، ادھیڑ عمری میں سنجیدہ، پختہ اور دل پذیر شاعری کر رہے ہیں۔بیسوں نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ آج کا حقیقی شاعر مایوس نہیں کرتا بلکہ تسکین اور مسرت کا باعث بنتا ہے۔زبان وکلام میں بڑی حد تک ستھرا پن آچکا ہے۔ اُردو زبان کا اپنا لہجہ اور شناخت تکمیل کے مراحل طے کر چکا ہے۔ جدید شاعر شائستگی اور رومانیت سے بھرپور عمدہ نظمیں اور غزلیں لکھ رہے ہیں ۔البتہ اُردو شاعری کا نقاد خاموش تماشائی بن کر نظر انداز کرنے پہ تلا ہوا ہے ۔نئے لکھنے والوں میں ایک شاعر عزیز عادل جوانی کے دہلیز پھلانگتا ہوا اپنے تخلیقی شعور اور قدرتی وجدان کے ساتھ سامنے آیا ہے۔عزیز عادل اپنی سوچ کے پختہ پن زبان ولہجے کی نفاست کے ساتھ معتبر شاعروں کے قبیلے میں شامل ہوا ہے ۔اسکا پہلا شاعری مجموعہ شب ریزہ رومانی شاعری کے مہذب اور دھیمے لہجے کے ساتھ پڑھنے والوں کو مسرت اور حیرت کے تجربے سے روشناس کرواتا ہے ۔ عزیز عادل کی شاعری پڑھنے سے یقین ہوجاتا ہے کہ اُس نے ایک عمر اپنی تربیت میں گزاری ہے۔وہ دُنیاوی روحانی جذباتی اور معاشرتی ریاضت میں نیک نیتی اور دیانتداری کے ساتھ اس منزل پر پہنچا ہے کہ اسکی شاعری پڑھنے اور سننے والوں کے دل میں اپنی جگہ بناتی ہے۔بے شمار معتبر اور دلکش آوازوں میں اُسکی آواز پہچانی جاسکتی ہے پشتون سرزمین پر اُردو شاعری کے حوالے سے بہت کم عرصے میں اپنے قابل قدر شناخت بنانے والوں میں مقبول عامر کے بعد یہ اعزاز عزیز عادل کے حصے میں آیا کہ اس کے شعر لوگ یاد رکھتے ہیں ۔اور محفل میں گفتگو کے دوران پھلجڑی کے طور پر استعمال بھی کرتے ہیں۔

ہم نے اندھی چال چلی ہے
جس طرح کوئی کھلونے کو بنا، توڑتا ہے

ہم نے بازی ہاری ہے
اس طرح مجھ کو بھی برباد کرےگی دُنیا

سارے پیڑ اسی کے ہیں
جب کسی خواب کی تکمیل کو ہم لکھ لیں گے

جس کے ہاتھ میں آری ہے
حادثہ پھر کوئی ایجاد کرےگی دُنیا

میرے خیراندیشوں کی
رگ رگ میں عیاری ہے

عزیز عادل کی کتاب شب ریزہ نفاست اور تہذیب کے شائستہ لہجے میں رچی ہوئی ہے

اس نے شعر تخلیق کرنے کے بعد اُسے اسطرح تراشا ہے کہ اظہار میں احتجاج عموی رویے اور پروپیگنڈہ کا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ دُنیا محبوب کے ساتھ معاملات اور کلام کے انداز میں وہ شائستگی کو برقرار رکھتا ہے:

مجھ کو ہے قید کرلیا، صیادِ وقت نے
آپ ہو جاتے ہیں جب حال میں شامل میرے
آ تا نظر نہیں ہوں جو میں آشیانے میں
اور بڑھ جاتے ہیں دو چار مشاغل میرے
کافی ہے مجھ کو آتشِ دوراں کی آنچ ہی
آپ چل کر تیرے دروازے تلک آیا ہوں
خون اپنا مت جلایئے مجھ کو جلانے میں
تو کہاں ڈھونڈ رہا ہے مجھے قاتل میرے

....

شب ریز میں بے شمار اشعار شعریت، معنویت اور صوتی تاثیر میں رچے ہوئے ہیں ۔اسکی غزل روایت کی پابند کرتے ہوئے جدیدیت کے بوجھ سے منحرف اور کمزور نہیں ہے ۔اسکے مزاج کی طرح اسکا شاعرانہ انداز دھیما ستھرا اور پُر اعتماد ہے ۔اسکا شعری اظہار تکلف اور انا کے احساس میں جاگتے ہوئے دل کا رومانی دھڑکا ہے۔ شاعرانہ معاملہ بندی اور انسانی رویوں کے اظہار میں وہ جدید عہد کا پڑھا لکھا انسان بن کے سامنے آتا ہے ۔وہ محبوب، دوست، دُشمن، دُنیا اور زندگی کے تمام معاملات پر ایک تکلف اور رجے کے لحاظ سے بات کرتا ہے:

عالم کرب سے نکل چکا ہے
دُکھ کا استعارہ ہوں درد کی شباہت ہوں
شکر ہے دل میرا سنبھل چکا ہے
میں نگاہِ جاناں کی بے رُخی کا مارا ہوں
عرض یہ ہے کہ وہ مرا گل چین
اس پہ پھل بھی آئے گا مجھ کو یہ نہیں معلوم
گل کو جاتے ہوئے مسل چکا ہے
میں تو پیڑ بوتا ہوں فرصتوں کا مارا ہوں
اب مجھے گفتگو کا یارا نہیں
موسم دل میرا بدل چکا ہے

....

شب ریز کے مطالعے سے پڑھنے والا عزیز عادل کی طبیعت اور مزاج سے مانوس ہو کر اُسکی شاعری کا پورا حظ اُٹھاتا ہے۔ کیونکہ اُسکی اُداسی اور نا اُمیدی اُسے دُنیا سے کنارہ کشی کرنے کی بجائے کسی دریا کے کنارے لے جاتی ہے جہاں وہ اُداس لمحوں میں آسماں پر ستاروں کی تلاش میں جھانک تانک میں لگ جاتا ہے ۔عزیز عادل کی شاعری اُداسی کے بعد مسرت کے تجربے کی شاعری ہے۔ کیونکہ وہ کسی ایک ستارے کی روشنی کو پورے آسمان اور اپنے پورے وجود پہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے۔ یہی روشنی اُسے شاعر بناتی ہے اور وہ شعر شعر شب ریز مرتب کرتے کرتے شب ریزیوں کا معتبر شاعر بن کر ہمیں آئندہ کیلئے بھی اپنی شاعری کے بارے میں پُر اُمید رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اطراف [تم چلے آؤ پہاڑوں کی قسم]

دو ہفتے تک دُنیا کے دوسرے بلند ترین اور بلا شبہ خطرناک ترین پہاڑ ’کے ٹو‘ پر جاری رہنے والا سرچ آپریشن اختتام کو پہنچا تو ایک سرکاری اعلامیے کے مطابق یہ بات تو طے ہوگئی کہ ’کے ٹو‘ پہاڑ کو موسم سرما میں سر کرنے کی خواہش رکھنے والے تین کوہ پیما ہمیشہ کے لیے دُنیا کے مشکل ترین قاتل پہاڑ کی نذر ہو گئے اور برف کی سفید چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو گئے ہیں۔ سانحہ قراقرم کا خدشہ اُس دن سے شروع ہو گیا تھا جس دن یہ اِنکشاف ہوا کہ تین کوہ پیما جن میں پاکستان سے تعلق رکھنے والے عظیم کوہ پیما محمد علی سدپارہ، آئس لینڈ سے جان سنوری اور چلی سے جان پابلو مہر پریتو کا اپنے بیس کیمپ سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ رابطہ منقطع ہونے سے مراد یہ تھی کہ تینوں مہم جو بیک وقت کسی ایسی صورتِ حال کا شکار ہو چکے ہیں کہ تینوں میں سے کوئی ایک بھی بیس کیمپ میں موجود اپنے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ رابطہ ختم ہوتے ہی فوج اور دوسرے اداروں نے مل کر ایک طویل خطرناک اور اعصاب شکن سرچ آپریشن شروع کیا اور یہ آپریشن دو ہفتے تک شدید موسم کے دوران بھی جاری رہا۔ خراب موسم کے باوجود دو ہفتے تک جدوجہد اور انتھک کوشش کی گئی لیکن مسلسل ناکامی پر سرچ آپریشن ترک کر دیا گیا۔ سرچ آپریشن کا اختتام اِس بات کا اعلان تھا کہ محمد علی سدپارہ اور اُن کے ساتھی عظیم جدوجہد میں کام آ گئے۔ یوں محمد علی سدپارہ اور ساتھی کوہ پیما بھی اُن چھیاسی بہادروں کی فہرست میں شامل ہو گئے جنھوں نے ’کے ٹو‘ کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور کوہ پیمائی کو دوام بخشا۔ پہاڑوں کی دُنیا میں رہنے والوں کے خیال میں، پہاڑوں سے محبت کرنے والے پہاڑوں کی محبت

طلعت شبیر

میں جان پر کھیل کر پہاڑوں کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ برف پوش پہاڑوں پر موت کو گلے لگانے والے بہادر کوہ پیماؤں کو پہاڑ ہمیشہ کے لئے اپنی بانہوں میں لے لیتے ہیں۔

۲۰۲۱ء کا موسم سرما کوہ پیمائی کی تاریخ کا منفرد موسم تھا۔ اس سال نیپال سے تعلق رکھنے والے دس کوہ پیما 'کے ٹو' کو موسم سرما میں سر کرنے کے ارادے سے پاکستان پہنچے۔ سرد موسم میں پہاڑ کو سر کرنا ایک نہایت خطرناک مہم جوئی تصور کی جاتی ہے۔ موسم سرما میں ۲۰۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائیں چلتی ہیں اور درجہ حرارت منفی ۶۰ ڈگری سے بھی نیچے گر جاتا ہے جس کی وجہ سے پہاڑوں کو سر کرنے والے کوہ پیماؤں کی زندگیوں کے لیے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ انتہائی سرد موسم اور برفانی طوفان سردیوں میں 'کے ٹو' جیسے پہاڑ کو سر کرنا اس لئے بھی مشکل اور خطرناک ہے کہ پہاڑ کی چوٹی کو جانے والے راستے انتہائی تنگ، خطرناک اور دشوار گزار ہیں۔

اس کے علاوہ سردیوں میں بہت زیادہ برف باری کی وجہ سے پہاڑ کی جانب جانے والے راستوں پر سمت کا تعین بھی از حد مشکل ہو جاتا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں پہلی بار کے ٹو کو سردیوں میں سر کرنے کی کوشش کی گئی جو کہ ناکام ہو گئی تھی۔ اُس کے بعد متعدد بار سرد موسم میں مہم جوئی کی کوشش کی گئی لیکن کسی بھی کوہ پیما کو کامیابی نہ مل سکی۔ ۲۰۲۱ میں پہلی مرتبہ کے ٹو کو سر کرنے کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ کوہ پیماؤں کی دُنیا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی جب ۱۶ جنوری ۲۰۲۱ کو نیپال سے تعلق رکھنے والے دس کوہ پیماؤں نے اعلان کیا کہ وہ سرد موسم میں کے ٹو کو سر کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

محمد علی سدپارہ سکردو سے تعلق رکھنے والے ایک معروف کوہ پیما تھے اور واحد پاکستانی تھے جو آٹھ ہزار میٹر سے بلند چودہ چوٹیوں میں سے آٹھ چوٹیوں کو سر کر چکے تھے۔ اور اُن کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ پاکستان میں موجود آٹھ ہزار میٹر سے بلند چوٹیوں کے علاوہ نیپال میں بھی تین پہاڑ فتح کر چکے تھے۔ ۲۰۱۶ میں جب محمد علی سدپارہ نے نانگا پربت کو سردیوں کے موسم میں سر کیا تو اُنھوں نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ وہ ایک دن کے ٹو کو بھی نانگا پربت کی طرح سرد موسم میں سر کریں گے۔

کے ٹو پر سردیوں میں کی جانے والی مہم نے کوہ پیماؤں کی دُنیا میں ایک ہلچل مچادی تھی۔ کوہ پیمائی میں دلچسپی رکھنے والے افراد اور پہاڑوں سے محبت کرنے والے لوگ سرد موسم میں 'کے ٹو' پر کی جانے والی مہم جوئی کے بارے میں اچھی خبر سننے کو منتظر تھے۔ نیپالی کوہ پیماؤں کی کامیابی کے بعد محمد علی سدپارہ نے کے ٹو پر پاکستانی پرچم لہرانے

کی خواہش کا اظہار کیا۔ محمد علی سدپارہ نے پاکستانی پرچم لہرانے کی اپنی خواہش اس سے قبل اپنی تمام فتوحات کے موقع پر پوری کی۔ 'کے ٹو' پر سردیوں کے موسم میں پاکستانی پرچم لہرانا محمد علی سدپارہ کی آخری خواہش تھی جس کے لیے اُن کو اپنی جان کی قیمت ادا کرنا پڑی۔ لیکن محمد علی سدپارہ جیسے عظیم لوگ ہی جان سکتے ہیں کہ جب آپ اپنے ملک کا نام روشن کرنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں تو جان جیسی قیمتی شے بھی کتنی بے معنی ہوتی ہے۔

مہم کے پہلے چند دن بہت سنسنی خیز تھے لیکن جب یہ خبر آئی کہ محمد علی سدپارہ اور اُن کے ساتھی کو پیا 'کے ٹو' پر لاپتہ ہو گئے ہیں تو پورے ملک میں ایک عجیب اُداسی چھا گئی۔ پوری دُنیا سے محبت اور ہمدردی کے جذبات اُمڈ آئے۔ دُنیا بھر میں بالخصوص پاکستان میں لوگ ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنے لگے کہ کوئی معجزہ رُونما ہو جائے اور محمد علی سدپارہ اور اُن کے ساتھی اس خطرناک ترین مہم سے سلامت واپس لوٹ آئیں۔ پوری پاکستانی قوم بھی پہلے محمد علی سدپارہ کی زندگی کی اُمید اور کسی معجزے کی آس میں اور پھر اُن کے دُکھ میں یکجا نظر آئی۔

عظیم پاکستانی محمد علی سدپارہ نے جدوجہد، پیشہ ورانہ مہارت اور محبِ وطنی کی قابلِ تقلید مثال چھوڑی۔ وہ اپنے ملک کے لیے جیئے، اپنے ملک کے لئے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا، کوہ پیمائی کو پیشے کے طور پر چُنا، اپنے ملک کا مہمات کے ذریعے نام روشن کرنے کی سعی کرتے رہے اور پہاڑ کی چوٹی پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کی خواہش میں جان دے دی۔ محمد علی سدپارہ اُن بہادر سپوتوں میں سے تھے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پہاڑوں سے ٹکرا جاتے ہیں، طوفانوں کی مخالف سمت چلتے ہیں، اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے پہاڑوں کی آغوش میں رہ جاتے ہیں۔ اُن کے بیٹے ساجد سدپارہ نے کیا خوب کہا۔ ''جب پہاڑ آپ کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو وہ ہمیشہ کے لئے آپ کو اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں''۔ یہ سچ ہے کہ پہاڑ اُن کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے اس لیے پہاڑوں نے محمد علی سدپارہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ لیکن محمد علی سدپارہ لاکھوں پاکستانیوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گے۔ اس نااُمیدی اور یاس کی گھڑی میں محمد علی سدپارہ نے قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور جان کا نذرانہ پیش کرکے بتایا کہ وطن سے محبت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ محمد علی سدپارہ نے دھرتی سے محبت کا چراغ جلا دیا اور ایک خاموش پیغام دیا کہ سب اپنے اپنے حصے کے چراغ جلائیں۔

☆☆☆☆☆

''تلاشِ جمال میں گمشدہ عورت'' اور فرخندہ شمیم

اُردو ادب کے کئی اہم نقادوں نے افسانے کی مختلف تعریف بیان کی ہے- ان میں ایک اہم نام جناب محمد حسین عسکری صاحب کا بھی ہے وہ فرماتے ہیں ''اگر مجھے افسانے کی کوئی تعریف پسند آتی ہے تو ایڈگر ایلن پوکی، جس کے نزدیک مختصر افسانہ وہ ہے جسے تقریباً دس منٹ سے لے کر پچاس منٹ کے دوران پڑھا جاسکے یا پھر کوئیلر کوچ کے شعر سے متعلق مقولے میں مناسب ترمیم کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ افسانہ وہ ہے جسے یورپ میں موپاساں، چیخوف اور ایسے ہی چند اور لوگوں نے لکھا ہے- سیدھی اور سچی بات بھی یہی ہے کہ چاہے اس میں عنائیت ہو یا ڈرامائی عناصر، خواہ وہ زندگی کی ایک جھلک دکھاتا ہو، اس میں کردار نگاری کی گئی ہو یا ایک تاثر پیش کیا گیا ہو، سب سے پہلی اور ضروری چیز یہ ہے کہ وہ افسانہ ہو-''

دیکھا جائے تو افسانہ اپنے اصطلاحی اور تکنیکی مفہوم میں اردو ادب کی سب سے مقبول صنف ہے- منشی پریم چند سے لے کر اب تک بے شمار افسانہ نگاروں نے اُردو ادب کو لازوال اور شہکار افسانے دیئے ہیں- موجودہ دور میں بھی فنِ افسانہ نگاری ترقی کی راہوں پر گامزن ہے- اور اب تک افسانوں کی کئی شہکار کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہو رہی ہیں- ان ہی میں سے ایک کتاب ''تلاشِ جمال میں گمشدہ عورت'' بھی ہے جو ایک ایسی خوبصورت افسانہ نگار کی تخلیقی صلاحیتوں کی گواہی دیتی ہے جسے ہم سب فرخندہ شمیم کے نام سے جانتے ہیں-

اس کتاب میں ان کے 17 منتخب افسانے شامل ہیں جن پر کئی معتبر ادبی شخصیات کی رائے بھی شامل کی گئی ہیں جو فرخندہ شمیم کو دنیائے اُردو ادب میں اعتماد بخشتی ہیں-

محترمہ فرخندہ شمیم کے افسانوں میں درد کی ایک ایسی کسک ملتی ہے، جو عموماً صرف نہایت حساس تخلیق کار ہی کی تخلیق میں ہی نظر آتی ہے- وہ ایک عورت ہونے کے ناطے اُن سارے رشتوں اور اُن کی باریکیوں پر بھی نظر رکھتی ہیں، جو معاشرے میں کہیں تو عورت کو نہایت اعلیٰ ظرف بناتے ہیں تو دوسرے رُخ پر ان کی کمزوریوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، جو ہمارے معاشرے میں اب ایک برائی یا وبا کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور ایسے ہی نظریہ کو سامنے رکھ کر فرخندہ کا افسانہ ''اماں کا وعدہ''

رومانہ رومی

رشتوں کے اتار چڑھاؤ پر گفتگو کرتا بولتا افسانہ ہے۔ اقتباس "مائیں نئے رشتے کو قبول نہیں کرتیں۔ ماؤں کو لگتا ہے ان کی حکومت بانٹنے والی آ گئی ہے۔ ماؤں کو اختیارات کی تقسیم سے خوف آتا ہے اس لیے وہ بہوؤں کا بیٹوں کی طرف کھلنے والا کواڑ بند کر دیتی ہیں۔"

افسانہ "سرجی" پڑھ کر آپ کے لب مسکرا دیں گے اور ذہن میں سوال کا جواب صرف "سرجی" ہی آئے گا کیوں کہ یہ ہمارے معاشرے کے اُن افراد کی ذہنی احساسِ کمتری کو بیان کرتا ایک ایسا افسانہ ہے جو اس So Called اسلامی معاشرے کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتا ہے۔

فرخندہ شمیم کا افسانہ "کمیٹی" ہمارے معاشرے کے اُس طبقے کی بے بسی پر لکھا جانے والا ایک ایسا افسانہ ہے جسے پڑھ کر آپ کا حساس دل رو پڑتا ہے جہاں غریب ماں باپ پر جوان بیٹی کی شادی کا بوجھ کبھی انسان کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا اور بیمار کر دیتا ہے۔ اقتباس "اس ماہ مہمان تھے کہ سونامی کی طرح گھسے آ رہے تھے۔ خاص طور پر سعدیہ کے ہونے والے سسرال...... جس جس نے سعدیہ کو نہیں دیکھا وہ امنڈ آ رہا تھا۔ جیسے کوئی سیل لگی ہو۔ صابرہ بیگم مہمان داریاں کر کر کے نڈھال تھیں۔ روپیہ تیزی سے خرچ ہو رہا تھا۔ بل سارے ادا کیے تو رونے کو آ گئیں۔ کمیٹی کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔"

محترمہ فرخندہ شمیم کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی آنچ نے اُن کے افسانوں کو حرارت بخشی ہے۔ قارئین اُن کے افسانوں کی تازگی اور کردار نگاری سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہتے۔ اور اس کی وجہ صرف اور صرف اُن کی کھلی آنکھوں سے معاشرے کو دیکھنا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات و واقعات، سماجی تلخیوں اور ناانصافیوں کا ادراک کر کے افسانے کشید کرتی ہیں۔ اُن کے اسلوب و بیان میں زبان کی دلچسپ فراوانی، قاری کو افسانے سے آخری لمحوں تک جوڑے رکھتی ہے۔ افسانہ 'بستر کی سلوٹیں" ہو یا "تلاشِ جہاں میں گمشدہ عورت" "سجدۂ سہو" ہو یا "کانپتی ساعتوں کی لرزش" اُن کے تمام افسانوں کی پلاٹ اور بنت پر اُن کی گرفت آپ کو اُن کی تعریف کرنے پر مجبور کر دے گی۔

عام زندگی میں بھی محترمہ فرخندہ شمیم ایک نہایت باشعور اور دردمند انسان ہیں وہ زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے وہ اپنے معاشرے کے لوگوں کے دکھوں، غموں اور اُن کے مسائل کو افسانے کا رنگ دے کر لوگوں میں احساس و شعور بیدار کرنا چاہتی ہیں، جو ہمارے معاشرے میں اب تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے۔ فرخندہ کے افسانے لوگوں کو غور و فکر کرنے کا موقع دیتے ہیں کہ اس لیے زندگی کے تلخ حقائق کو سمجھنے میں وہ اپنے افسانوں کے ذریعے لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اُن کی کہانیاں اس بدصورت، بدنیت معاشرے کے لیے ایک سوال چھوڑ جاتی ہیں کہ شاید اس کا جواب اس معاشرے کا کوئی فرد دے سکے۔ میں اور ادب کے سب ہی قارئین آئندہ بھی اُن سے ایسے ہی خوبصورت اور بہترین افسانوں کی توقع رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بابُ العلم (گولڈن جوبلی نمبر)

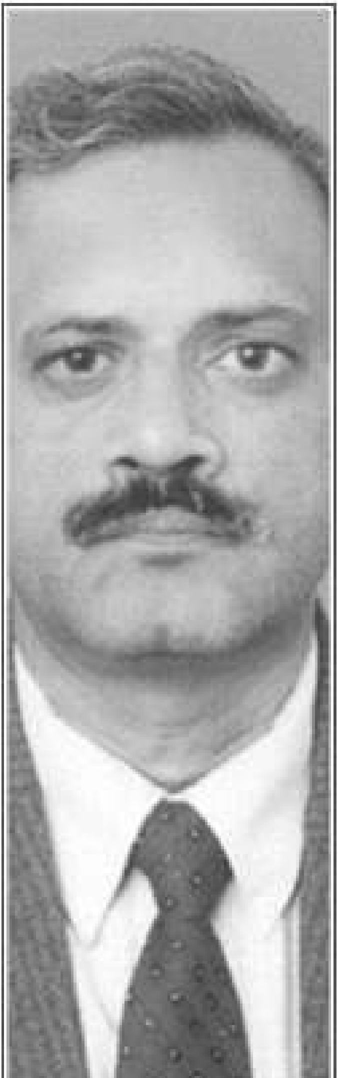

واصف سجاد

کسی بھی تعلیمی ادارے کا مجلّہ اس مرکزِ علم و آگہی کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا عکاس تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ اپنے خطے اور عہد کی علمی و ادبی فضا کا ترجمان بھی بن جاتا ہے طلبہ اور اساتذہ کی تحریروں کے علاوہ اردو ادب کے معروف تخلیق کاروں کے فن پاروں کی اشاعت نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کا وسیلہ بنتی ہے اور عصری علمی اور ادبی رویوں کو سامنے لاتی ہے۔ اس تناظر میں شہرِ غزل ساہیوال کے قدیم تعلیمی ادارے گورنمنٹ امامیہ ڈگری کالج کے مجلّہ ''باب العلم'' کے گولڈن جوبلی نمبر جو حال ہی میں اشاعت پزیر ہوا ہے کا جائزہ لیں تو یہ ایسی علمی و ادبی دستاویز دکھائی دیتا ہے جو موضوعات کی بوقلمونی اور اہمیت کے باعث حقیقتاً حوالے کی چیز بن گیا ہے۔

ادارہ ہذا کے پرنسپل جناب پروفیسر محمد رفیق شہزاد جو شہر کے معروف علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں کی ذاتی دلچسپی اور ڈاکٹر عطا الرحمٰن قاضی، پروفیسر کاشف شہزاد پروفسر ریاض احمد اور پروفیسر محمد مشتاق کے حسنِ ادارت نے اس گولڈن جوبلی نمبر کو یادگار بنا دیا ہے۔ حسبِ روایت اس میگزین کو اردو، پنجابی اور انگریزی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصۂ اردو میں مضامین کا گوشہ پروفیسر جیلانی کامران، ڈاکٹر منظور اعجاز، پروفیسر نبیلہ کیانی، پروفیسر امجد علی شاکر اور نورین اختر کی فکر انگیز تحریروں سے جگمگا رہا ہے۔

خدائے سخن میر تقی میر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر عتیق اللہ اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے نادر مضامین شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔

معروف ادیب اور دانشور حکیم محمود رضوی کی مکمل کتاب ''اقبال اور عقلیت پسندی'' کی مکرر اشاعت نے اس میگزین کو ہر حوالے سے باوقار بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ''منٹگمری میں وکالت از چودھری نذیر احمد خان'' ''ساہیوال کی ادبی سرگزشت (یادوں کے آئینے میں)'' از بشیر احمد بشیر اور ''چھوٹے شہروں کی داستان'' از ڈاکٹر مبارک علی ایسی تحریریں ہیں جو شہر ساہیوال کے علمی و ادبی مزاج کا آئینہ ہیں۔

حصۂ نظم و غزل میں پرانے اور نئے لکھنے والوں کی ایسی کہکشاں سجائی گئی ہے جو دل و نگاہ کو مستنیر کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ قضا ابن فیضی، ڈاکٹر خورشید رضوی، گوہر ہوشیار پوری، جعفر شیرازی، بشیر احمد بشیر، انجم رومانی، منیر نیازی، ظفر اقبال، ناصر شہزاد، محمود علی محمود، قاضی ظفر، قاضی حبیب الرحمٰن، پروفیسر قیوم صبا، لیاقت علی عاصم، پروفیسر سید ریاض حسین زیدی، مسعود عثمانی، غضنفر عباس سید، علی رضا، پروفیسر محمد اکرم ناصر، فرتاش سید، پروفیسر ارجمند احمد قریشی، ایزد عزیز، آفتاب کاوش، پروفیسر کاشف شہزاد، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، قاضی پروفیسر کلیم اشرف، مرتضیٰ ساجد، واصف سجاد، عدنان بشیر، محمد علی، عبدالقدیر مرزا، شاہد رضوان اور دیگر شعرا کی تخلیقات اس میگزین کا وہ حسن ہے جس سے صرف نظر ممکن نہیں۔

پنجابی ادب کے لیے مختص کیے گئے صفحات خواجہ غلام فریدؒ، حضرت میاں محمد بخشؒ اے ڈی اعجاز، پروفیسر مظفر حسین وڑائچ، پروفیسر کاشف شہزاد، محمد اختر خان، عبدالقدیر مرزا، طالب جتوئی، احمد راہی، یونس متین، قسور بٹ اور بابا خوشی محمد نثار کی لکھتوں سے مہک رہے ہیں۔

''باب العلم'' کا حصۂ انگریزی پروفیسر ریاض احمد، پروفیسر محمد بلال اشرف، پروفیسر محمد مشتاق، محمد اسلم، علی حسن، محمد علی، محمد عمران، علی رضا، عبداللہ ریاض، سہیل رشید، علی زیب خان اور محمد احمد کے رشحات فکر سے مزین ہے۔

کالج میں ہونے والی مختلف سرگرمیوں کی تصویری روداد قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہے۔ تقریباً 250 صفحات پر مشتمل یہ گلدستہ اپنی رنگت اور خوشبو میں لاثانی ہے۔ اس میگزین کو ان خوبیوں کے باعث دیر تک یاد رکھا جائے گا اور علمی، ادبی حلقوں میں زیر بحث رہے گا۔ اس علمی ارمغان کے لیے کالج کی انتظامیہ اور حلقۂ ادارت بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆☆☆

غزل

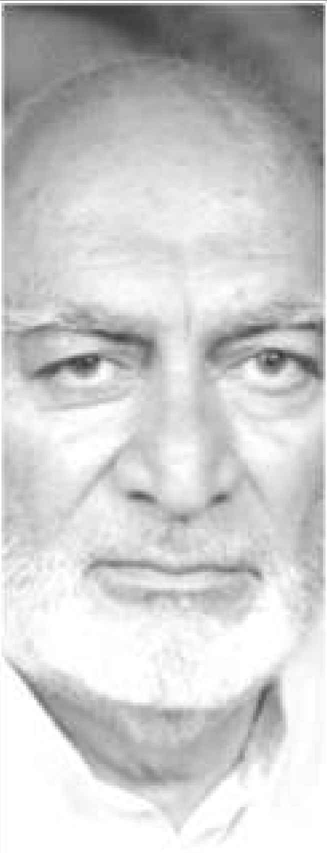

آصف ثاقب

تو سمجھتا ہے کہ برباد ہے آصف ثاقب
تیری بیداد کی فریاد ہے آصف ثاقب

گیت گاتا ہے محبت کے زمانوں والے
اپنے سُر تال میں نوشاد ہے آصف ثاقب

کُند تیشے سے جگر چیر کے رکھے اپنا
اس نئے دور کا فرہاد ہے آصف ثاقب

قید کرنے کے لیے لوگ نکل آئے ہیں
اپنے پندار میں آزاد ہے آصف ثاقب

اور بھی دشت میں دیوانے کھلے پھرتے ہیں
آپ کو ایک مگر یاد ہے آصف ثاقب

جس نے کشمیر میں اسلام کو تہذیب کیا
اس بڑے شخص کی اولاد ہے آصف ثاقب

ایسے ہنستے ہوئے آنسو بھی بہا دیتا ہے
شاد ہوتے ہوئے ناشاد ہے آصف ثاقب

غزل

کل اور آج اور کل
سب کچھ ہے اک پل

بے رنگی ہے موت
جیون ، رنگ محل

شعلے کا احساں
سب سے ہے بوجھل

الحمد و للہ
ہر مشکل کا حل

ایک سے ہیں قانون
بستی ہے جنگل

موسم بدلے گا
آج نہیں تو کل

دنیا روکتی ہے
دل کہتا ہے ، چل

اپنے خواب میں جی
اپنی آگ میں جل

اُس کو دیکھا کر
وہ جو ہے اوجھل

باتیں کرتا ہے
آنکھوں میں کاجل

مشکل تھا آغاز
پھر تو چل سو چل

وہ بھی گزرے گا
آنا ہے جو کل

امجدؔ ، جیون ہے
اُڑتا سا اک پل

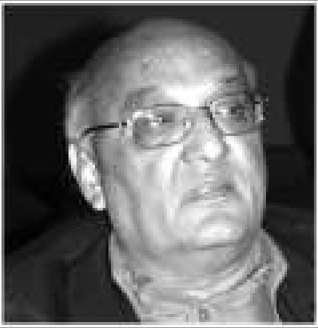

امجد اسلام امجد

غزل

شرم سے سر نہیں اٹھتا کہ یہ کیا کر چھوڑا
اپنے ہاتھوں ہی سے گھر اپنا جلا کر چھوڑا

ٹیڑھ ایسی تھی طبیعت میں کہ آخر اُس نے
شہر کا شہر عدو اپنا بنا کر چھوڑا

اس نے کیا خواب دکھائے تھے حسیں باغوں کے
اور کس دشتِ بلا میں ہمیں لا کر چھوڑا

تنگ اتنے ہوئے سردار کی سرداری سے
لوگ اٹھے اسے مسند سے اٹھا کر چھوڑا

سہہ گئے جان پہ کیا کیا نہ قیامت لیکن
اس مصیبت نے تو مٹی میں ملا کر چھوڑا

اور کیا اُس سے تعلق میں ہو اخلاص کا پاس
جتنا واجب تھا سلوک اس سے سوا کر چھوڑا

یاد رکھا نہ کوئی جورِ زمانہ عالؔی
جو بُرا کر گیا اس کا بھی بھلا کر چھوڑا

جلیل عالی

غزل

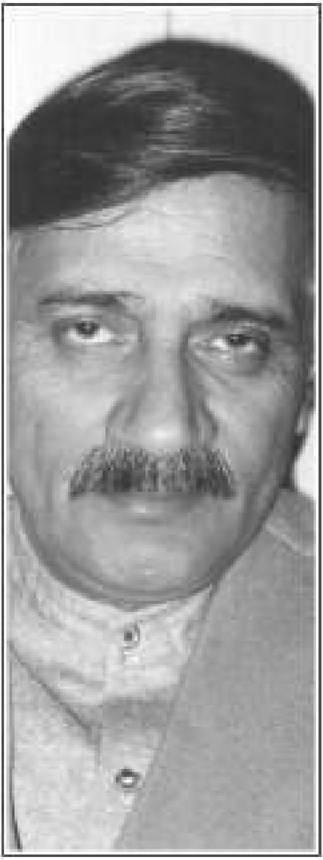

منزل کہیں نہیں ہے تو رستہ ہے کس لیے
میں خوب جانتا ہوں یہ دنیا ہے کس لیے

جب میں نے اُس سے ربط ہی رکھنا نہیں کوئی
پھر دل نے اُس کے بارے میں سوچا ہے کس لیے

جب تجھ کو یہ خبر ہے ترے بس میں کچھ نہیں
تو نے ہوا میں تیر چلایا ہے کس لیے

غرقاب ہو گیا ہے سبھی کچھ تو سیلِ تند
اب تو نے مڑ کے شہر کو دیکھا ہے کس لیے

اپنے پروں پہ اُڑنے کا فن جانتا ہوں میں
مجھ کو خیال اور کا آیا ہے کس لیے

تو جانتا تو ہے ترے ہوتے ہوئے نجیبؔ
اتنے بڑے ہجوم میں تنہا ہے کس لیے

نجیب احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس طرف دیکھیں پئے اذنِ حضوری، آقاؐ!
ترے چاکر، ترے درباں، تہی داماں کیوں ہیں؟

غزل

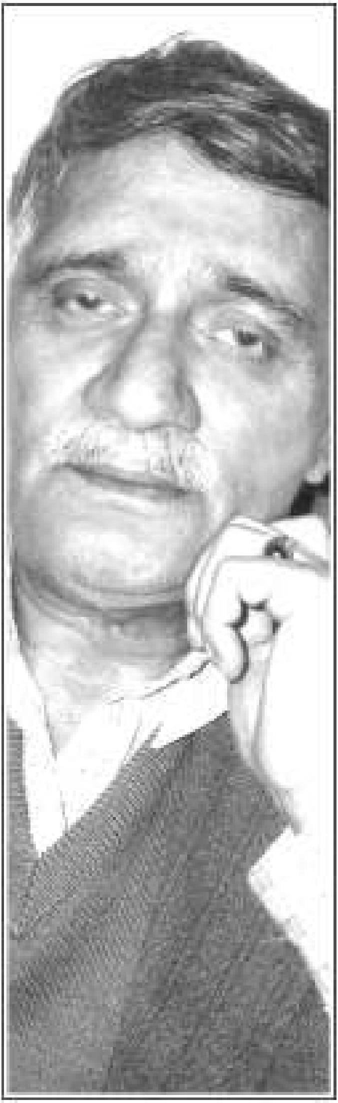

اس لیے بھی رکا ہوا ہوں میں
راستہ سب کو دے رہا ہوں میں

کوہسارِ الم سے ٹکرا کر
بین کرتی ہوئی صدا ہوں میں

لوگ لوگوں سے لاتعلق ہیں
کیسی بستی میں آ بسا ہوں میں

خار و خس مجھ میں کس طرح ٹھہریں
ایک دریا کا راستہ ہوں میں

اور اب کے ہوا چلی ایسی
شاخ پر صرف رہ گیا ہوں میں

جانے کس دکھ سے گفتگو کے لیے
بات بے بات ہنس رہا ہوں میں

خود سے کب کا بچھڑ چکا ہوں نجیبؔ
کب سے تنہائی میں پڑا ہوں میں

نجیب احمد

غزل

ان کہی کا جواب مانگتے ہو
کس عطا کا حساب مانگتے ہو

حرفِ کن مانگتے ہو خالق سے
اہرمن سے نصاب مانگتے ہو

کیا تمھیں زندگی سے پیار نہیں
آگہی کا عذاب مانگتے ہو

مانگتے ہو محبتوں کا صلہ
اجرِ کارِ ثواب مانگتے ہو

مجھ سے میری طلب کا کیا مطلب
جو نہیں دستیاب ، مانگتے ہو

نیتِ شوق میں خلل ہے کہیں
راہ سے اجتناب مانگتے ہو

میرے حق میں بھی التماس کوئی
تم دعا لاجواب مانگتے ہو

دشت ہے گلستاں نہیں ہے کنور
ہر قدم پہ گلاب مانگتے ہو

اعجاز کنور راجہ

غزلیں

کر گزرو جو کرنا ہے
اک دن آخر مرنا ہے

بوند بوند سے ہم نے بھی
خالی برتن بھرنا ہے

دنیا میں جب آئے ہیں
عشق تو ہم نے کرنا ہے

اس کا دامن صاف رہا
تہمت ہم پر دھرنا ہے

دیکھ لیا اس دنیا میں
جینا ہے یا مرنا ہے

میں ہوں جس نے دکھ سے بھی
اپنا دامن بھرنا ہے

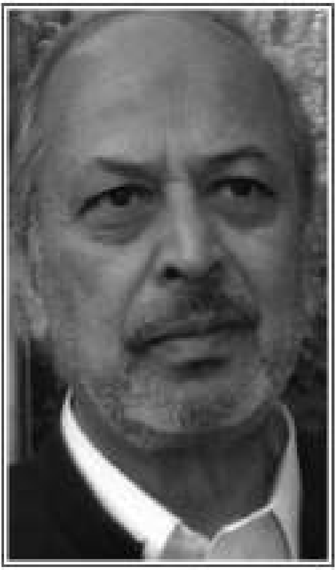

حسن عسکری کاظمی

ایک محشر تو ہم بپا کرتے
شورِ ماتم ہی بے نوا کرتے

بے ارادہ سہا ستم ہم نے
یہ تو سوچا تھا ہم وفا کرتے

کتنا ویراں ہوا چمن اپنا
کیسے صرصر کو ہم صبا کرتے

ان کو دنیا عزیز تھی لیکن
فکرِ عقبیٰ تو وہ ذرا کرتے

لوٹ کر بھی وہ رہنما ٹھہرے
کچھ بھی کرتے مگر حیا کرتے

غم کے پہلو میں بیٹھنا تھا ہمیں
جب نہ ملتی خوشی تو کیا کرتے

اپنی بستی میں ہم حسنؔ بیٹھے
سجدۂ شکر ہی ادا کرتے

غزل

چَین بھی برف سی ٹھنڈک میں نہیں
رُوئی تھوڑی سی بھی توشک میں نہیں

کیا کسی اَور سے اُمید رکھوں؟
وسعتِ ظرف تو مجھ تک میں نہیں!

آپ جو کچھ بھی مُجھے کہتے رہیں
دِل دُکھانا مِرے مسلک میں نہیں

میرے بچپن کا جو ہم جولی تھا
وہی سِکّہ مری گولک میں نہیں

تیری چاہت میں کمی آئی ہے کیا؟
تیری خوشبُو ترِی دستک میں نہیں !

پل میں کر دے گا وہ سب کچھ حاضر
جو بھی درویش کی بیٹھک میں نہیں

اُس پہ مرکوز ہیں نظریں میری
جو کبوتر مری کابک میں نہیں

جس کی آواز پہ دل جھوم اُٹھے
کیا کہیں ہم کسی ناٹک میں نہیں؟

میرے ہم عصر جو کرتے ہیں، کریں
مبتلا مَیں کسی چشمک میں نہیں

خشک تخلیق کے سوتے کیوں ہوں
ذہن جب نرغۂ دیمک میں نہیں !

شاد ہوں اپنی پھٹی چادر میں
کسی مانگی ہوئی اَجرک میں نہیں

عہدِ تشکیک میں رہ کر بھی نسیم
شُکر اللہ کا، مَیں شک میں نہیں!

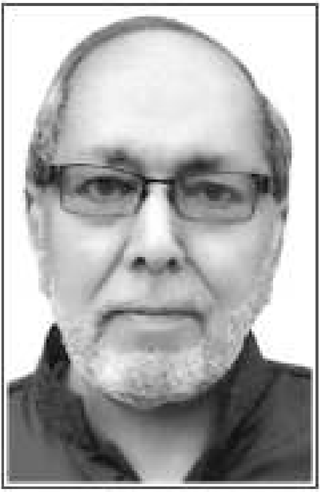

نسیمِ سحر

غزل

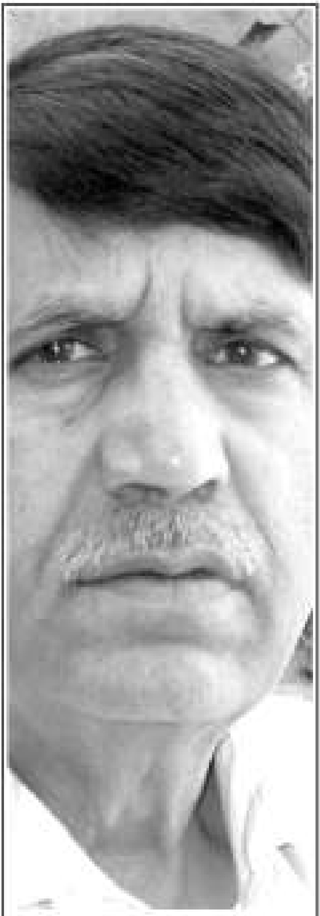

اس بار میرے ساتھ مرا چارہ گر نہیں
اور دل میں کچھ بھی خوف نہیں، کوئی ڈر نہیں

بس آسمان، سائباں صورت سروں پہ ہے
سایہ نہیں کہیں بھی، کہیں بھی شجر نہیں

جب چل پڑے ہیں پار اُترنا ہے کیسے بھی
دریا ترے فریب سے ہم بے خبر نہیں

اے رہبرو سبھی ہے تمھارا کیا دھرا
کوئی بھی راہزن تو سرِ رہگزر نہیں

کچھ بھی کہو لگا ہوا ہے میلہ دشت میں
کتنے ہی لوگ جا بجا ہیں جن کا گھر نہیں

آسان اِس لیے بھی رہی ہے یہ زندگی
میں کم ہنر ہوں پاس مرے کچھ ہنر نہیں

دریائے وقت تیری روانی کی خیر ہو
تُو اُس طرف رواں ہے کنارہ جدھر نہیں

عظمی کچھ اس لیے بھی ہے سنسان راستہ
جو بے طلب ہوں ایسے مسافر اِدھر نہیں

اسلام عظمی

غزل

دل کو جانے ہے کیا ملا تجھ میں
چھوڑ کر مجھ کو جا بسا تجھ میں

جس نے جادو سا کر دیا دل پر
سامری ہے کوئی چھپا تجھ میں

تو ہے آباد مجھ میں صدیوں سے
میں کہ پل بھر نہ رہ سکا تجھ میں

اُس کی پھنکار سے بھی ڈرتا ہوں
ہے اَنا کا جو اژدھا تجھ میں

جو کھلا دے خزاں میں بھی غنچے
تھی بہار آفریں فضا تجھ میں

جب نہ پرواہ تھی زمانے کی
ایک ایسا جنون تھا تجھ میں

جس کی پوجا ہی تیرا مسلک ہے
کون ہے ایسا دیوتا تجھ میں

کس کا وہ عکس ہے تصور میں
جو کہ دیوار بن گیا تجھ میں

آج ویران و بے صدا ہے تو
جیسے آسیب آ گیا تجھ میں

کیا کوئی دوسرا بھی ہے جس نے
کر دیا زلزلہ بپا تجھ میں

آفریںؔ نے تو بارہا دیکھی
نورِ الفت نما حیا تجھ میں

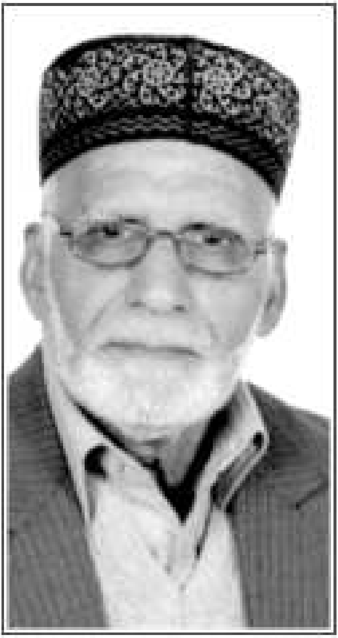

رشید آفرین

غزل

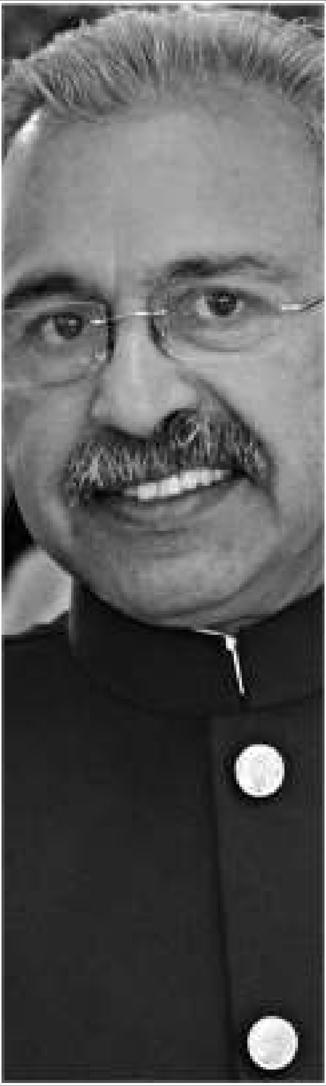

راحت سرحدی

دور از دو جہان کچھ دن سے
ہے ہماری اڑان کچھ دن سے

اس کی آنکھوں کو دیکھ کر میرا
گم گیا آسمان کچھ دن سے

جا رہا ہوں کہیں میں بے پتوار
اور بنا بادبان کچھ دن سے

خود کو محسوس کر رہا ہوں میں
ایک خالی مکان کچھ دن سے

زخم تو بھر گئے تھے لیکن اب
مٹ رہے ہیں نشان کچھ دن سے

چومتے ہیں مرے ستارے قدم
ہے زمیں آسمان کچھ دن سے

ہو گئی کھیل سے تری راحت
زندگی امتحان کچھ دن سے

غزل

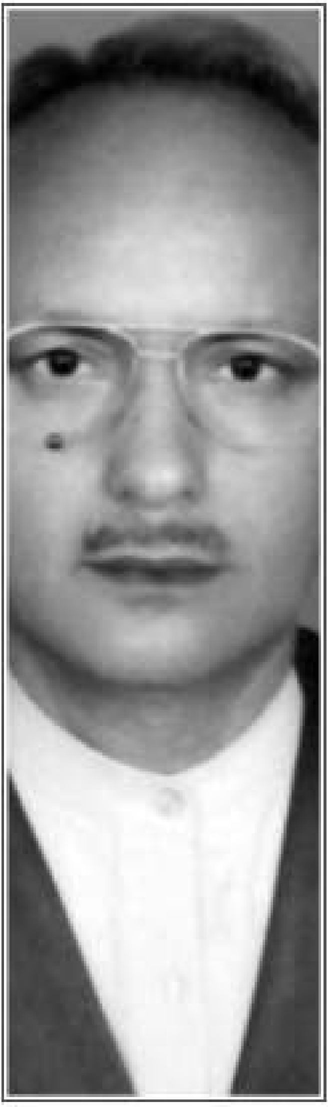

منظور ثاقب

جو ترا انتخاب کرتے ہیں
زندگانی عذاب کرتے ہیں

بعض اوقات ہم سوالوں سے
خود کو بھی لاجواب کرتے ہیں

فاختہ کے دفاع کی خاطر
ہم گرفتِ عقاب کرتے ہیں

ہم تصور بھی کر نہیں سکتے
وہ جو عالی جناب کرتے ہیں

کڑھتے رہتے ہیں بے اصولی پر
جل کے خود کو کباب کرتے ہیں

لوگ ایسے بھی ہیں جو آخرِ شب
اپنا یوم حساب کرتے ہیں

ہم لکھاری ہیں اس لیے ثاقبؔ
زندگی کو کتاب کرتے ہیں

غزلیں

حال و ماضی پر مرے خود کو نہ شرمندہ سمجھ
میری ساری شاعری کو دورِ آئندہ سمجھ
آج تیرا زہر میرے واسطے تریاق ہے
دوستا ، سقراط کا مجھ کو نمائندہ سمجھ
پیش کر دوں گا سرِ محفل مہارت کا ثبوت
تو مجھے بس بربطِ دل کا ہی سازندہ سمجھ
آگہی کے نور سے روشن مرا ہر لفظ ہے
گر سمجھ آئیں میرے شعروں کو تابندہ سمجھ
تو کفن پہنا نہیں سکتی کبھی الفاظ کو
اے اجل ہم کو کتابوں میں سدا زندہ سمجھ
زندگی میری بنی ہے نت نئے صدمات سے
میرے درد و غم کو، میرے دکھ کو پائندہ سمجھ
لے رہی ہے ہم سے ظالم کس خطا کا انتقام
اس کلیجے چیرتی نفرت کو بھی ہندہ سمجھ
راہ کی تاریکیوں میں مَیں بھٹک سکتا نہیں
کاوشِ فن کو مری سورج سا رخشندہ سمجھ
مفلسی میں بس خلوصِ دل نہیں کافی عقیلؔ
دوستوں کی بے رخی پر خود کو شرمندہ سمجھ

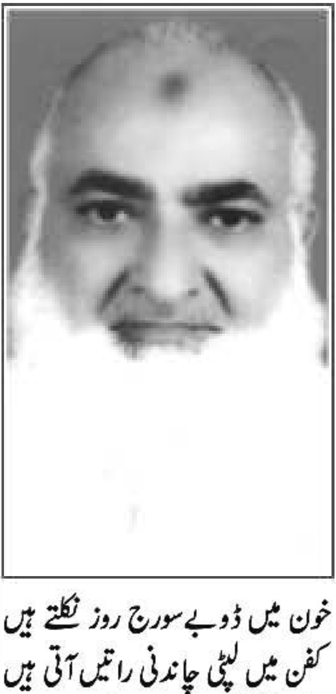

عقیل رحمانی

تیری خوشبو اوڑھ کے باتیں آتی ہیں
آگ لگانے اب برساتیں آتی ہیں
مکھن ، ساگ ، پنجیری دیسی گھی والی
گاؤں سے کیا کیا سوغاتیں آتی ہیں
اول اول صرف محبت ہوتی ہے
بعد زمینیں ، عہدے ، ذاتیں آتی ہیں
ہار کے بھی کچھ پیار کے منصب ملتے ہیں
جیت کے بھی کچھ ظالم ماتیں آتی ہیں
شہر میں بھی سندیسے ماں کے آتے ہیں
پیار میں ڈوبی کچھ صلواتیں آتی ہیں
خون میں ڈوبے سورج روز نکلتے ہیں
کفن میں لپٹی چاندنی راتیں آتی ہیں
تم بھی عقیلؔ اب اس سے کچھ محتاط رہو
تیرے دشمن کو سب گھاتیں آتی ہیں

غزلیں

افتخار شاہد

وصل کے گیت گنگناتے ہوئے
ہم تو بچھڑے تھے مسکراتے ہوئے

تیرا چہرا بنا دیا میں نے
پھول اور تتلیاں بناتے ہوئے

یہ مری عمر کا تقاضہ ہے
گر پڑا ہوں تجھے اٹھاتے ہوئے

روشنی سے کلام کرتا ہوں
میں دیے سے دیا جلاتے ہوئے

تم مجھے کل بھی ملنے آؤ گے
اس نے پوچھا تھا ہچکچاتے ہوئے

مجھ سے کہنا ترا خدا حافظ
اور ترے ہونٹ کپکپاتے ہوئے

کوئی پوچھے تو ہیر سے شاہدؔ
منہ سے بولی تھی سر ہلاتے ہوئے

مسافرانِ رہِ وفا جو رکے ہوئے ہیں
یہ رہبروں کی عنایتوں سے ڈرے ہوئے ہیں

حسابِ شام وسحر سے نکلیں تو یہ بھی سوچیں
کہاں کہاں پہ ہمارے وعدے پڑے ہوئے ہیں

تمہارے لطف و کرم میں کوئی کمی نہیں ہے
یہ لوگ اپنے مقدروں سے ڈرے ہوئے ہیں

سماعتوں کو گراں نہیں ہے غزل ہماری
کہ شعر تیرے ہی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں

کہیں پہ لب ہیں کہیں پہ عارض کہیں پہ گیسو
ہمارے بستر پہ جابجا جو دھرے ہوئے ہیں

درختِ جاں پر مہک رہے ہیں جو پھول شاہدؔ
تم آ گئے ہو تو زخم سارے کھلے ہوئے ہیں

غزل

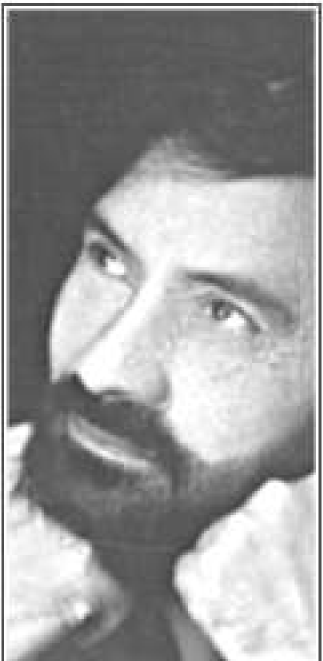

چہرہ بدلیں نہ آئینے بدلیں
اب نگاہوں کے زاویے بدلیں

پھر ملاقات ہو نہ جائے کہیں
راستے احتیاط سے بدلیں

سامنے ہوں اگر نئے منظر
ہم بھی آنکھوں کے ذائقے بدلیں

روز تصویر اک بدلنے سے
ہے یہ بہتر کہ چوکھٹے بدلیں

ہر طرف اک جمود طاری ہے
آؤ انداز سوچ کے بدلیں

آج کل معتبر وہی ہیں جلال
بھیس ہر روز جو نئے بدلیں

سید قاسم جلال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک لمحہ تھا جسے آخرِ شب تک دیکھا
رات بھر منتظر اپنا، درِ وا اپنا تھا

غزل

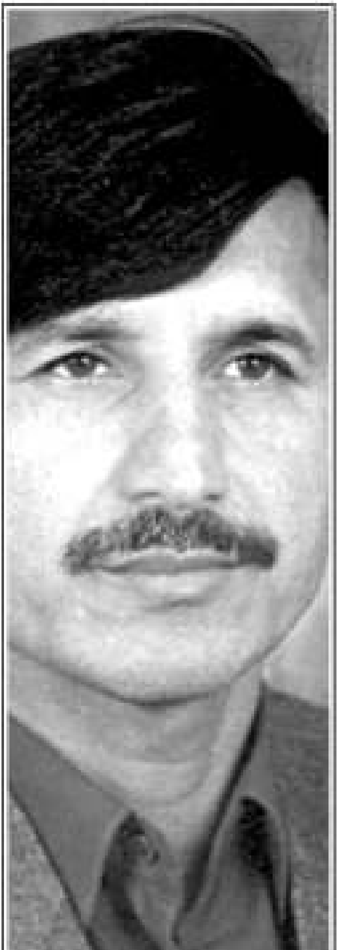

تجھ سے یاری کا جس کا یارا ہو
کیوں نہ وہ جان و دل سے پیارا ہو

اوج پر بخت پھر نظر آئے
تو اگر آسماں ہمارا ہو

لگ رہا ہے یہ دل کی دھڑکن سے
تو نے جیسے ہمیں پکارا ہو

جی یہ چاہے کہ وقت رک جائے
ساتھ جب تجھ سا بزم آرا ہو

بات ہم سے کرے محبت کی
جس نے جیون کسی پہ وارا ہو

کون جیتا ہے زندگی کے بغیر
تجھ سے دوری کیسے گوارا ہو

جان لیتے ہیں جاننے والے
روپ کوئی بھی تو نے دھارا ہو

گلزار بخاری

غزل

اپنے رنگین خوابوں کی دہلیز پر سر جھکاتے ہوئے ایک مدت ہوئی
چھب دکھائی نہ ہلکی سی تعبیر نے ، یہ بتاتے ہوئے ایک مدت ہوئی

منزلیں ڈھونڈتی ہی رہیں رہنما ، پاؤں پڑتے رہے منحنی راستے
اپنے ہاتھوں کی ریکھاؤں کا جانے کیوں منہ چڑاتے ہوئے ایک مدت ہوئی

پاس رکھتے نہ تھے جو وفا نام کی کوئی اُجلی سی شے دامنِ حُسن میں
اُن کی یادوں کے منہ زور طوفان میں ڈگمگاتے ہوئے ایک مدت ہوئی

وہ جو پہلے تھا جوبن مرے حسن و زیبائی کا ترجماں اس کو ڈھونڈوں کہاں
بس اسی فکر میں چاندنی رات کو منہ چھپاتے ہوئے ایک مدت ہوئی

اس میں کیسے سموئیں گے جذباتِ دل ، بس اسی فکر میں ہم رہے مستقل
کچھ بھی لا نہ سکے ضبطِ تحریر میں خط لکھاتے ہوئے ایک مدت ہوئی

بھول کر بھی نہ سوچا کبھی جانِ من ، سوکھ جائے گی یوں اپنی جوئے سخن
وہ جو برسوں میں تھا کوئی مصرع ہوا ، گنگناتے ہوئے ایک مدت ہوئی

ہم مسافر ہیں پرواز کس نوع کے ، سر پہ تانے ہوئے سائباں دھوپ کا
وہم و تشکیک کے تپتے صحراؤں میں گرد اڑاتے ہوئے ایک مدت ہوئی

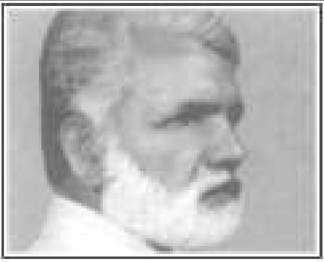

یعقوب پرواز

غزل

نہ جانے حادثہ کیسا ہوا ہے
کہ اشکوں سے یہ دل اب کھیلتا ہے

وہ اپنے گاؤں سے آیا تھا لیکن
ہجومِ شہر میں گم ہو گیا ہے

ستم ہے اُن کو کھا سکتا نہیں وہ
جو خود میٹھے پھلوں کو بیچتا ہے

مسافر گھر نہیں پہنچے ابھی تک
کہ شاید حادثہ کوئی ہوا ہے

گھروں میں قید ہے ہر شخص ہی اب
جہاں ویراں نظر آنے لگا ہے

اُسے جھوٹی انا نے مار ڈالا
وہ اب یہ سوچ کر پچھتا رہا ہے

وہ بچپن میں کھلونوں سے نہ کھیلا
مگر اب خود کھلونے بیچتا ہے

حیات ایسی غموں نے تنگ کر دی
کہ خوشیوں کو یہ دل ترسا ہوا ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے طاہرؔ
اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے

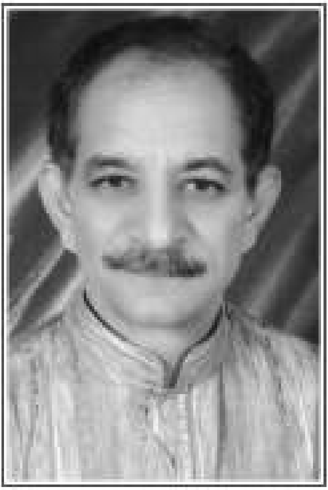

طاہر ناصر علی

غزل

میں اس لیے تجھے ملوا نہیں رہا خود سے
کہ میرا تجربہ اچھا نہیں رہا خود سے

یہ تیرے غم کی اچھل کود ہے مرے اندر
میں اپنے آپ کو تڑپا نہیں رہا خود سے

گلی گلی ہے فسادات کا سماں مجھ میں
میں اس لیے بھی نکل پا نہیں رہا خود سے

پتہ چلا ہے کہ میں تیرے انتظار میں ہوں
اس لیے تو میں اکتا نہیں رہا خود سے

جنھیں پسند ہوں میں جا کے روکیے ان کو
کسی بھی شخص کو میں بھا نہیں رہا خود سے

پڑا ہوا ہے ترا رختِ زندگی مجھ میں
میں اس لیے بھی کہیں جا نہیں رہا خود سے

کرے گا اور کوئی مجھ کو گالیاں دے کر
میں اپنے کام جو نمٹا نہیں رہا خود سے

مقابل اس کے کھڑا سانس لے رہا ہے کوئی
یہ دل کا آئینہ دھندلا نہیں رہا خود سے

میں خود سے اس لیے منوا نہیں سکا اپنی
کہ میرا کوئی بھی رشتہ نہیں رہا خود سے

کوئی دھکیل رہا ہے اس عقب سے کبیر
وہ شخص میری طرف آ نہیں رہا خود سے

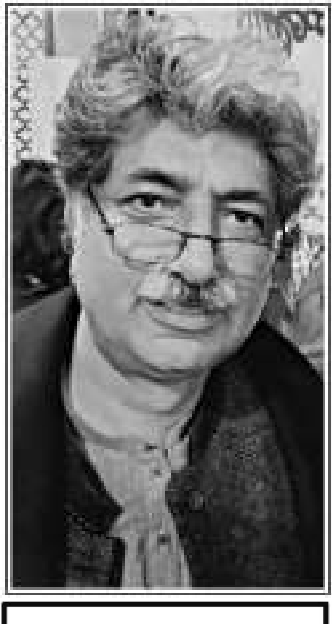

کبیر اطہر

غزل

رت جگوں سے کھیلا ہوں
تا سحر میں جاگا ہوں

اشک اشک آنکھوں میں
حرف حرف بھیگا ہوں

بار بار جڑ کے بھی
بار بار ٹوٹا ہوں

ہجر ہجر صحرا میں
ریت ریت پھیلا ہوں

مرہموں کی خواہش میں
زخم زخم تڑپا ہوں

ذرہ ذرہ پیاسا تھا
صحرا صحرا برسا ہوں

پوچھتا کوئی اقبال
کیوں اداس پھرتا ہوں

اقبال سروبہ

غزل

اپنا رتبہ یاد دلانا پڑتا ہے
اپنے آپ کو خود منوانا پڑتا ہے

پھیل تو سکتی ہے خوشبو ویرانے میں
سخت زمیں پر پھول اُگانا پڑتا ہے

صحرا بھی آباد کیے جا سکتے ہیں
اول دل کا شہر بسانا پڑتا ہے

جس رستے سے واقف ہونا چاہے دل
اُس رستے پر آنا جانا پڑتا ہے

اگلی رُتیں خود استقبال کو آتی ہیں
پچھلی رُتوں سے ہاتھ چھڑانا پڑتا ہے

کچھ تو بن بولے بھی دُکھ پہچانتے ہیں
کچھ کو دل کا حال بتانا پڑتا ہے

اچھے وقتوں کی اُمید میں اکثر تو
اچھا خاصا وقت گنوانا پڑتا ہے

روز نئی دیواریں راہ میں آتی ہیں
دیواروں کو روز گرانا پڑتا ہے

بھاری پتھر کو سرکانے کی خاطر
اپنا سارا زور لگانا پڑتا ہے

جھوٹ ہے دلکش لیکن کیا کیجیے افشاں
سچ کے پیچھے دل دیوانہ پڑتا ہے

افشاں سجاد

غزل

افروز رضوی

تیری میری اُڑان دیکھے گی
جب زمیں آسمان دیکھے گی

تیری موجِ تباہ کُن میری
قوتِ بادبان دیکھے گی

آنکھ اُٹھا کر زمین بھی اک دن
بارشِ آسمان دیکھے گی

تیری راہِ طلب میں بن کے غبار
خاک اپنی اُڑان دیکھے گی

تیری نبضِ بدن بھی جانِ بدن
میرا دل ، میری جان دیکھے گی

وحشتِ دل فراق میں تیرے
کمرۂ امتحان دیکھے گی

جب اُٹھے گی گھٹا مدینے سے
دھوپ پھر سائبان دیکھے گی

غزل

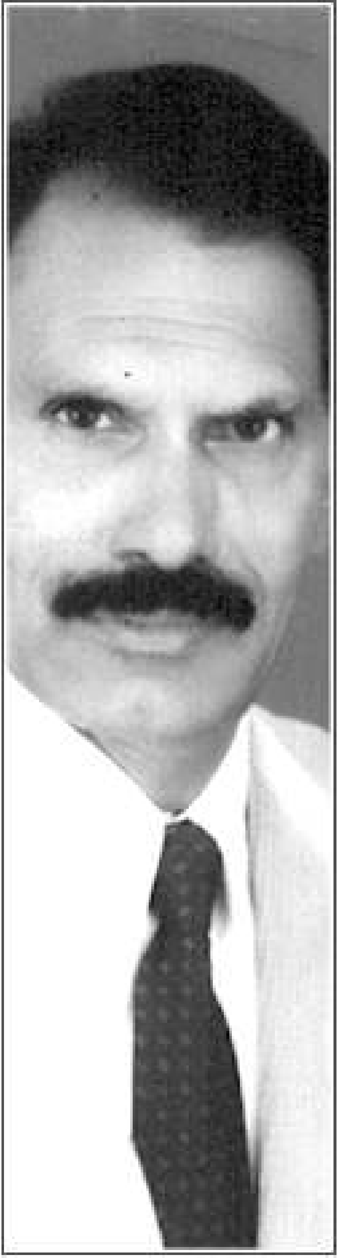

ساحلوں ہی کے ڈر میں رکھے ہیں
جو سفینے بھنور میں رکھے ہیں

جب بھی گزرو ادھر سے لے لینا
پھول کچھ رہگزر میں رکھے ہیں

خوشبوؤں کو کہاں بکھرنا ہے
سارے امکاں نظر میں رکھے ہیں

کیا ملے گا تمھیں اندھیروں سے
سب اُجالے سحر میں رکھے ہیں

اس جبیں کو بھٹکنے دیتے نہیں
سجدے سب تیرے در میں رکھے ہیں

ولولے دل میں موجزن ہیں جلیلؔ
حوصلے بال و پر میں رکھے ہیں

احمد جلیل

غزل

آسناتھ کنول

اس بُت کے انداز بناتی رہتی ہوں
لفظوں سے آواز بناتی رہتی ہوں

اپنے حصے کے سورج کی چاہت میں
کاغذ پر پرواز بناتی رہتی ہوں

چہرے بانٹتی رہتی ہوں پیمانوں میں
کوزہ گر کا راز بناتی رہتی ہوں

ایک کہانی جس کا کوئی انجام نہیں
اب اس کا آغاز بناتی رہتی ہوں

شاید اس کے دل پر دستک دے آئے
خوشبو کو ہمراز بناتی رہتی ہوں

جانتی کیسے اُس کا ساتھ نہیں ملنا
یادوں کو دم ساز بناتی رہتی ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چڑیاں اڑ اڑ کر رہ جائیں
بابل کا گھر بُھول نہ پائیں

غزل

ترے جیسا کوئی ستم گر نہ دیکھا
ترے ہاتھ میں، مَیں نے خنجر نہ دیکھا

یہی تھی خطا تجھ کو باہر سے جانچا
ہے افسوس یہ تیرا اندر نہ دیکھا

مِری آنکھ نے دوستو اِس سے پہلے
حزیں اِس قدر کوئی منظر نہ دیکھا

دھڑکتا ہوا کوئی دِل سمجھا تھا میں
ترے سینے میں مَیں نے پتھر نہ دیکھا

ترے جیسا فاروقؔ نے زندگی بھر
مقدر کا کوئی سکندر نہ دیکھا

زبیر فاروق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سکڑ سمٹ کے گزاری ہے زندگی خالد
ہتھیلیوں کی لکیروں کے درمیان کہیں

غزل

ابوطالب انیم

ویران ہوا جاتا ہے بنجر کی طرح وہ
باہر سے بھی ہونے لگا اندر کی طرح وہ

ہر بار ٹھہر جاتیں ہیں اس پر مری نظریں
ہر بار بدل جاتا ہے منظر کی طرح وہ

ٹوٹے ہیں کبھی ہم تو کبھی توڑ گئے ہیں
شیشے کی طرح میں ہوں نہ پتھر کی طرح وہ

اب صرف سسکتے ہوئے تارے ہیں شفق ہے
گزرا ہے مری رات سے لشکر کی طرح وہ

خاموش تہِ حرف تھا جو درد کی صورت
الفاظ میں چیخا ہے سمندر کی طرح وہ

میں بھی ہوں انیمؔ اس کے دریچے کی طرح گنگ
خاموش ہے صدیوں سے مرے در کی طرح وہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سبھی آنکھیں ہیں ، ہماری آنکھیں
گھل کے بہہ جائیں نہ ساری آنکھیں

غزل

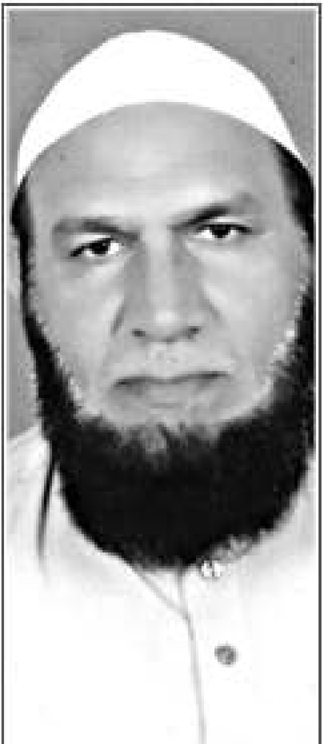

بہت سے مارے گئے ہیں سفر ضروری ہے
پرندے سوچ رہے ہیں سفر ضروری ہے

یہاں تو تیر و تبر ہی کی بات چلتی ہے
زباں پہ نیزے گڑے ہیں سفر ضروری ہے

شعور و آگہی کی روشنی ہے ممنوعہ
چراغ اوندھے پڑے ہیں سفر ضروری ہے

بگولے باندھ کے رکھے ہوئے ہیں پاؤں میں
یہ رستے غم سے اَٹے ہیں سفر ضروی ہے

زباں پہ خار اُگے ہیں تو پاؤں میں چھالے
مگر چلے تھے چلے ہیں سفر ضروری ہے

رضاؔ مذاق اڑایا گیا مگر اب کے
سبھی یہ جان چکے ہیں سفر ضروری ہے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

جو ایک بار بھی مجھ سے کبھی ملا نہیں تھا
سوائے اس کے مرا کوئی آشنا نہیں تھا

میں جی رہا تھا حیات و ممات کے مابین
فریبِ خواہشِ دنیا میں مبتلا نہیں تھا

میں جانتا ہوں پرستش نہیں ہوئی اُس کی
اگرچہ عشق تھا لیکن مرا خدا نہیں تھا

سکوت توڑ کے رختِ سفر اُٹھا کے چلا
بیانِ مرگ مطالب سے ماورا نہیں تھا

ستم شعار نے دامن بھی تار تار کیا
ابھی تو چاک گریبان کا سِلا نہیں تھا

بس ایک در پہ گزاری گئی حیات کہ اب
پھر ایک بار بچھڑنے کا حوصلہ نہیں تھا

یہ کیا ہوا ہے تجھے عابدؔی بتا تو سہی
تُو اِس قدر تو کبھی مشتعل رہا نہیں تھا

علی حسین عابدی

غزل

مجھے کب خبر ہے مجھے کیا خبر ہے
بلا سے اگر ہے مجھے کیا خبر ہے

مجھے ہوش کب ہے جو پڑتا ہے پاؤں
اگر میرے سر ہے مجھے کیا خبر ہے

بھلے آپ لایا ہے پیغام اپنا
بھلے نامہ بر ہے مجھے کیا خبر ہے

یہ ٹھہری ہوئی داستانِ دو حرفی
اگر مختصر ہے مجھے کیا خبر ہے

اُٹھاتا نہیں کوئی مجھ کو یہاں سے
یہ جس کا بھی در ہے مجھے کیا خبر ہے

میں کس کس کی تم کو خبر دے سکوں گا
میاں رہ گزر ہے مجھے کیا خبر ہے

بس اِک چشمِ وا ہے بس اِک خوابِ یکتا
یہ شب ہے سحر ہے مجھے کیا خبر ہے

حسنین سحر

غزل

اپنے لب پر درد کا اک سلسلہ ٹھہرا ہوا
لوحِ جاں پر حرفِ غم پھر بھی لکھا ٹھہرا ہوا

روشنی کے رنگ وابستہ ہیں اُس کی ذات سے
اور ہماری ذات میں ہے اک خلا ٹھہرا ہوا

جو بھی اچھے خواب تھے، وہ سب تمہارے نام تھے
اب ہماری آنکھ میں ہے رتجگا ٹھہرا ہوا

اس نے دیکھا اک نظر اور پھیر لی اپنی نظر
تب سے میرے چہرے پر ہے رنگ سا ٹھہرا ہوا

کب سے ہوں میں موسمِ خوش رنگ کی امیدوار
کب سے ہونٹوں پر ہے اک حرفِ دعا ٹھہرا ہوا

عمر سے مجھ سے ثمینہ نیند ہے روٹھی ہوئی
عمر سے آنکھوں میں ہے اک رتجگا ٹھہرا ہوا

ثمینہ سید

ابھی تک آنکھ نَم ہے ، دل لہو ہے
مجھے کافی مرا پہلا وضو ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

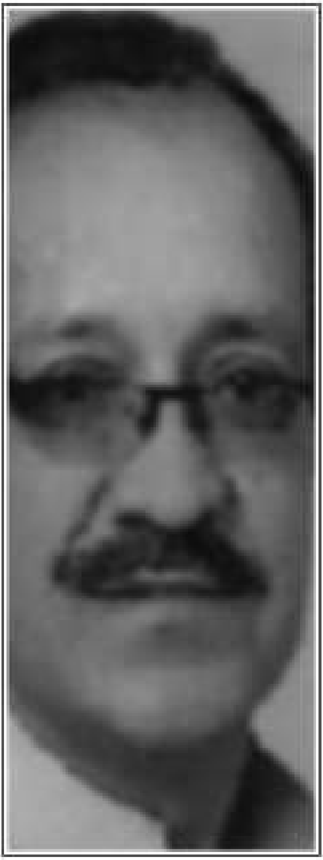

میری آنکھیں ہیں خواب ہے تم ہو
جلتا صحرا ہے آب ہے تم ہو

میں کہیں ڈھونڈتا نہ رہ جاؤں
دور تک اک سراب ہے تم ہو

زیست کی رہ گزر میں زادِ سفر
تتلیاں ہیں گلاب ہے تم ہو

میں اکیلا نہیں سرِ ساحل
ڈوبتا آفتاب ہے تم ہو

دیکھیں کس میں ہے سب سے تیز نشہ
شاعری ہے شراب ہے تم ہو

زیست ہے میرے ساتھ رقص کناں
یہ غزل ہے رباب ہے تم ہو

کتنا دلکش سماں ہے یہ انجم
رات ہے ماہتاب ہے تم ہو

انجم جاوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہجر نے ہم کو لازوال کیا
نفع دیتے ہیں کچھ خسارے بھی

غزلیں

صغیر احمد صغیر

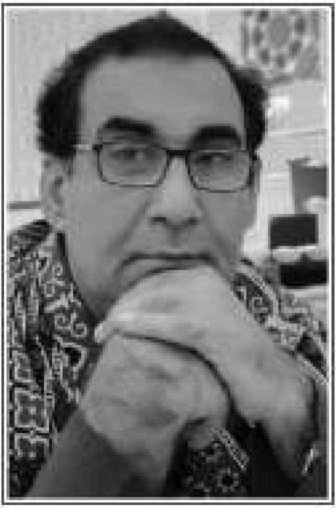

سوال یوں ہی برائے سوال مت پوچھیں
جو ہجر سے نہیں گزرے وہ حال مت پوچھیں

ہمارا عشق فقط ہم ہی جانتے ہیں میاں
ہمارے عشق کی کوئی مثال مت پوچھیں

میں اس کا عکس تصور میں لا نہیں سکتا
بس اس کی باتیں سنیں خد و خال مت پوچھیں

جو پھول بھا گیا تتلی اسی پہ بیٹھ گئی
وہ ایسی کیوں ہے یہ اس سے سوال مت پوچھیں

جو پارسا تھے اسے دیکھتے ہی رند ہوئے
صغیؔر کیسے ہوئے تھے نڈھال مت پوچھیں

کسی کے تلخ لہجے سے میں رنجیدہ نہیں ہوتا
مَیں غم دل پر نہیں لیتا سو نم دیدہ نہیں ہوتا

یہ مَیں ہی تھا کہ پتھر کو بدل ڈالا ہے ہیرے میں
وہ کیا ہوتا؟ اگر میرا تراشیدہ نہیں ہوتا

ہے دل میں وہ طلسمِ رنگِ رخسار و لبِ جاناں
کوئی بھی پھول دیکھوں تو مَیں گرویدہ نہیں ہوتا

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے اسی نے ہی نہیں سمجھا
ہمارا شعر اتنا بھی تو پیچیدہ نہیں ہوتا

مری سنجیدگی، سنجیدگی سمجھی نہیں اس نے
ہو کوئی مسئلہ اب کے مَیں سنجیدہ نہیں ہوتا

عجب پتھر ہے جس کی تازگی ویسی کی ویسی ہے
اسے ہم چومتے رہتے ہیں بوسیدہ نہیں ہوتا

مجھ ایسے سَر پھرے کا سر جھکانا سامنے اس کے!!!
صغیؔر اے کاش وہ میرا پسندیدہ نہیں ہوتا

غزل

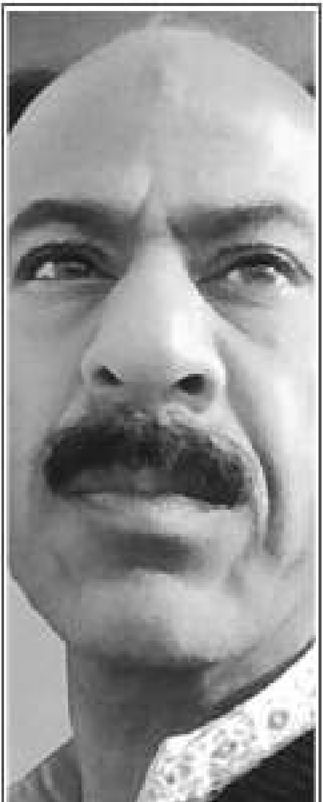

نبیل قیصر

پہلے الفاظ تولتا ہو گا
پھر وہ لب اپنے کھولتا ہو گا

ہچکیاں آج بھی بتاتی ہیں
یاد اُس نے بہت کیا ہو گا

وہ تری راہ دیکھنے والا
آج بھی راہ دیکھتا ہو گا

سوچتا ہوں کہ وہ بھی میری طرح
اپنے بارے میں سوچتا ہو گا

سر سے بہنوں کے چادریں اتریں
کوئی غیرت سے مر گیا ہو گا

کام تیرے نبیلؔ آئے گا
اپنے ہاتھوں سے جو دیا ہو گا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزل

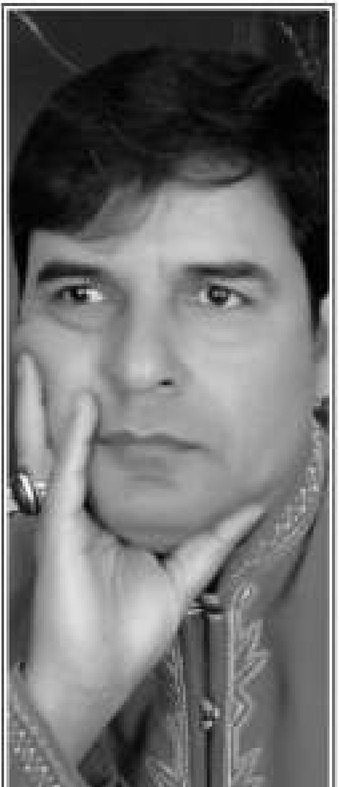

ذکر و اذکار کا جب عشق میں یُوں وِرد کیا
ہاں دل و جان سے تب عشق میں یُوں وِرد کیا

مسکرانے کے کئی پہلو نظر آئے مجھے
خیر کا ایک سبب، عشق میں یُوں وِرد کیا

مُستحب سانس ہُوا، جُونہی ہُوا عشق قبول
بھُول کر نام و نسب، عشق میں یُوں وِرد کیا

مجھ میں اُترا ہے فلک، نُور کے گالے بن کر
میرے ہمراہ ہے رب، عشق میں یُوں وِرد کیا

وِرد میں عشق ہُوا، عشق میں پھر وِرد کروں
ہے بپا جشنِ طرب، عشق میں یُوں ورد کیا

شہرِ ایقان ہُوا آباد ترے دم کے طفیل
بن گیا یہ بھی سبب، عشق میں یُوں وِرد کیا

آئینہ خانہ مِرے من میں اُتر آیا انیس
ٹل گیا غیظ و غضب عشق میں یُوں ورد کیا

انیس احمد

غزل

کسی کے چند، کسی کے مزید ہوتے ہیں
ہر ایک پِیر کے اپنے مرید ہوتے ہیں

طلسمِ حُسن کا در صرف اُن پہ کھلتا ہے
جو لوگ اُس کی طرف محوِ دید ہوتے ہیں

وصالِ رُت کا اچانک سبب نہیں بنتا
بہت دنوں میں یہ لمحے کشید ہوتے ہیں

امیرِ وقت ذرا سوچ کر لگا قیمت
تمام فرد کہاں زرخرید ہوتے ہیں

خلوص و عشق کے موتی بکھیر دو ہر سُو
یہ اہلِ دل کے لیے بھی مفید ہوتے ہیں

ہمارے چاک گریباں پہ ہنس رہے ہو مگر
یہی تو کُہنہ لبادے جدید ہوتے ہیں

نہ اِن کو چھو کے طہارت لگاؤ داؤ پر
کہیں بھی رہتے ہوں، کتّے پلید ہوتے ہیں

جنھیں غرور بہت ہو زر و جواہر پر
وہی تو لوگ جہنم رسید ہوتے ہیں

کسی اصول سے جو برتری کریں ثابت
وہ اپنے عہد کے سرمد، ولید ہوتے ہیں

ہو جن کا ربط کسی حسنِ دل نواز کے ساتھ
وہ شہرِ عشق کے در کی کلید ہوتے ہیں

کسی کا ہجرِ مسلسل اگر میسر ہو
تو آفتابؔ کے جذبے شدید ہوتے ہیں

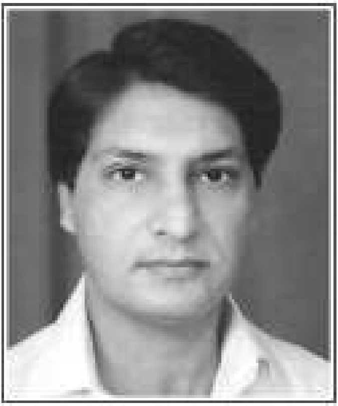

آفتاب خان

غزل

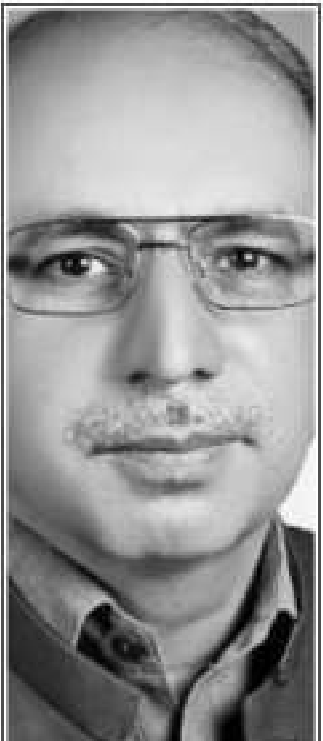

گلی میں نور فضا میں مہک مدینے کی
عجب ہے شوکت و عزت فلک! مدینے کی

سبیلِ شوق کی موجوں سے آنکھ بھرنے لگی
شفق کٹورے میں جاگی للک مدینے کی

نصیب ہو گی یقیناً وفا شعاروں کو
میں دل میں بھر کے چلا ہوں کمک مدینے کی

نظر کو گرد و غبارِ زمانہ اب نہ گھٹا
جگر سے کھیل رہی ہے کسک مدینے کی

رکھ آرزو کی بھی اک بار آبرو مولا!
بس ایک بار عطا ہو جھلک مدینے کی

سمجھ لو ہو گئی جنت نصیب عادؔل کو
وہ جس کو چھو گئی بادِ خنک مدینے کی

عزیز عادل

انتخاب

خالد احمد

اے مہِ شہرِ تمنا! دل ویراں میں دمک
دیکھ ہم چشم کشا مثلِ بیاباں کیوں ہیں؟

نعمان منظور

غزل

رفعت وحید

میں نے جب خود کو پکارا ہے تو جھٹ آئی ہوں میں
وسطِ دریا میں ہی کشتی کو الٹ آئی ہوں میں

ایک لمحہ تھا کہ میں ہی میں تھی سب اطراف میں
اور وہی لمحہ ہے کہ خود میں سمٹ آئی ہوں میں

اور دے کچھ مجھ کو پڑھنے کے لئے کہ میری ذات
ایک چھوٹا سا صحیفہ تھی جو رٹ آئی ہوں میں

میں نے رکھا تھا حدود وقت سے آگے قدم
نقطۂ آغاز کی جانب پلٹ آئی ہوں میں

وصل ہو جاتا تو خواہش قتل ہو جاتی مری
اس لئے رفعت ترے در سے پلٹ آئی ہوں میں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بتوں کی طرح کھڑے تھے ہم اک دوارہے پر
رخ اس نے پھیر لیا، چشم تر گئے ہم بھی

غزل

سید فرخ رضا

گفتگو خوف ہے ہر ادا خوف ہے
سب کے آنگن میں نازل ہوا خوف ہے

ڈر کے مارے نہ کھولے کوئی لب یہاں
سب کے چہروں پہ یاں اب سجا خوف ہے

رقص وحشت ہے ہر کوچہ ء و شہر میں
سب کے لب پر صدا یہ وبا خوف ہے

کوئی ملتا نہیں ، پاس آتا نہیں
سب کے ذہنوں پہ طاری ہوا خوف ہے

جانے کس موڑ پر چھوڑ جائے گا وہ
دل میں میرے عجب اک بسا خوف ہے

سہمے سہمے ہیں ، گنگ بیٹھے ہیں سب
بات کس سے کریں جا بجا خوف ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر کن گیسوؤں کے طاق میں جلتا رہا؟
اے چراغِ گل بتا ! تیرا شبستان کیا ہوا؟

غزلیں

بات کہ کر مکرنے والا نہیں
میں کبھی دھوکا کرنے والا نہیں

میں تعلق نبھانا جانتا ہوں
خالی کاغذ ہی بھرنے والا نہیں

یاد آتا نہیں زیادہ مگر
دھیان سے بھی اُترنے والا نہیں

دیکھنا پھر سُلگ رہوں گا کہیں
راکھ ہو کر بکھرنے والا نہیں

بات حدِّ ادب کی ہے ورنہ
سر جھکا کر گزرنے والا نہیں

میں نئی صبح تک غروب ہوا
مت سمجھ پھر اُبھرنے والا نہیں

کرتا رہتا ہوں تجربات امر
میں نتائج سے ڈرنے والا نہیں

امر مہکی

کام اِک بھی قرینے والا نہیں
ڈھنگ ہی مجھ میں جینے والا نہیں

جانے کتنے برس اُداس رہوں
سوگ ہفتے مہینے والا نہیں

ایسے کنکر تری گلی سے مِلے
کوئی مجھ سا خزینے والا نہیں

میں کہ صحرا کا میٹھا چشمہ ہوں
اور کوئی پانی پینے والا نہیں

پار اُترنا ہے تیر کر ہی مجھے
کہ سمندر سفینے والا نہیں

تھوڑی تلخی سی ہے زباں میں امر
دل حسد اور کینے والا نہیں

غزل

بہکی بہکی باتیں کرتے وہ ہیں
جانے کس دنیا میں رہتے وہ ہیں

رکھتے ہیں وہ میری خبریں ساری
حالانکہ کم کم ہی ملتے وہ ہیں

میری خبریں لیتے ہیں وہ سب سے
مجھ کو میری خبریں دیتے وہ ہیں

خوش ہیں وہ سب کی خدمت ہیں کرتے
تارے دامن بھر کے لاتے وہ ہیں

آتے ہیں وہ لڑنے ہر شب احمد
مضطر دنیا کی خاطر رہتے وہ ہیں

علی رضا احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر کن گیسوؤں کے طاق میں جلتا رہا؟
اے چراغِ گل بتا ! تیرا شبستان کیا ہوا؟

غزل

کسی احساس کی نرمی مری پلکوں کو نم کر دے
کوئی تو بات ایسی ہو جو اس تلخی کو کم کر دے

محبت کی ہتھیلی میں یہ دل جانے سے پہلے ہی
کوئی تعویذ دھاگہ کر کوئی تو اسم دم کر دے

اگر اخلاص کو مشکوک کر دینے کی کوشش ہو
تو پھر ردعمل دکھلا کوئی تردید جم کر دے

اٹھا کر پھینک دے ناسور سے رِستے ہوئے جذبے
نیا نازک سا سپنا بُن اسے دل کو بہم کر دے

ہمیں معلوم ہے رفتار تیری زندگانی کی
اگر ہاں ہم سے ملنا ہو تو تھوڑا وقت تھم کر دے

خود اپنا دیوتا بننے میں آخر کیا قباحت ہے
غلط کچھ ہو گیا ہے گر، نیا اپنا جنم کر دے

عجب تاریک رستے ہیں عجب بے نام منزل ہے
مرے مالک مرے لوگوں پہ تو پھر سے کرم کر دے

تلاطم خیزیاں جب حد سے بڑھ کر حوصلہ توڑیں
تو پھر ہموار اپنی زندگی کا زیر و بم کر دے

صائمہ اسحاق

غزلیں

ڈھونڈیں جو اجالے تو حوالوں میں چھپے ہیں
کیا کیا نہ فسوں تیرے خیالوں میں چھپے ہیں

اک نقشِ کفِ پا ہی پتہ دیتا نہیں ہے
کچھ رنگِ سفر پاوں کے چھالوں میں چھپے ہیں

داماں کو بچا رکھ کہ اسی راہ گزر میں
کچھ فتنے من وتو کے سوالوں میں چھپے ہیں

جو ڈھونڈنا ہے ڈھونڈ ہمیں دشتِ سخن میں
ہم لوگ محبت کی مثالوں میں چھپے ہیں

کب کس کو کہاں گردشیں رکھ دیں گی بدل کر
یہ بھید بھی افلاک کی چالوں میں چھپے ہیں

مت پوچھئے کیا گزری دلِ سادہ نفس پر
احوال عجب سوختہ حالوں میں چھپے ہیں

حمزہ ہاشمی سوز

کس ڈھب سے عجب شوق کے پہلو نظر آئے
جس سمت بھی دیکھوں وہی گل رو نظر آئے

یہ کیسے طلسمات بہاروں میں چھپے ہیں
رستوں میں کبھی پھول، کبھی تو نظر آئے

گو خدشہ تجھے لاکھ جدائی کی گھڑی کا
مجھ کو تو ملاقات، لبِ جو نظر آئے

ہر موج معطر ہے گلستاں کی مہک سے
ہر موج لیے سانس میں خوشبو نظر آئے

کیا بات تھی، کیا رمز کھلی، بزمِ طرب میں
آنکھوں سے بہے اشک بھی جگنو نظر آئے

اک اس کے تصور سے چراغاں ہے سخن بھی
غزلوں میں جمال اس کا بہر سو نظر آئے

غزل

چھن گیا ہے وہ بھی ، دل ڈوبا تو اندازہ ہوا
جب سفر میں رات نے گھیرا تو اندازہ ہوا

تیز دریا کا بہاؤ بند سے رکتا نہیں
آنکھ سے سیلِ رواں نکلا تو اندازہ ہوا

جستجو ویران گلیوں میں بھٹک کر رہ گئی
میرے خوابوں کا نگر اجڑا تو اندازہ ہوا

وہ گیا تو زندگی کے پیڑ پر چھائی خزاں
پڑ گیا چہرہ مرا پیلا تو اندازہ ہوا

آج برسوں بعد بھی تم ہو بہو ویسی ہی ہو
رات میں نے خواب میں دیکھا تو اندازہ ہوا

چوٹ کیا ہے، درد کیا ہے اور تنہائی ہے کیا
شاخ سے اک پھول جب توڑا تو اندازہ ہوا

روح بھی بھرتی ہے کیسے جسم سے اپنی اڑان
اک کبوتر ہاتھ سے چھوڑا تو اندازہ ہوا

آنکھ، چہرہ ،ہاتھ کیا، صورت ہی کوئی اور تھی
آئینہ جبرانؔ جب دیکھا تو اندازہ ہوا

وسیم جبران

غزلیں

دل ہی جب سامنے ہر وقت پڑا ہوتا ہے
پھر کہاں غم کا کوئی تیر خطا ہوتا ہے

اس لئے کی یہاں ہر شخص کی آواز حنوط
کہ رہے سامنے جو جس نے کہا ہوتا ہے

سب ثمر کو ہی یہاں صرف ثمر بولتے ہیں
ورنہ ہر شاخ پہ سایہ تو لگا ہوتا ہے

درد جتنے ہیں اٹھا لاؤ، کہ دیکھوں تو ذرا
ضبط میرا بھلا کس کس سے بڑا ہوتا ہے

گھر میں آسیب تو غم دل میں چلے آتے ہیں
سو جو خالی نظر آتا ہے بھرا ہوتا ہے

ہجر میں اور بھی کچھ عزمؔی نکھرتا ہے سخن
یہ عجب پیڑ ہے پت جھڑ میں ہرا ہوتا ہے

عزم الحسنین عزمی

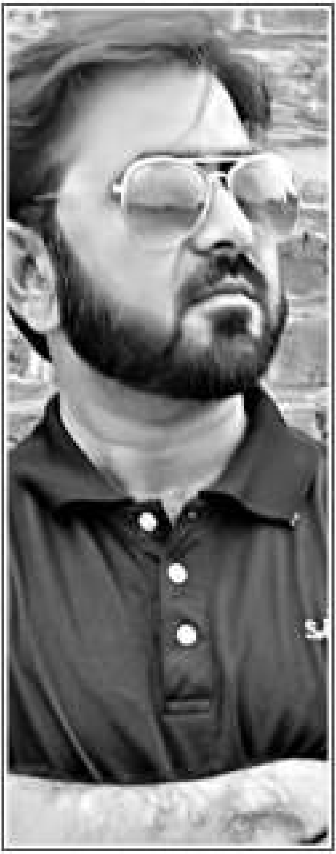

تجسس لاکھ ہو سب کو مگر ایسا نہیں ہوتا
میں ہر اک شخص پر تو اب عزیز و وا نہیں ہوتا

میں نکلا تیر واپس کھینچنے کا ڈھونڈ لایا گر
کہاں ہیں جو سمجھتے تھے کوئی نسخہ نہیں ہوتا

کبھی خاکی بدن لے کر وہاں بھی جا نکلتا ہوں
تخیل بھی کبھی پہلے جہاں پہنچا نہیں ہوتا

مجھے اب آئنے سے اور کیا اس کے سوا مطلب
کہ سارے چھوڑ بھی جائیں تو میں تنہا نہیں ہوتا

سبھی کیوں اک طرح عزمؔی یہاں کرتے ہیں خود سوزی؟
محبت کے علاوہ کیا کوئی رستہ نہیں ہوتا

غزل

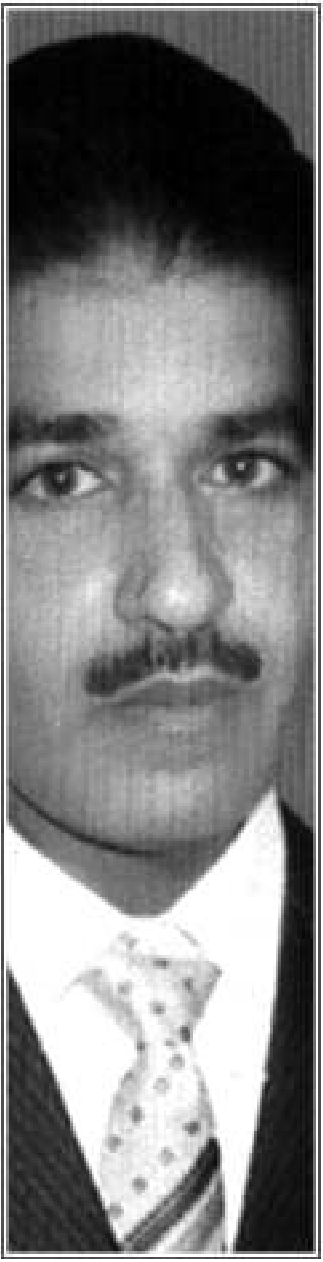

ہجوم آرزو سے جیت پائے ہیں نہ ہارے ہیں
یونہی بیم و رجا میں ہم نے روز و شب گزارے ہیں

کہیں فصلِ تمنا ہے کہیں اُمید کے مدفن
حدودِ زندگی میں مختلف کتنے نظارے ہیں

بہت محتاط ہو کر چل رہے ہو تم مرے ہمراہ
یہ اظہارِ محبت ہے کہ نفرت کے اشارے ہیں

تخلص کے سوا تم کو نظر میں آ سکوں کیسے
بیاضِ عشق میں جب تذکرے سارے تمھارے ہیں

نہ جانے کیوں سزا کا مستحق ٹھہرا ہوں محشر میں
سزا کے طور پر جب اس زمیں پر دن گزارے ہیں

تلاشِ ہم سفر پھر کیوں نہ ہو آدم کو صحرا میں
خمیرِ جسم میں شامل، جو الفت کے شرارے ہیں

کھڑا ہوں میں شبِ دیجور کی پُر ہول گھاٹی میں
مرے چاروں طرف بے سمت اندیشوں کے دھارے ہیں

اچھائی کا صلہ بھی یوں ہی ملتا ہے یہاں فرحانؔ
کہیں پتھر برستے ہیں کہیں پر چلتے آرے ہیں

سرور فرحان

غزل

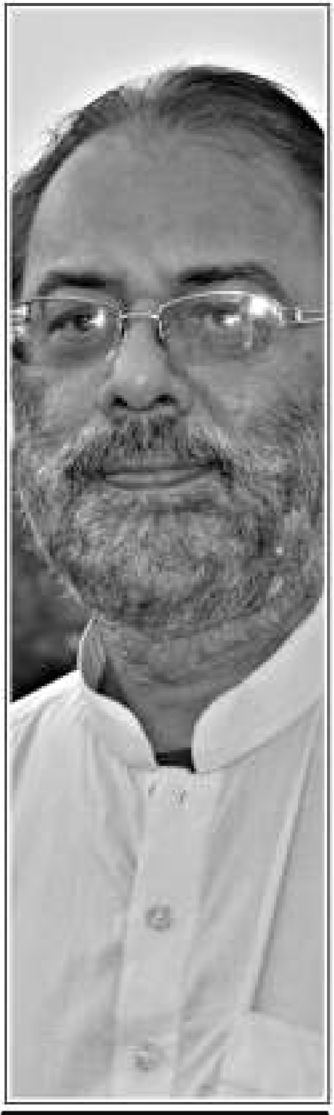

کچھ نہ مانگوں گا جو اس بات کو پورا کر دے
جو نہیں میرا الٰہی اُسے میرا کر دے!

سوچتا ہوں کہ اگر تو کبھی ایسا کر دے
کل جو بچھڑے تھے اُنہیں آج اکٹھا کر دے

یا ملا مجھ سے کوئی میرے ہی جیسا تنہا
یا مرے دل کو بھی اوروں کے ہی جیسا کر دے

عقل کہتی ہے کہ انسان کی پوجا نہ کرو!
دل مگر پھر بھی بضد ہے اسے سجدہ کر دے

میری خوشیوں کو بھی تو اس کے حوالے کر دے
اس کے حصے کے سبھی غم مرا حصہ کر دے

پھر لٹا دوں گا میں تجھ پر ہی یہ جیون اپنا
بعد مرنے کے خدا مجھ کو جو زندہ کر دے

میں سجادوں گا ستاروں سے یہ دھرتی ماجدؔ
وہ جو اک بار ہی آنے کا اشارہ کر دے

ماجد یزدانی

غزل

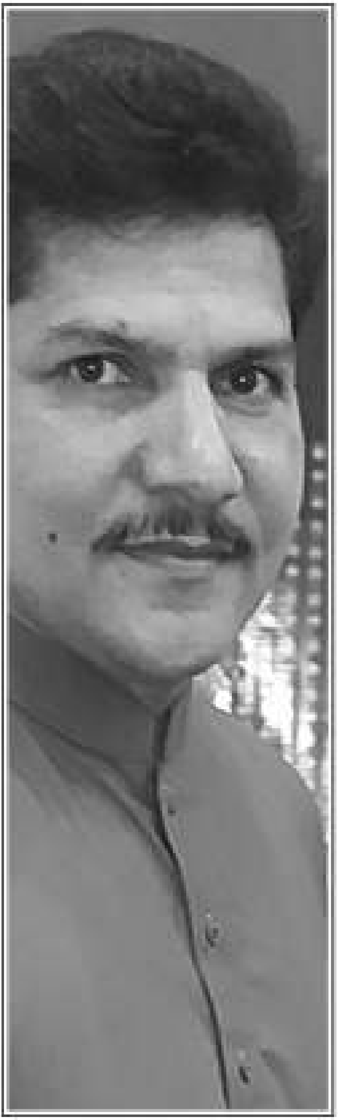

لفظِ واعظ کے جو فتوے کی سند ہے رد ہے
اس میں ہر زیر زبر پیش کہ شد ہے رد ہے

تیرے لہجے کا تکبر ہو گوارا کیسے
نامور ہے تُو کہ چاہے ترا قد ہے رد ہے

اس فسانے میں حقیقت کا گماں تک بھی نہیں
یار اس طرزِ تخیل کی جو حد ہے رد ہے

میں کسی کی بھی وکالت نہیں کرنے آیا
میرے احباب میں کوئی بھی جو بد ہے رد ہے

کونسی چیز ہے خالص مجھے اتنا تو بتا
"جس طرف سے بھی ملاوٹ کی رسد ہے رد ہے"

تشنگی جسم کے صحرا کی مٹاتا بھی نہیں
تیرے دریاؤں کے پانی میں جو مد ہے رد ہے

میں نے ہر ایک سے تجھ کو ہی مقدم سمجھا
دلِ ارشدؔ میں اگر تیرا حسد ہے رد ہے

ارشد محمود ارشد

غزلیں

قرار ملتا نہیں پیار ایسا جھنجھٹ ہے
بغیر اس کے بھی دل کا جہان تلپٹ ہے

بلا سبب تو نہیں بھاؤ میں گراوٹ ہے
بہت کہا تھا کہ اس مال میں ملاوٹ ہے

گلاب کرتے ہیں سرگوشی ایک دوسرے سے
لبِ گداز پہ پھیکی سی مسکراہٹ ہے

کہیں بھٹکتا نہیں ہے مسافروں کا خیال
ترا وجود تو صحرا میں جیسے پنگھٹ ہے

یہی شکن کا سبب ہے کشادہ ماتھے پر
نئے لباس پہ جو تازہ تازہ سلوٹ ہے

کسی کے ہجر کے آزار کا مداوا ہے
مرے مزاج میں جو اس قدر گھلاوٹ ہے

جھٹک کے آستیں آگے بڑھا تو ہوں جاذبؔ
اندھیری رات ہے پتوں میں سرسراہٹ ہے

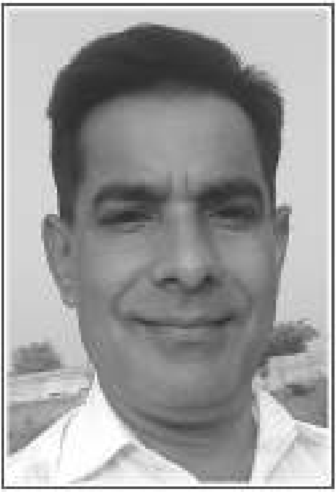

اکرم جاذب

اُن کو آزمانے میں دیر کتنی لگتی ہے
حسرتیں بڑھانے میں دیر کتنی لگتی ہے

مدتوں میں جلتی ہیں اعتبار کی شمعیں
اور انہیں بجھانے میں دیر کتنی لگتی ہے

آشیاں بنانے میں عمریں بیت جاتی ہیں
گھونسلے جلانے میں دیر کتنی لگتی ہے

آئنے دلوں کے ہوں زد پہ جب زمانے کی
ان کے ٹوٹ جانے میں دیر کتنی لگتی ہے

ایک عمر میں جاذبؔ زخم جا کے بھرتے ہیں
دل پہ چوٹ کھانے میں دیر کتنی لگتی ہے

غزل

قسمت نے چھوڑا ساتھ تو وہ بھی بدل گیا
گزرے ہیں حادثات تو وہ بھی بدل گیا

سب ساتھ تھے تو سائے کے جیسا تھا میرے ساتھ
آئی غموں کی رات تو وہ بھی بدل گیا

آتا تھا پیار جس کو مری بات بات پہ
بگڑی جو میری بات تو وہ بھی بدل گیا

تابندہ کہکشائیں تھیں میرے وجود میں
بدلی یہ کائنات تو وہ بھی بدل گیا

اس کو فرح میں کون سے موسم کا نام دوں
جھڑنے لگے جو پات تو وہ بھی بدل گیا

فرح شاہد

انتخاب

خالد احمد

مدح کے باب میں بھی ہم رہے محتاجِ نوا
تیرے مدّاح اسیرِ سروساماں کیوں ہیں؟

نعمان منظور

غزلیں

جب عشق میں بھی ہجر کی تمثیل ہو گئے
پھر دشت میں بھی باعث تذلیل ہو گئے

تعبیر خواب جل گئی سگرٹ کے ساتھ ساتھ
دھوئیں کے ساتھ خواب بھی تحلیل ہو گئے

دنیا ذرا سی کیا ملی، دنیا پرست کو
لب اور لہجہ پہلے سے تبدیل ہو گئے

وہ لوگ تیرے پاس جو بیٹھے تھے تھوڑی دیر
تورات بن گئے کیا ، انجیل ہو گئے

لے اپنے ہاتھوں کرتے ہیں خوابوں کو اپنے قتل
لے تیرے سارے حکم ہی تعمیل ہو گئے

ہم کو بھی ناز خود پہ رہے گا یہ عمر بھر
ہم بھی تمہارے ہاتھ سے تکمیل ہو گئے

ہر بھائی دوسرے سے ہے حد درجہ بدگماں
لگتا ہے سارے بھائی ہی قابیل ہو گئے

تاثیر جعفری

جس سے امتحان سے گزرے
ہم کڑے امتحان سے گزرے

بے اماں دشت میں بھٹکتے ہوئے
قافلے امتحان سے گزرے

سر کٹا کر یہ لوگ مقتل میں
عشق کے امتحان سے گزرے

رات بھر آندھیوں سے لڑتے ہوئے
کچھ دیے امتحان سے گزرے

زندگانی کی دھوپ چھاؤں سے
ہم بڑے امتحان سے گزرے

اور فاقوں میں جانے کتنے لوگ
بھوک کے امتحان سے گزرے

محسن رضا شافی

غزلیں

ایسا نہیں کہ تم سے محبت نہیں رہی
سچ ہے مگر وہ پہلی سی چاہت نہیں رہی

اب اس قدر بھی پیار سے ہم کو نہ دیکھیے
اس درجہ التفات کی عادت نہیں رہی

میں عمر بھر خلوص و وفا بانٹتی رہی
میرے نصیب میں ہی یہ دولت نہیں رہی

گرچہ خلوص کا کبھی پایا نہیں صلہ
پھر بھی کبھی کسی سے عداوت نہیں رہی

ہر وار سہہ لیا گیا ظالم سماج کا
اب دل میں اور سہنے کی طاقت نہیں رہی

روبیؔ ملی حیات کی ہر اک خوشی، مگر
اس وقت جب حیات کی حاجت نہیں رہی

روبینہ ممتاز روبی

تیرے غم میں یہ حال تھوڑی ہے
اس میں تیرا کمال تھوڑی ہے

اچھا گزرا نہیں تو غم کیا ہے
باقی اک یہ ہی سال تھوڑی ہے

اپنے مطلب کو مجھ سے ملتا ہے
اس کو میرا خیال تھوڑی ہے

بس کہ اکتا گیا محبت سے
دل کے شیشے میں بال تھوڑی ہے

خشک آنسو ہیں بجھ گیا دل بھی
خواہشوں کا زوال تھوڑی ہے

ٹھوکروں پر بھی جو رہے ثابت
دل ہے جامِ سفال تھوڑی ہے

غم کبھی بے سبب بھی ہوتے ہیں
اک ترا ہی ملال تھوڑی ہے

نائیلہ راٹھور

غزلیں

کوئی کہتا ہے لا تماشا ہے
اور کسی کا خدا تماشا ہے

پہلے تو کن کی اک صدا آئی
اور پھر کہہ دیا تماشا ہے

نت نئے سلسلے ہیں شام و سحر
ایک سے اک بڑا تماشا ہے

آپ اور میں سبھی تماشائی
آپ کا اور مرا تماشا ہے

یاں تو ہر ہاتھ ہے یدِ بیضا
ہر کسی کا جدا تماشا ہے

عشق کو عام شے سمجھتا تھا
یہ تو اچھا بھلا تماشا ہے

وصل کیا ہے فقط فریبِ دلی
ہجر کیا ہے نرا تماشا ہے

یا میری آنکھ ہے تماشائی
یا میرا آئینہ تماشا ہے

تم، محبت، خدا، جہاں اور ذات
عقل سے ماورا تماشا ہے

محمد حماد

کہیں کوئی ملا کہیں کوئی
دل کو بھایا مگر نہیں کوئی

نیند تو آنے سے رہی مجھ کو
بات ہی چھیڑ ہم نشیں کوئی

ایک خوشبو ہے چار سو میرے،
پھول صورت مگر نہیں کوئی

میں خداؤں سے مل کے آیا ہوں
شہر میں آدمی نہیں کوئی

ان مزاروں کے سامنے آرش
کاش جھکتی نہیں جبیں کوئی

علی آرش

چاچا تایا زندہ باد

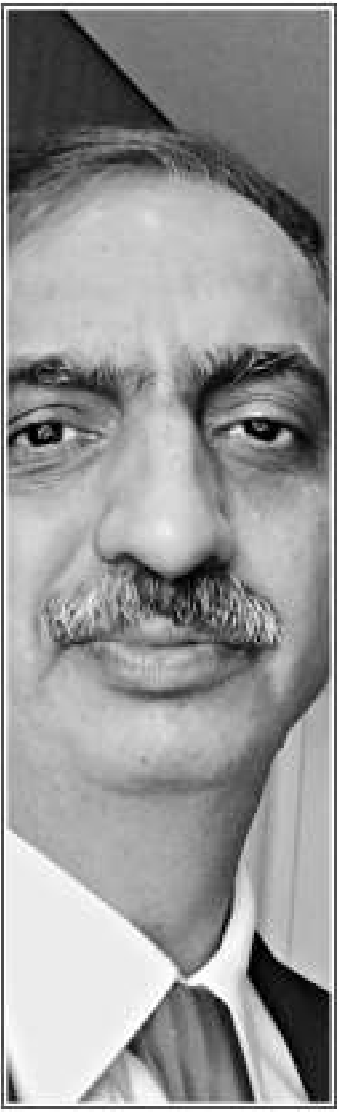

حبیب الرحمٰن

سفید حویلی کے باہر بیٹھے گلفام کو سردیوں کی شدید دھند کے پار آسمان پر چمکنے والا سورج ایک دھبے کی صورت نظر آ رہا تھا۔ سر پر رکھی گرم چادر کو سر پر مزید زور سے لپیٹتے ہوئے وہ کبھی کبھی منہ سے نکلتی ہوئی بھاپ کو دیکھتا اور سردی سے مزید سکڑتے ہوئے اپنے کانوں کو سڑک کی جانب سے آنے والی آوازوں کی جانب لگا دیتا۔ صبح سے اب تک چاچے انور کا تانگہ ہی وہ واحد سواری تھی جو اس کے سامنے والی سڑک سے گزری تھی۔

چھوٹے سے ٹلے پر بنی وہ حویلی گاؤں سے قدرے باہر بنی ہوئی تھی۔ موسم اچھا ہوتا تو گورکھ پور کی جانب آنے والی سڑک دور تک پھیلے سبزے کے درمیان لہریا سانپ کی طرح اپنی جانب بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی۔ سڑک کے پار گلفام کی تھوڑی سی زمین تھی جسے کسی حد تک دریا کے تیز پانی کے کٹاؤ نے دریا برد کیا ہوا تھا۔ گرمیوں کی شام ہوتی تو دریا کی جانب سے آنے والی ٹھنڈی ہوا سارے منظر میں رنگ بھر دیتی۔ کئی سال پہلے گلفام کے والد نے جب یہ حویلی بنوائی تھی ان کا خیال تھا کہ گھر اور گاؤں سے تھوڑا باہر قائم یہ حویلی پنچائت

اور اس ملنے آنے والے بیوپاریوں سے بات چیت کے لیے استعمال ہوگی اور یوں بھی مال ڈنگر رکھنے اور ان کو چرانے کے لیے یہ حویلی مناسب لگتی تھی۔

حویلی کے باہر بیٹھے گلفام کی عمر یہی کوئی چودہ پندرہ سال ہوگی۔ اس نے ایک گرم چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ حویلی کے دروازے سے جھانک کر اس کی ماں زرینہ دو تین بار اسے اندر بلانے کی ناکام کوشش کر چکی تھی جس کے جواب میں وہ ہر بار بغیر بولے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماں کو چپ رہنے اور گھر کے اندر پلٹ جانے کا کہتا۔ گلفام پچھلے کئی جمعوں کی طرح آج بھی فجر کی اذان کے وقت سے حویلی کے دروازے پر پڑے ایک بڑے پتھر پر اکڑوں بیٹھا شہر کی جانب سے آنے والی گاڑی کا منتظر تھا۔ اس کے دایاں پاؤں سائیکل پر ایک طرف کھڑے ہو کر ڈھلوان پر بار بار جانے اور اور پھسل کر گرنے سے زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے دائیں پاؤں کی جوتی ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کی شلوار کا دایاں پائنچہ پیڈل میں بار بار پھنسنے سے پھٹ چکا تھا۔ گلفام کی تمام توجہ سڑک کی جانب سے آنے والی آوازوں کی جانب تھی۔

کئی سال پہلے گلفام کے والد چوہدری اللہ دتہ کو دوبئی سدھارتے ہوئے اگر تھوڑا سا بھی شک ہوتا کہ وہ دوبئی جا کر اتنی جلدی ہمیشہ کے لیے وطن واپس لوٹ آئے گا تو وہ کبھی بھی اتنی رقم ضائع کر کے دوبئی نہ جاتا۔ وہ تو دو بیگھے زمین بیچ کر آنکھوں میں سنہرے سپنے لیے دبئی گیا تھا اور ابھی تو اس نے ایجنٹ کو دی ہوئی رقم پوری بھی نہ کی تھی کہ اسے اپنے باپ کے مرنے کی وجہ سے واپس پاکستان پلٹنا پڑ گیا۔ گھر میں چھوٹی بہن اور بھائی تھے۔ ماں دو سال پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ ساری گھر داری چھوٹی بہن کرتی۔ اللہ دتہ کا چھوٹا بھائی اللہ وسایا ان دنوں آٹھویں میں پڑھ رہا تھا۔ اللہ دتہ کا دل تو بہت کرتا کہ چھوٹا بھائی اللہ وسایا پڑھائی چھوڑ کر اس کے ساتھ زمینداری سنبھالے، بکی ہوئی زمین کو واپس لینے اور قرضے لوٹانے میں اس کی مدد کرے لیکن وہ بھائی کے پڑھائی کے شوق کو دیکھتے ہوئے چپ ہو جاتا۔

اللہ دتہ کے باپ نے اسے کبھی زمینداری کرنے نہیں دی تھی سردیوں میں نماز کے لیے بھی اس کی ماں اگر جگاتی بھی تو پانی گرم رکھتی اس کا باپ نماز کے بعد بھینسوں کا دودھ دوہنے اور چارہ ڈالنے کے بعد کئی بار اس کی رضائی میں اس کے پاس آتا تو اپنے ٹھنڈے پاؤں اس کے پاؤں پر دھر کر اسے جگاتا تو وہ چڑ جاتا۔ اسے پڑھنے کا شوق نہیں تھا اس کے باپ نے ایک بار بھی اصرار نہیں کیا کہ وہ پڑھے۔ اس نے دوبئی جانے کا کہا

تو اسکا باپ زمین بیچنے پر راضی ہو گیا- اس کا باپ اس کے دور جانے پر ناخوش ضرور تھا لیکن وہ اس کو خوش رکھنے کی خاطر اس بات پر بھی راضی ہو گیا اللہ دتہ کا خیال تھا کہ وہ سال دو سال میں اتنا کما لے گا کہ زمین واپس لینے کے بعد بھی وہ باپ کو اتنی رقم دینے کے قابل ہو گا کہ اپنی شادی دھوم دھام سے کر سکے لیکن باپ کے اچانک مرنے سے سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا-

منہ اندھیرے سر پر چادر لپیٹے جب وہ بھینسوں کے باڑے کی طرف نکلتا تو اسے باپ اور ماں شدت سے یاد آتے اور وہ حویلی کے دروازے سے لگ کر کئی بار رو دیتا- چھوٹی بہن جب صبح سویرے ناشتہ بنا کر اس کے سامنے رکھتی تو اس کے آنسو چھلک پڑتے- باپ کے ہوتے ہوئے تو اسے پتہ ہی نہیں چل سکا تھا کہ بن ماں کی اس کی بہن کب کی جوان ہو چکی ہے-

گاؤں کے سنگی بیلی اللہ دتہ کو شادی کرنے کا کہتے تو اس کے آڑے جوان بہن کا چہرہ اور چھوٹے بھائی کی پڑھائی آ جاتی- چاچے کرم علی کی جوان بیٹی زرینہ بیوہ ہو کر باپ کی دہلیز پر واپس لوٹی تو برادری والوں نے ایک بار پھر شادی کے لیئے اللہ دتہ پر زور دینا شروع کر دیا- اللہ دتہ شاید ان حالات میں بھی شادی پر راضی نہ ہوتا لیکن زرینہ کے بھائی کی جانب سے اس کی بہن کے رشتے کی بات نے اس کے پاؤں آخر کار باندھ ہی دیئے اور وٹہ سٹہ کی یہ شادی آخر کار ہو گئی- چھوٹا بھائی اللہ وسایا آٹھویں پاس کر کے قریبی شہر میں نویں جماعت میں داخل ہو گیا- چھوٹے بھائی کے ہوسٹل منتقل ہونے سے اللہ دتہ پر اچھا خاصہ مالی بوجھ بڑھ گیا- اس کا گزارہ بھینسوں کا دودھ بیچنے اور چھوٹی موٹی زمینداری سے چل جاتا تھا لیکن ہوسٹل کے خرچے اسے کئی بار پریشان کر دیتے- وہ ان حالات میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتا اور کسی کو بھی اپنی پریشانیوں میں شریک نہ کرتا-

شادی کے ایک سال بعد ہی گلفام اس کی اکلوتی اولاد بن کر اس کی زندگی میں آ گیا- یوں تو گلفام بہت ہی پیارا بچہ تھا لیکن پیدائش کے دوران ہونے والی پیچیدگیوں کے باعث وہ وہ ذہنی طور پر قدرے کمزور تھا جس کا ادراک اللہ دتہ اور زرینہ کو جلد ہی ہو گیا- گلفام کو بولنے میں مشکل پیش آتی اور چلنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ کئی بار گر پڑتا- جسمانی معذوری کے باوجود وہ ماں باپ کے لیئے خوشیوں کا منبع ہی رہا- وہ اس کے گرنے پر ہنستے اور اس کے توتلے الفاظ پر قہقہے لگاتے- انہوں نے گلفام کو پڑھانے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے- گلفام کی دن بھر کی مصروفیت ناشتے کے بعد گھر کے باہر بنے تھڑے پر بیٹھنا اور آتے

جاتے لوگوں سے اپنے طور پر گپ شپ لگانا تھا۔اس کی دوسری مصروفیت دادا کی جانب سے وراثت میں ملنے والی پرانی سائیکل تھی جسے تھام کر وہ چلانے کی کوشش کرتا اور دائیں پاؤں کو پیڈل پر رکھ کر سائیکل کو گھسیٹتے ہوئے گلی کے کونے تک ڈھلوان پر جاتے ہوئے کئی بار گرتا۔ گلفام کی اہم ترین خوشی ہر ایک دو ہفتے بعد گاؤں پلٹنے والا چاچا اللہ وسایا ہوتا تھا۔ گاؤں کی ہٹی سے ریوڑی مرنڈہ اور مکھانے مل جانے کے باوجود چاچے کے ہاتھ شہر سے لائے جانے والے چاکلیٹ پیسٹری اور کیک تو اسے چاچے کا دیوانہ بنا دیتے۔وہ چاچے کو دور سے ہی گھر کی جانب آتے دیکھ کر چاچا اللہ وسایا زندہ باد کے نعرے لگانے کی کوشش کرتا لیکن لکنت اور ذہنی کمزوری کے باعث اس کے منہ سے چا چا تایا زندہ باد کی آواز ہی نکلتی جسے سن کر اللہ وسایا ہنستے ہنستے دوہرا ہو جاتا۔

اللہ دتہ کا دل تھا کہ دس پاس کرنے کے اللہ وسایا فوج میں چلا جائے یا کلرک بھرتی ہو جائے لیکن جب اللہ وسایا دسویں جماعت میں پورے ضلعے میں اول آیا اور اس نے مزید پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو بڑا بھائی اسے مزید پڑھنے سے منع نہ کر سکا۔ پڑھائی جاری رکھنے میں اللہ وسایا کی محنت تو تھی ہی لیکن اللہ دتہ کی جانب سے بلا تعطل ملنے والی مالی مدد اور تعاون بھی بہر حال ہمیشہ اس کے ساتھ رہا۔اس نے چھوٹے بھائی کو کبھی بھی اپنی پریشانیوں کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔اگر کبھی اللہ وسایا پوچھ بھی لیتا تو وہ چوہدریوں کو کیا پریشانی ہونی ہے کہہ کر بات قہقہے میں اڑا دیتا۔ گیارہویں جماعت میں داخلے کے لیئے جب اسے بھینسیں بیچنی پڑیں تو کچھ عرصے کے لیئے تو اسے جیسے جان کے لالے ہی پڑ گئے۔ اللہ وسایا کی بارہویں جماعت پاس کرنے تک وہ کچھ بھینسوں کے علاوہ اپنی زمینوں میں لگے تمام کیکر اور شہتوت کے درخت بیچ چکا تھا۔ وہ ہمیشہ سب کچھ اکیلا جھیلتا اور بھائی پر کبھی نہ جتاتا کہ وہ کتنی مشکل سے یہ تمام مراحل سر کر رہا ہے۔

اللہ وسایا نے بھی بھائی کو مایوس نہیں کیا اور میٹرک کے بعد ایف ایس سی میں بھی اتنے اچھے نمبروں سے پاس ہوا کہ اس کا داخلہ با آسانی میڈیکل کالج میں ہو گیا۔اب کی بار اللہ دتہ کو ایک بیگھہ زمین مزید بیچنی پڑی ۔اللہ دتہ کو یقین تھا کہ بھائی کے ڈاکٹر بننے کے بعد یہ زمینیں بھی واپس مل جائیں گی اور تمام قرضے بھی واپس ہو جائیں گے ۔بھائی کی تعلیم کے پانچ سال وہ دنیاداری بھی نبھاتا رہا اور گھر کا نظام بھی کسی طور چلاتا رہا۔ کئی بار جی چاہتا کہ وہ سارے حساب کتاب بھائی کو بتائے اور دل کا بوجھ ہلکا کرے لیکن پھر خیال آ جاتا کہ بھائی کی

پڑھائی کے سو جھنجھٹ ہوں گے اسے کیوں پریشان کیا جائے۔

اللہ وسایا کی ہاؤس جاب شروع ہوئی تو اسے کسی حد تک اسے گھر سے پیسے مانگنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب اللہ وسایا اب کم کم گھر آتا۔ چھوٹی عید کے چاند کو دیکھ کر گاؤں میں جب سب پٹاخے چھوڑ رہے تھے تو اللہ دتہ کو بھائی کے گاؤں کی جانب آنے کا پتہ چلا۔ وہ گلفام کو لے کر وہ دوڑتے ہوئے گاؤں کی جانب آنے والے کچے راستے پر بھائی کا استقبال کرنے پہنچ گیا۔

رات کا کھانا کھا کر دونوں بھائی ڈیرے میں بچھی بان کی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ اللہ وسایا ڈاکٹری کی باتیں کر رہا تھا اور اللہ دتہ اپنی پریشانیوں میں اسے شریک کرنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔ آخرکار بہت ہمت کر کے اللہ دتہ نے بک جانے والی زمینوں اور درختوں کی بات چھیڑ دی۔۔۔

لالہ مجھے سب پتہ ہے کہ تو اپنے جھوٹے چوہدراپے کے لیے کتنی آبائی زمین بیچ چکا ہے۔۔ اللہ وسایا نے قدرے تلخی سے بھائی کو ٹوک دیا

اللہ دتہ نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن لفظ اب لفظ اس کے گلے میں پھنس گئے اور وہ بمشکل تھوک نگل کر نم ہوتی آنکھوں کو اپنے صافے سے پونچھ سکا۔

لالہ میرا بھی اس زمین پر میرا اتنا ہی شرعی حق ہے جتنا تیرا تھا۔۔ اللہ وسایا نے اپنی بات جاری رکھی

اللہ دتہ سے کوئی جواب نہ بن سکا۔۔ اس کی برسوں کی محنت اور قربانی لمحے بھر میں خاک ہوگئی تھی۔ رات نہ ہوتی تو شائد اللہ وسایا اس کی آنکھوں میں چھلکنے والے آنسو دیکھ ہی لیتا۔۔

تو چاہتا کیا ہے۔۔ اللہ دتہ آخر ہمت کر کے رندھی ہوئی آواز میں بولا۔۔۔

لالہ مجھے اس گاؤں میں نہیں رہنا بلکہ سچ پوچھ تو مجھے اس ملک میں بھی نہیں رہنا ۔۔۔ اللہ وسایا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔۔۔۔ میں نے ولایت جا کر مزید پڑھنا ہے ۔۔ اور مجھے تیرا احسان بھی نہیں چاہئے مجھے بس میرا وراثتی حصہ چاہئے۔۔

اس سے پہلے کہ اللہ دتہ کچھ بولتا اللہ وسایا پھر بولنا شروع ہو گیا۔۔۔ اور تقسیم وہ ہوگی جو ابا مرتے وقت چھوڑ کر گیا تھا۔۔۔ اب تو پتہ نہیں کیا رہ گیا اور کیا بک گیا۔۔۔ اللہ وسایا استہزائیہ لہجے میں بولا۔

اللہ دتہ نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور صبح پٹواری کو بلا کر جیسے چاہے زمین جائداد تقسیم کرنے کا کہہ کر صافہ آنکھوں پر لپیٹ کر لیٹ گیا۔ اگلی صبح پتہ چلا کہ وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہو چکا ہے ۔۔۔

لالے کی وفات کے بعد اللہ وسایا نے فوتیدگی کی رسمیں بخوبی نبھائیں اور

ساتھ ساتھ پٹواری سے جائیداد کی تقسیم بھی کرائی اور جائیداد کا ایک بڑا حصہ اونے پونے شریکوں میں بیچ بھی دیا۔

آبائی گھر تو دیہاتی روایت کے مطابق چھوٹے بھائی کا ہوتا ہے ۔۔۔ گلفام اور اس کی ماں کو گاؤں سے خاصی باہر بنی حویلی میں منتقل کرا کر گاؤں سے رخصت ہوتے ہوئے اللہ وسایا ان سے ملنے آیا تو بولا۔ زرینہ نے اللہ وسایا کی پڑھائی اور اس کی بہن کی شادی کے حوالے سے آنے والی مشکلات کی بابت بولنا چاہا لیکن کچھ بول نہ سکی اور دیور کے سر پہ ہاتھ رکھ کر آنسو پونچھتے ہوئے اسے رخصت کرنے لگی ۔ گلفام نے چاچے کو رخصت ہوتے دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر سائیکل کے پاس لے آیا اور بمشکل بولا ۔۔ چاچا سیکل ٹٹ (چاچا سائیکل ٹوٹ گئی ہے) ۔

مسئلہ ہی کوئی نہیں ۔۔ اللہ وسایا اس کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے بولا ۔۔ اگلے جمعے تیرا چاچا اپنی کار میں آئے گا اور تجھے بالکل نئی سائیکل دے کر جائیگا ۔۔۔ لش پش کرتی نویں نکور سائیکل ۔۔۔ اللہ وسایا مسکراتے ہوئے بولا

گلفام چاچے کی بات سن کر کھل اٹھا کھل اٹھا اور چاچا تایا زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔

دوپہر سے کچھ پہلے جب بہت دور سے کسی موٹر کی آواز آئی تو مشاق سپاہی کی طرح گلفام تیزی سے کھڑا ہوگیا ۔ اس نے سائیکل کو اپنے ساتھ کھڑا کیا اور ٹوٹے ہوئے پیڈل پر اپنا دایاں پاؤں رکھ کر سائیکل کے ہینڈل کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر ڈھلوان کی جانب چاچا تایا زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے بڑھنے لگا۔ دوسری جانب گورکھ پور کی جانب تیزی سے بڑھنے والی بس کے ڈرائیور کو دھند کے باعث ایک دم سے سڑک پر آجانے والا سائیکل نظر نہ آیا اور اس سے پہلے کہ وہ پورا زور لگا کر بس کو روکتا اچانک سے سامنے آنے والا سائیکل تیزی سے بس سے ٹکرا کر دور جا کر گر چکا تھا۔

بس کے مسافر تیزی سے بس سے اتر کر زخمی کی جانب بڑھے جس کے سر اور ناک سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

زندہ ہے ۔۔۔ بس ڈرائیور زخمی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا

یہ شائد کچھ کہہ رہا ہے زخمی کے آس پاس کھڑے لوگوں میں سے کسی نے ڈرائیور کی توجہ اس کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کی جانب دلائی ۔۔۔۔

خون کو روکنے کی کوشش کرتا ہوا ڈرائیور آواز سن کر مزید جھک گیا لیکن وہ چاچا تایا سے زیادہ کچھ نہ سن سکا۔

☆☆☆☆☆

فٹ پاتھ کا ہمالیہ

مسز ریحانہ کو پنشن کا دن سب سے خطرناک لگتا - جذباتی اور ہیجانی دورے اُٹھتے ، سانسیں اکھڑ جاتیں جوڑوں پہ درد کا احساس بڑھنے لگتا- دل پورے بدن پر لرزہ طاری کردیتا- گھر سے نکلتے ہوئے بنک پہنچنے تک، پنشن کی رقم گننے تک وہ اِسی کرب میں ڈوبی رہتی کہ اس کا سنہری دور ختم ہوا - مٹتی ہوئی زندگی اور شخصیت پروقت کی دھول نے ایک اور تہہ جما دی -اپنی بڑھتی ہوئی عمر ،جسمانی اور اعصابی کمزوری کا احساس اُسے بے چارگی کی شدید کیفیت میں مبتلا کرنے لگتا- پنشن اور ریٹائرمنٹ سے پہلے کا زمانہ، جب وہ تندرست، جوان حسین وجمیل اور رُعب دار اُستانی تھی- اسکی آنکھوں سے چھلکنے لگتا- بنک کے نئے نئے ملازم اُسے ماسی، خالہ، اماں کہہ کر پکارتے تو اُسے دھچکا لگتا- کبھی وہ میڈم پکاری جاتی تھی اس کے دستخط کی ایک اہمیت اور وقعت تھی - اسکا اپنا دفتر تھا-اس کا شاندار ماضی اب صرف اُسی کی سوچوں اور یادوں میں محفوظ تھا-بدلی ہوئی دُنیا کے لوگ اُسکے ماضی کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے-وہ پنشن کی رقم میں سے بغیر گنے بہت سے نوٹ اپنے جوان بیٹے کی جیب میں ٹھونس دیتی؟ تمہارا انعام اور جیب خرچ- لیکن ایک درد جس پر وہ قابو نہ پاسکی تھی کہ وہ اکیلی اور کمزور ہوتی جارہی ہے- پنشن کے لیے وہ دودن پہلے ہی سے اپنے من موجی نافرمان بیٹے کو تیار کرنے لگتی - جاوید تم نے مجھے بنک لیکر جانا ہے موٹرسائیکل ٹھیک ہے نا- پیر کے دن نہیں جائیں گے - منگل ، بدھ کو چلیں گے - رش کم ہوتا ہے نا، جاوید ہر بار چونک کر تکلیف سے احتجاج کرتا - ماما - اُف بنک جانا- میرے لیے سب سے بڑی اذیت کا نام ہے بہت لمبا انتظار کرنا پڑتا ہے- پھر آپ کی پنشن بک اور پنشن سلپ کے لیے-ایک کاؤنٹر سے ،دوسرے کاؤنٹر پر جا کر بے بسی سے قطار میں کھڑے رہنا- توبہ! آپ تو مزے سے کرسی پہ بیٹھ جاتی ہیں- اس

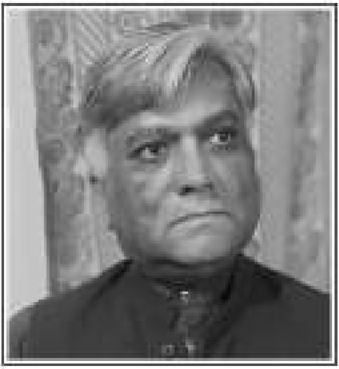

کلیم خارجی

احتجاج اور مذمت کے باوجود وہ تیار بھی ہو جاتا۔ کالج سے ادھوری تعلیم کے بعد۔ اس نے موٹر سائیکل خریدنے کیلئے۔ ماں کو کتنا مجبور کیا۔ صبح سے شام تک موٹر سائیکل پہ سکول کالج جاتی ہوئی لڑکیوں سے دوستیاں کرنا، فلمیں دیکھنا، آوارہ دوستوں کے ہاں راتیں بسر کرنا اسکی زندگی کا ایسا معمول تھا۔ کہ اس کا ذہن کسی اور مفید کام کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ اپنی بوڑھی اور نڈھال ہوتی ہوئی ماں کے بارے میں اُسے کبھی کوئی جذباتی تکلیف نہیں ہوتی تھی اپنے کردار اور ذمہ داری کو محسوس کرنے کیلئے اس کے پاس وقت تھا نہ احساس۔ اس نے اپنی ماں کو شروع ہی سے اکیلا دیکھا تھا اسکی ماں کے مضبوط کردار اور قابل عزت معاشرتی رتبے نے اُسے خوشحال بچہ بنائے رکھا تھا۔ اور اب وہ اپنے مقام سے نیچے اُترنے کے قابل ہی نہیں تھا۔

فروری کا مہینہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ تو ماں اور بیٹے کے درمیان وہی سالوں پرانا مکالمہ ہوا۔ حسب معمول وہ پنشن لینے کیلئے وقت سے پہلے اُٹھ کر تیار ہو گئی۔ جیسے وہ ڈیوٹی کیلئے سکول جایا کرتی تھی۔ وہ تیار ہو کر صحن اور کمروں میں بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ جب کہ اسکا شہزادوں جیسا بیٹا۔ گرم بستر میں خراٹے بھر رہا تھا۔ ریحانہ ارشاد نے ناشتہ تیار کر کے، اُسے شائستگی سے آوازیں بھی دیں۔ لیکن کئی مرتبہ نیند سے بے وقت بیدار کرنے پر بدتمیزی کر چکا تھا۔ چنانچہ اب اُسے احتیاط اور خوف سے اسکے اُٹھنے کا انتظار کرنے کی عادت ہو چکی تھی۔ ساڑھے نو بجے اُس کا چہیتا اُٹھا۔ ناشتہ کرنے اور تیار ہونے میں اُس نے دو گھنٹے لگا دیئے۔

مسز ریحانہ ارشاد جوانی والی میڈم بن گئی۔ ”تم مجھے کھلا سکتے ہو؟ میری دوائیاں خرید کر دے سکتے ہو؟ تمہیں بھی تو میری پنشن کی ضرورت رہتی ہے۔ جیسے تم میری تنخواہ کے دن سکول آجایا کرتے تھے۔ تم میرے پیسوں پہ زندہ رہ کر اپنی ضرورتیں پوری کرنے پر مجبور ہو۔ مجھ پہ احسان نہیں کرتے۔ اگر تمہیں میں خرچہ نہ دوں۔ تو کیا تم کما سکتے ہو؟ تمہارے یہ نخرے، میں برداشت کرتی ہوں۔ تم پر ترس کھا کر۔ کبھی تم بھی میرا احساس کر لیا کرو۔“

عرصے کے بعد ماں کے لہجے کی سختی اور چہرے کا رُعب دیکھ کر اس کی کرخت باتیں اسکے منہ کے اندر ہی دب گئیں۔ ٹھیک ہے اب میں جا رہا ہوں نا۔۔! آپ کے ساتھ بات ختم۔۔۔، اس نے اپنا احتجاج ہلکا کر کے ماں کے غصے کا جواب دیا۔

موٹر سائیکل پہ بیٹھتے ہی اُسے ہلکی سی سردی لگی۔ غصے اور بے چینی میں وہ اپنا جرسی پہننا بھول گئی تھی۔ لیکن اپنی کیفیت اس نے ظاہر نہ ہونے دی۔ وہ جان چکی تھی کہ اس کا جوان سال بیٹا اسکے معاملے میں بے حس اور خود غرض ہے۔ بنک کے دروازے پہ

جھڑکتے ہوئے اس نے کہا- چلو اب تم جاؤ تمہیں یہاں بڑی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے- میں نے چالیس سال ملازمت کی ہے سب کچھ خود کر سکتی ہوں--- چلیں اب ضد چھوڑیں- وہ بھی سختی سے بولا- پنشن والے مجھے ہی تو جانتے ہیں- پنشن بک تو میری ہی پاس ہے- موٹر سائیکل پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ غصے سے بنک کے اندر داخل ہو گیا- آہستہ آہستہ تکلیف وہ قدم اُٹھاتے ہوئے وہ بھی بنک میں جا کر اپنی مخصوص کرسی پہ جا بیٹھی- بنک کے کلرک نے اس کے بیٹے کے اشارے پہ سر اٹھا کر اُسے دیکھ کر اطمینان سے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا- اُس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا- لیکن اُسکے دماغ میں کچھ اُداسی اور بے قراری ایسی تھی جیسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی- اس نے گھبرا کے خود سے سوال کیا ریحانہ ارشاد میں کہیں مر تو نہیں رہی- خوفزدہ ہو کر اس نے گول گول آنکھیں پھاڑ کر لوگوں کو گھورنا شروع کر دیا- دس منٹ اور لگیں گے - بیٹے کی آواز سُن کر وہ سنبھل گئی- اُس نے اپنے بیٹے کی بے صبر طبیعت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا- ''مسز اقبال گھر میں بیٹھے بیٹھے پنشن وصول کرتی ہے- بس اسکا بیٹا یا بیٹی آ کر لے جاتے ہیں- میں اُس سے پوچھوں گی یہ سب کیسے ہوتا ہے-'' یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں- لیکن آپ کو مجھ پہ یقین نہیں آتا- وہ طعنہ دیتے ہوئے بولا- آپ کو یہ ڈر رہتا ہے کہ پوری پنشن لے کر بھاگ نہ جاؤں---؟ بیٹے کی بات سن کر اس کا لہجہ بھی سخت ہو گیا اور وہ لوگوں کی پرواہ کیے بغیر بولی- ''تو میری پوری پنشن کہاں جاتی ہے میری تنخواہ کہاں جاتی ہے-'' ماں کا رویہ دیکھ کر بیٹا پنشن کلرک کی جانب لپک گیا- اور پنشن کی رقم لا کر ماں کی مٹھی میں رکھتے ہوئے بولا- ''یہ لے سنبھالیں---''

بنک سے باہر نکلتے ہوئے ریحانہ ارشاد نے پہلے سے کئی گنا زیادہ رقم بیٹے کی جیب میں ٹھونس دی- اور کہا باہر نکل رہے ہیں - اندر دبا لو--- وہ نادم ہو کر اپنے حق میں دستبردار ہونے لگی تھی - تا کہ اُسکا روٹھا ہوا اکلوتا بیٹا خوش ہو جائے- وہ اُسے مالدار ہونے کا احساس دینے لگی- پارکنگ سے موٹر سائیکل نکال کر اُس نے ماں کو بٹھایا - اور کک لگائی- موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوا- لیکن رفتار نہ بڑھی - اُس نے دونوں پاؤں زمین پہ ٹکا کر پہیوں کو دیکھا- پچھلا پہیہ پچکا ہوا زمین میں دھنسا ہوا تھا- اوہ--- یہ تو ٹائر پنکچر ہے- اس نے آہستہ سے ماں کو اُترنے کیلئے کہا- اور کچھ دیر موٹر سائیکل دھکیلتا ہوا اُس کے ساتھ چلتا رہا- ڈاک خانے کے قریب پہنچ کر اُس نے ماں کو پہلی مرتبہ ہمدردی سے دیکھا- احساسِ جُرم کی وجہ سے اُسکو اپنا جبڑا بند کرنے میں دقت سی محسوس ہونے لگی تھی- اسکی بوڑھی، سفید، فربہ جسم کی بیمار ماں بڑی مشکل سے قدم اُٹھا رہی تھی-

ڈاکخانے کے دائیں موڑ سے شہر سے باہر جانے والی سڑک کی فٹ پاتھ پہ چلتے چلتے اس کی ماں تھک کر بولی بس میں یہیں بیٹھ جاتی ہوں- ورنہ گر پڑوں گی-- ٹھیک آپ اس اونچے اور صاف فٹ پاتھ پہ بیٹھیں میں ہوا بھروا کے آتا ہوں- زیادہ وقت نہیں لگے گا- مسز ریحانہ ارشاد نے موٹر سائیکل کی گدی پکڑ کر بڑی مشکل سے اپنے آپ کو فٹ پاتھ پہ ٹکاتے ہوئے کہا" یہ دن بھی آنا تھا- فٹ پاتھ پہ بیٹھنا تھا-" اس نے فٹ پاتھ کے فرش پہ دونوں ہتھیلیاں ایسی رکھیں کہ جیسے اب یہاں سے اُٹھنا اس کے بس میں نہیں، ماں کو فٹ پاتھ پہ بٹھا کر جیب میں اُبھرے ہوئے نوٹوں کو پرس میں رکھتے ہوئے، اس کے نتھنے پھڑکنے لگے، پھر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کا دل پہلی مرتبہ دکھ کے شدید احساس سے لرزنے لگا" ماں نے موٹر سائیکل پہچانا ہی نہیں- "وہ اپنے اندر بڑبڑایا-

اسکا موٹر سائیکل اسکے پرانے دوست حمزہ نے مانگ لیا تھا، ایکدم اسکی مٹھیاں کسنے لگیں- "حمزہ میں تمہارے دانت توڑ دوں گا تم نے مجھ سے میرا بہترین 125، موٹر سائیکل لیکر تھوڑی دیر کیلئے مانگ لیا تھا اور اپنا کھٹارا پنکچر ٹائر والا موٹر سائیکل میرے حوالے کردیا- تمہاری - -ماں -- کی" وہ غم اور غصے سے تیز قدم اٹھانے لگا- ریحانہ ارشاد آتی جاتی ٹریفک کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف اپنے بیٹے کو دیکھے جارہی تھی- وہ دور ہوتا جارہا تھا- لیکن اُسے صرف وہی نظر آرہا تھا- یکا یک ایک دُکھ بھری مسکراہٹ ریحانہ ارشاد کے چمکتے ہوئے خوبصورت چہرے پہ وارد ہوئی - اور وہ آسمان کی طرف منہ کرکے بے اختیار بول اُٹھی "میرے بیٹے کو دُکھ، درد کا احساس نہیں ہوتا- خوش رہے گا، اسے غم سہنے کا پتہ ہی نہیں- اچھی بات ہے" وہ تھوڑی دیر مسکراتی رہی - پھر اسکی چمکدار موٹی موٹی آنکھیں بھیگ گئیں- لیکن فروری کی دھوپ کے سکون اور لطف سے وہ سنبھل گئی- دھوپ سینکتے ہوئے اُسے ایک مدت ہوگئی تھی- وہ ایک کہنی اپنے موٹے سے گھٹنے پر رکھے- دونوں انگلیاں اپنی کنپٹی پہ رکھے لوگوں کو دیکھنے لگی- خوبصورت گاڑیاں، رکشوں، موٹر سائیکلوں کا شور اور بھیڑ زیادہ ہونے لگی تھی، دن چھوٹے تھے، دفتروں کی چھٹی ہونے لگی تھی- جو سڑک قدرے سنسان تھی- اب ہنگامہ خیز ہونے لگی تھی- خوبصورت مہنگی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے مرد اور خواتین اسے ایک نظر دیکھتے اور جھٹ سے دوسرے منظر میں داخل ہوجاتے- بہت دیر تک سخت فرش پر بیٹھے بیٹھے اسکے کولہے کی ہڈی سے ٹھنڈی ٹھنڈی درد کی لہر اُٹھنے لگی جو اس کے بائیں ٹانگ کو سُن کرنے لگی تھی- اس نے گھبرا کر اس سمت دیکھا جہاں اس کا بیٹا موٹر سائیکل دھکیلتا ہوا اوجھل ہوا

تھا۔ اُس کے کانوں میں ان دیکھے لوگوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ''لو اب فٹ پاتھ پہ آ بیٹھی۔۔۔ کل کی میڈم ریحانہ ارشاد فٹ پاتھ پہ بے یار و مدد گار بیٹھی ہوئی ہے۔''

اپنے جوانی کے تازہ دم اور خوشحال دنوں میں اُس نے بھی سُن رکھا تھا کہ فٹ پاتھ انسانی زندگی کے تنزل اور بے چارگی کی علامت ہے، فٹ پاتھ پہ پاؤں رکھتے ہوئے لوگ اپنے ٹھکانوں کی طرف بڑھتے ہیں لیکن جو فٹ پاتھ پہ بیٹھ جائیں۔ وہ حقارت اور پستی کے شکار ہو کر لاشوں کی طرح گھسیٹے جاتے ہیں۔ اپنی حالت محسوس کرتے ہوئے ریحانہ ارشاد نے اپنی چادر میں آدھا چہرہ چھپا کر ہچکیاں لینا شروع کر دیں۔ سوچ کر کہ شاید اب وہ کبھی فٹ پاتھ سے اُٹھ نہ پائے۔ اسکی ہچکیاں آہوں میں بدلنے لگیں۔ دُھوپ ڈھلنے لگی تھیں۔ بہت دیر سے فٹ پاتھ اور آس پاس کی دُنیا میں صرف اپنا تنہا اور بے بس، بے سہارا وجود محسوس ہو رہا تھا۔ جسم میں اُٹھتی ہوئی درد کی لہر کم کرنے کیلئے اُس نے کروٹ بدل کر دائیں کولہے پر اپنا بوجھ لاد کر اپنا چہرہ صاف کیا۔ تو اُسے یوں لگا جیسے بڑھی ہوئی سفید بے ترتیب داڑھی اور اُجڑے ہوئے سفید بالوں والا لوٹا آدمی کافی دیر سے اُس کے آس پاس سے گزر کر اُسے بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اُسے سخت غصے اور حقارت سے دیکھا تو وہ کمزور لہجے میں التجا کرتے ہوئے بولا، بی بی دراصل آپ کے پیچھے فٹ پاتھ کی اوٹ میں میں نے اپنا کمبل لپیٹ کر چھپا رکھا ہے۔ میں رات یہیں سو گیا تھا۔ اب میری ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ میں آپ کے پاس سے گزر کر اُسے اُٹھا لوں۔

ریحانہ ارشاد نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو اُسے کچھ نظر تو نہیں آیا۔ لیکن اُسے اطمینان ہو چکا تھا۔ ''آپ اپنی چیزیں اُٹھا لیں۔ اُس نے اپنا کمبل اٹھایا اور بغل میں دباتے ہوئے بولا، بی بی فٹ پاتھ پہ آ کر بیٹھ جانا اور بس جانا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ مجھے تو اپنا آپ ہمالیہ پہ بیٹھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ریحانہ ارشاد کو اس لوٹے آدمی سے ایسی بات کی توقع نہ تھی۔ اس کے اندر ہمت بڑھ گئی اور وہ اُسے مانوس نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ میرا بیٹا آئے گا۔ مجھے لے جائے گا موٹر سائیکل ٹھیک کروانے گیا ہے؟

''کاش وہ میرے ہوتے ہوئے آ جائے۔ ورنہ پھر مجھے آپ کے لیے یہاں اُسوقت بیٹھنا پڑے گا جب تک وہ نہیں آ جاتا۔ لوٹا اپنائیت سے بولا۔ جو لوگ فٹ پاتھ پہ بیٹھ کر لمبا انتظار کرتے ہیں۔ وہ پھر کہیں نہیں جاتے آپ خود گھر کیوں نہیں چلی جاتیں۔''

وہ خوفزدہ اور بے بس ہو کر بولی، ''گھر کی چابیاں بھی اُسی کے پاس ہیں۔ لوٹے آدمی کے آنکھوں میں اُداسی بھر کے اُسے ہمدردی سے دیکھا اور بولا، وہ اپنی جہالت اور خود

غرضی کو سہارا بنا کر آپ سے دست بردار ہونا چاہتا تھا۔ ورنہ آپ کو چابیاں دے کر ٹیکسی یا رکشے پر گھر پہنچانے کا بندوبست کر سکتا تھا۔ لونے آدمی کی بات سن کر ریحانہ ارشاد کا جسم ٹھنڈا ہو کر بھاری ہونے لگا۔ ”آپ یوں کریں۔ خود رکشہ کرائے پر حاصل کر کے گھر چلی جائیں تالے توڑ کر نئے بھی خریدے جا سکتے ہیں۔ آپ کا گھر آپکا منتظر ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ دنیا اور اس کی ہر شے کو ٹھوکر مار کے فٹ پاتھ پہ آئیں ہیں۔ اصل میں صدیوں پہلے لوگ اپنی مرضی اور آزادی کی زندگی جینے کیلئے جنگلوں میں جایا کرتے تھے۔ اب فٹ پاتھوں پہ آجاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پہ آ کے بس جانا۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میں نے جب فٹ پاتھ پر زندگی سمیٹ کر چلنا شروع کیا تو فٹ پاتھ دور آسمان تک بلند ہو گیا مجھے لگا کہ میں گر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں گا لیکن میں سنبھل کے چلتا رہا بلکہ اوپر کی جانب بڑھتا رہا۔ مجھے امید تھی کہ ایک نہ ایک فٹ پاتھ پہ ہموار اور صاف جگہ نمودار ہو گی اور میں اس مقام پر پہنچ جاؤں گا جہاں انسان کو بے بسی اور بے چارگی کے ساتھ ضرورتوں کا احساس نہیں رہتا اور پھر یہی ہوا میں ہمالیہ پہ آ بیٹھا ہوں اور اب میں اپنی عمر جینے لگا ہوں اور جیے جا رہا ہوں۔“ ریحانہ ارشاد خوفزدہ ہو کر اُسے دوبارہ گھورنے لگی تو وہ اپنا لہجہ آہستہ اور نرم کرتے ہوئے بولا ابھی شام نہیں ہوئی ہے آپ کو گھر لوٹ جانا چاہیے۔

لونے آدمی کی باتوں نے اُسی خوشی اور فخر کے نئے احساس میں ڈبو دیا۔ اپنے اُٹھ جانے کی آزادی اور اختیار کے معنی کو آج اس کے ذہن نے اس طرح اُچھالا کہ اسکے کمزور سے بدن میں طاقت اُمڈ آئی۔ ”ہاں میں گھر جا سکتی ہوں وہ سنجیدگی اور اعتماد سے بولی۔ میں آپ کے لیے کسی رکشے کا بندوبست کر سکتا ہوں اور آپ کا کرایہ بھی ادا کر سکتا ہوں۔

ریحانہ کی بات کا انتظار کیے بغیر۔ اس نے شور اگلتی سڑک پہ سے ایک رکشے کو رکوا لیا اور اُسے ریحانہ کے بالکل کھڑے ہونے کو کہا۔ ریحانہ بڑی آسانی اور اور سکون سے رکشے میں بیٹھ گئی اسکی طبیعت پر لونے آدمی کی شخصیت اور ہمدردی کا بھرپور اثر چھایا ہوا تھا۔ اس نے اپنائیت رضامندی اور عقیدت سے آدمی کا کرتا پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ بھائی میرا جی چاہتا ہے آپ کو گھر لے چلوں۔ چائے پی کے واپس آ جانا۔ انکار نہ کرنا۔ میرا دل آپ کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔

آدمی نے مزید اصرار کرنے کا موقع نہ دیا۔ اور چپ چاپ رکشے والے کے پیچھے والی سیٹ پہ بیٹھ گیا کہاں جانا ہے۔ رکشے والے نے پوچھا تو ریحانہ ارشاد اعتماد اور ہمت سے بولی میڈم ریحانہ ارشاد کے گھر۔

لیکن یہ کس جگہ ہے؟

لوٹا آدمی بولا تم چلو تو سہی- پتہ چل جائے گا- رکشہ سڑک پہ دوڑے گا تو جگہ آ جائے گی-
اپنی نشست پہ ریحانہ ارشاد نے رکشے والے کا سوال سن لیا تھا- اس کے چہرے کا رنگ یکدم پیلا پڑ گیا- اور اسکی آنکھیں پھیل کر بے نور سی ہونے لگیں- اپنے اضطراب کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی- کہ اسکا گھر کس جگہ ہے- ذہن پہ زور دیتے ہوئے اسکی حلق سے دبی دبی ہوئی آہیں بھی نکل پڑیں- بہت دیر بعد اسکے ذہن کے پردے پر مندر والی گلی، کا عکس ابھرا تو چیخ پڑی- مندر والی گلی جانا ہے-
رکشے والے نے رنجیدہ سا ہو کر گردن ہلائی- اور پھر رکشہ موڑتے ہوئے دوسری سڑک پہ ڈال دیا-
مندر والی گلی پہنچ کر لوٹے آدمی نے جیب سے مڑے ہوئے پرانے میلے کچیلے نوٹ نکال کر گنے بغیر رکشے والے کو تھما دیے- لیکن وہ رکشے والے سے حساب نہ کر پایا نہ ہی رکشے والے نے اسے اضافی نوٹ واپس کیے بلکہ اس نے جلدی رکشہ موڑتے ہوئے تیز رفتاری سے غائب ہو گیا- ریحانہ ارشاد کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا تھیلا تھا- جس پہ کسی میڈیکل اسٹور کا آدھا مٹا ہوا اشتہار تھا- لیکن تھیلا مضبوط اور دبیز تھا- اس لیے وہ پرس کی جگہ سہولت سے ساتھ لیے پھرتی تھی- اس نے رکشے والے کو دینے کے لیے ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے- تو پنشن کے نئے نئے نوٹوں سے ہزار کا ایک کڑکڑاتا ہوا نوٹ برآمد ہوا تھا- جسے واپس رکھتے ہوئے اس نے عادتاً تھیلے میں ہاتھ ڈال کر باقی چیزیں ٹٹولیں- اس میں اسکی روزانہ کی دوائیاں، پنشن کی کاپی شناختی کارڈ اور نئے نوٹ موجود تھے اس نے خوشی سے چیخ بلند کی اوہ چابیاں تو یہاں میرے تھیلے میں موجود ہیں- اس نے جذباتی ہو کر وہ چابیاں لوٹے کے حوالے کرتے ہوئے کہا یہ لو بھائی- تالا کھول دینا، مندر کے عقبی دیوار سے دوسرے نمبر پر گلی کے پرانے کھمبے کے پاس اس کا گھر کا دروازہ نمودار ہوا جسکا ہلکا سبز رنگ، پرانی لکڑی کو نمایاں کر رہا تھا کئی برس پہلے تک اوپر کی لکڑی سے لگی کنڈی میں زنجیر ڈال کر اس میں تالا لگایا جاتا تھا پھر وقت کے مطابق دروازے کے درمیانی تختوں پر مضبوط لکڑی جوڑ کر اس پر سٹیل کے دستے والی کنڈی لگا کر اس میں تالا لٹکایا جانے لگا تھا یہی حال اندر کے سب دروازوں کا بھی تھا دروازے پہ پہنچ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے لوٹے آدمی کو آگے بڑھ کر تالا کھولنے کیلئے کہا لیکن دروازے کا نیا تالا پرانی چابی قبول کرنے کیلئے تیار ہی نہ تھا- لوٹے نے اپنی جسمانی طاقت استعمال کرتے ہوئے بار بار پانچوں چابیاں استعمال کر لیں لیکن تالے کی گنجائش اور

چابیوں کی ساخت کا فرق واضح تھا۔ دونوں حیرت اور پریشانی میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ پڑوس کا دروازہ کھلا ایک عورت نے دروازے کا آدھا حصہ کھول کر کہا" میڈم ریحانہ ارشاد آپ آگئی ہے - جاوید بھائی تو صبح صبح اپنی بیگم کو موٹر سائیکل پہ بٹھا کر چلے گئے ہیں۔ دودن پہلے اُنھوں نے رات کے وقت باہر اور اندرونی کمروں کے تالے توڑ دیئے تھے۔ اُن کے ساتھ انکی نئی نویلی دلہن بھی تھیں۔ آپ نے سب کچھ اتنی جلدی اوراچانک کروادیا۔ اورکوئی خوشی نہیں منائی۔

"آپ اندر آجائیں ان بھیا کو بھی بیٹھک میں بٹھا دیں۔"لیکن مسز ریحانہ ارشاد تو جیسے سکتے میں گم ہوکر مردہ سی ہوگئیں۔ اُسے سانس لینا بھی یادنہیں رہا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اُس نے جیسے بہت دُور سے کسی سے بات کی ہو کب آئے گا جاوید اُسے میرا بتا دینا ہم شام کو آئیں گے۔ یہ کہہ کر اُس نے پڑوسن کی بجائے کمزوری اور بے بسی سے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا چلو بھائی۔ ہم پھر آجائیں گے۔ اُسے یوں لگا تھا جیسے اُس کے اندر سے ذہن نام کی کوئی چیز کہیں کھوگئی ہے۔

سارے منظر غائب تھے وہ دودن کے بعد گھر لوٹی ہے تو پھر وہ دن اُس نے کہاں گزارے۔ بنک سے نکلنے کے بعد۔ جاوید کے چلے جانے کے بعد وہ کہاں۔ اور کیوں تھی۔ اور سوال کی اذیت سے اُسکی سسکیاں اُبھرنے لگی تھیں۔ بی بی اب کیا کریں۔ لُولے آدمی نے ہمدردی سے پوچھا۔

"چلتے ہیں ہمیں فٹ پاتھ بلا رہا ہے۔" وہ بلبلاتے ہوئے بولی۔ ٹھیک ہے جب فٹ پاتھ کی طرف جانا ہے تو پیدل ہی چلتے ہیں وہ اُس سے ایک قدم آگے ہوکر مندر کی حد سے نکلتے ہوئے بولا۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے سسکتی ہوئی چلنے لگی میں کہاں تھی۔ میں کہاں تھی - وہ خود سے سسک سسک کر بولے جارہی تھی۔

مصروف سڑک سے ہوتے ہوئے وہ ایک ویران سڑک کے کنارے کچے پر چلتے جارہے تھے کہ ریحانہ ارشاد بولی۔ بھائی کہیں بیٹھ جاتے ہیں میں تھکی تونہیں۔ لیکن میری چیخیں میرے اندر مچل رہی ہیں۔ لُولے نے ترس کھاتے ہوئے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اور شفقت سے بولا۔ آگے سرکاری گودام کے پاس نالے کی منڈیر پر بیٹھ جاتے ہیں منڈیر ریحانہ ارشاد کو بٹھاتے ہوئے وہ اسکے قریب زمین پرنیچے بیٹھ گیا۔ ریحانہ ارشاد روتے ہوئے بولی۔ بھیا یہ کیا ہورہا ہے۔ میں دودن کے بعد گھر گئی میرے یہ دودن کہاں چلے گئے کیا واقعی یہ دودن تھے کہ دوسال تھے۔

بس کہیں فٹ پاتھ پر پڑے رہ گئے ہوں گے۔ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے ڈھونڈ لیں گے اصل میں ہوا یہ بی بی۔ تم فٹ پاتھ پہ بیٹھے

بیٹھے۔ فٹ پاتھ میں ڈوب گئی تھیں۔
تمہارے شاندار اور خوشحال ماضی، سڑکوں پہ گاڑیوں کے اندر بیٹھے لوگوں کے سوالات، جو اصل میں تمہارے اپنے بارے میں۔ تمہارے ذہن کے بنائے تھے۔ پھر فٹ پاتھ کی حقارت، تمہارے بیٹے کی خود غرضی، بے بسی کی شدت نے، تمہیں فٹ پاتھ کے اندر ہی کہیں دھنسا دیا تھا۔ تمہارے گزرے ہوئے بے نام سے دن وہ کہیں پڑے ہوں گے۔
وہ تحمل اور حیرت سے اپنے حواس سنبھالتے ہوئے بولی تم پڑھے لکھے دانش مند آدمی لگتے ہو۔ تم مجھے واقعی میرے بڑے بھائی لگتے ہو۔ جیسے تم مجھے سمجھا لیتے ہو۔ شاید کوئی نہ سمجھا پاتا۔ تم فٹ پاتھ پہ کب سے ہو؟
لو نے کو یوں لگا جیسے اپنی کہانی سنانے سے بے بسی کا شکار ہونے والی عورت کے دل میں سکون اور طاقت کا احساس ہو جائے گا۔
اس نے زمین پر دونوں کی ہتھیلیاں بچھا کر گہری سانس لی اور بولا بی بی میں جب نیوی میں ریٹائر ہوا تو میرے دو بچے فرانس چلے گئے۔ ایک بیٹا میرے پاس تھا۔ میں نے اُسکی شادی کروا دی تھی۔ چند دن خوشی کے رہے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے بیٹے کو میرا گھر میں رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ سو میں گھر سے چلتے چلتے دور ایک سڑک کے فٹ پاتھ پہ آ بیٹھتا۔ اور بہت دیر کے بعد واپس گھر جاتا۔ لیکن میرے بیٹے کو میرا گھر لوٹ کر آنا بھی پسند نہیں آتا تھا۔ مجھے لگا کہ اس کے پاس خوشیاں، رزق اور سکون کی گھڑیاں اتنی کم ہیں۔ کہ وہ انہیں میرے ساتھ بانٹنے سے بھی ڈرتا ہے۔ پھر فٹ پاتھ پہ میرا وقت زیادہ گزرنے لگا۔ اور ایک دن ایسا ہوا کہ میں گھر جانا ہی بھول گیا۔ اس کے چند دوستوں نے ایک بار مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔ اور لے جانا بھی چاہا۔ کئی بار وہ اپنے دوستوں کے کہنے پہ مجھے ڈھونڈنے بھی آیا تھا۔ لیکن میں نے اُسے چھپ کے دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھے ڈھونڈنا بھی اس خوف کے ساتھ کہیں اُسے مل ہی نہ جاؤں۔ پھر میں نے اپنا حلیہ، لباس اور احساسات بدلنے کیلئے اپنے شہر سے باہر جانے والی سڑک کے کنارے چلنا شروع کیا۔ میں چلتا رہا۔ بلکہ فٹ پاتھ پر چڑھتا رہا اور آزاد ہوتا رہا۔ میرے کپڑوں کی رنگت بدل گئی۔ میرے چہرے کے خدوخال گرد، دھوپ اور جھریوں میں دب گئے۔ میری پہچان ختم ہو گئی۔ بلکہ میری دولت اور شناخت کی کوئی شے میرے پاس نہ رہی تو میری بے بسی ختم ہو گئی اور میں نے جیسے ہمالیہ کی چوٹی سر کر لی ہو میں نے اپنے بارے میں لوگوں کے تمام سوالات سے جان چھڑا لی۔ میں نے دُنیا کی ہر شے، ہر آدمی، ہر شے سے خود کو دستبردار کروا لیا۔ اس شہر کے فٹ پاتھ پہ پاؤں رکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کوہ ہمالیہ کی کسی چوٹی پہ آ پہنچا ہوں۔ مجھے آس پاس کے لوگ، ان

کی کاریں، ان کی حرکتیں، ان کی ساری کاروائیاں، بے معنی اور بے وقعت لگنے لگیں۔ میرا ان سے ہر قسم کا موازنہ مٹ گیا۔ مجھے کہاں جانا ہے کہاں سونا ہے کیا کھانا ہے کہاں لوٹنا ہے۔ یہ سب سوالات جھاگ کی طرح میری زندگی سے غائب ہوگئے یہ جو لوگ نظر آنے کیلئے دوڑتے بھاگتے ہیں۔ یہ سب حماقت بلکہ پاگل پن کا شکار ہیں کہ جیسے کہیں کوئی انکا منتظر ہے۔

میں نے فٹ پاتھ پہ وہ بلندی حاصل کرلی ہے کہ ان کی ہر دسترس سے باہر ہوگیا ہوں بلکہ اب تو ایسا لگتا ہے کہ سب میری تفریح اور خوشی کیلئے بھاگتے پھرتے ہیں۔

میں بھی فٹ پاتھ کا ہمالیہ سر کرنے نکل آئی ہوں۔ لگتا ہے فٹ پاتھ مجھے کئی سالوں سے پکار رہا ہے۔ وہ آزادی کی خوشی میں چہکتے ہوئے بولی۔ میں بھی تمہاری طرح شہر سے باہر کی سڑک کے کنارے کہیں نکلوں گی۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔ تاکہ میرا حلیہ، میری رنگت، میرے بال، کپڑے سب بدل جائیں۔ میں بھی اس مقام پر پہنچنا چاہتی ہوں جہاں بے بسی اور بے چارگی کے احساس سے میں آزاد ہو جاؤں۔

یہ میرے تھیلے میں میری پنشن بک ہے۔ اس ماہ کی لی ہوئی آدھی پنشن ہے شناختی کارڈ ہے بغیر کسی تالے کے رکھی ہوئی چابیاں ہیں۔ انہیں رفتہ رفتہ کسی مقام پر پھینکتی جاؤں گی۔ جسے ضرورت ہوگی اپنی قسمت سمجھ کر اٹھاتا جائے گا۔ تم نے اپنی پنشن وغیرہ کے ساتھ کیا کیا تھا۔ وہ کسی انوکھی ہدایت کی آس میں بولی۔

میں نے جس دن نہ لوٹنے کا فیصلہ کیا تھا خالی ہوکر نکل آیا تھا۔ میرا بیٹا بڑا ہوشیار اور مکار آدمی تھا اس نے کسی نہ کسی طرح میری پنشن بک سے فائدہ اٹھالیا ہوگا۔ مجھے تو ریٹائرڈ ہوئے بھی تقریباً 30 سال ہوگئے ہیں۔ گھر میں کوئی بیٹی ہوتی تو شاید تمہاری عمر میں ہوتی۔ پھر وہ تسلی کا لہجہ اپناتے ہوئے بولا اگر میں تمہارے کھوئے ہوئے دو دنوں اور ایک رات کا کھوج بتادوں تو کیا تم گھر لوٹ جاؤ گی وہ نیند سے ہوش میں آنے والی آواز میں بولی میں کہاں تھی۔ میں کتنے دن خود سے گم رہی ہوں۔

جب تم فٹ پاتھ پہ آکر بیٹھ گئی تھیں۔ تو تمہارے عقب میں ڈھلوان پہ سویا ہوا تھا۔ صبح کی دھوپ چڑھی تو میرے اندر سے رات کی ٹھنڈک اور بے چینی اڑنے لگی تھی۔ سو میں وہی لیٹا رہا۔ اس دوران تم اور تمہارا بیٹا وہاں آن پہنچے۔ میں نے تمہیں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا تمہارے چہرے کا رعب اور رنگت کا نکھار مجھے اچھا لگا۔ تم نے مجھ سے بہترین زمانہ گزارا ہے۔ تمہاری رنگت اور تمہارے لباس کی خوشبو بتارہی ہے۔ کہ تم نے مشقت سے کم اور لیاقت سے زیادہ حاصل کیا ہے تمہاری ذہانت اور نسوانی جمال نے تمہاری خوش قسمتی کو جگائے رکھا۔ مجھے دھوپ کا مزہ دے رہی ہے۔ اور

مجھے یہ خطرناک حیرت بھی ہونے لگی تھی کہ کہیں تم فٹ پاتھ کی نہ ہو کر رہ جاؤ۔ تمہیں تنہا تنہا دیکھ کر میں وہاں لیٹا اور پھر وہیں بیٹھ گیا۔ تم دُکھ میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں۔ کہ تمہیں میری کھانسی اور ہلنے جلنے کی آواز کا بھی احساس نہ ہوا تھا۔ کتنے لوگوں نے تمہارا جائزہ بھی لیا۔ لیکن ذہنی اور جسمانی طور پر خود سے دستبردار ہو چکی تھیں۔ کچھ لوگوں نے سمجھا کہ میں تمہارا کوئی عزیز ہوں۔ اور تم مجھ سے ملنے آئی ہو اور میری ذہنی حالت کے سوگ میں گم سم بیٹھی ہو۔

شام ہوئی تو تمہاری پتھرائی ہوئی نگاہیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ دیکھ پا رہی تھیں رات کو میں تم پہ کمبل ڈال دیا تھا۔ پچھلے پہر کی سردی میں تم کمبل میں سمٹ جاتی تھی صبح تم سے کمبل پھسل گیا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ یوں اگلی دوپہر تک تم نے کوئی حرکت کی نہ آواز دی۔ نہ تمہارا بیٹا تمہیں لینے آیا۔ شاید وہ تمہیں وہاں ڈھونڈنے جاتا رہا ہو۔ جہاں تمہارا ملنا ممکن بھی نہ تھا۔ آج سہ پہر کے بعد میں نے تمہارے قریب بیٹھ کر دیکھنے والوں کو یہ احساس دیا کہ تم میرے پاگل پن کے دُکھ میں میرے ساتھ بیٹھ کر ماضی کے اچھے دنوں کی یاد منا رہی ہو۔ جب تم نے اپنے دفاع میں گھورا تو مجھے خوشی ہوئی۔ اور اب تم یہ میرے سامنے ہو۔

تو گویا فٹ پاتھ نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ میں نے آزادی، بے حسی اور دست برداری کے مرحلے طے کر لیے ہے۔ وہ نعرہ لگاتے ہوئے بولی ہاں فٹ پاتھ کے کچھ معجزے تو ہیں۔ میں نہ کبھی بیمار ہوا۔ نہ مجھے بھوک لگی۔ نہ بے لباس اور غمزدہ ہوا ہوں۔ میری ساری توانائی میرے وجود کو برقرار رکھنے میں صرف ہونے لگی۔ میں 90 سال کا ہو گیا ہوں۔ میں نے شہر کے تماشے دیکھے۔ اور ان پہ وقت کی دھول پڑتے دیکھی ہے۔ یہ جو سنبھالنے اور خیال رکھنے والے ہوتے ہیں نا۔۔ یہ آدمی کو کبھی سنبھلنے دیتے میں۔ نہ اپنی موت مرنے دیتے ہیں نہ جینے دیتے ہیں۔

تو بس بھیا۔۔۔ اب میرے ساتھ چلو۔ مجھے اپنا اندر باہر بدلنے میں میری مدد کرو۔ بی بی۔ وہ اچانک رو پڑا۔ میں فتح مند ہو کر۔ فٹ پاتھ پہ آبسا تھا۔ میں نے ہمالیہ سر کر کے فٹ پاتھ اپنا لیا تھا لیکن اب تمہیں دیکھتے ہوئے مجھے پھر سے گھر کی طرف لوٹنا پڑے گا بلکہ ہمالیہ سے نیچے اُترنا پڑے گا۔ ابھی فٹ پاتھ پہ آنے میں تمہارے لیے بہت وقت باقی ہے۔ مجھے تمہاری زندگی کی حفاظت اور سہولت کے لیے دوبارہ کسی گھر کا بوجھ سر پہ لینا پڑے گا۔ میں جہاں سے آچکا ہوں۔ سب کچھ بھول چکا ہوں۔ تمہارے دروازے پہ تالا کھولتے ہوئے میں بڑی اذیت سے گزرا تھا۔ لیکن میں اس اُمید پہ سنبھل گیا کہ تم دروازے سے اندر چلی جاؤ گی۔ اور میں جی لوں گا تم واپس لوٹ جاؤ ابھی تمہارے پاس بہت کچھ ایسا ہے جو

بہت وقت اور سفر کے بعد بھی بدلنے والا نہیں ہے۔ جو چیزیں جلدی تبدیل نہیں ہوتیں۔ انہیں تار تار تو نہیں ہونے دیتے۔ ابھی تمہارے روپ میں عورت آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ ابھی تمہارے لباس اور تمہارے اُٹھنے بیٹھنے میں رُعب اور کشش ہے۔ تم کسی بدصورت، بدروح کا شکار کیوں ہونا چاہتی ہو۔ ابھی پورا بڑھاپا تو آنے دو۔ چلو اُٹھو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ ورنہ مجھے پھر خود کوئی گھر ڈھونڈنا پڑے گا۔ اور تمہارا شفیق اور مددگار بھائی بن کر کئی محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔

وہ حیرت اور جذبات میں خود بھی رونے لگی۔ اُسے روتا دیکھ کر وہ خود بھی بچوں کی طرح روتا رہا۔ چند لوگوں نے رُک انہیں دیکھا اور پھر آدمی اور عورت کی آنکھیں دیکھ کر سمجھ جاتے کے پاگل کو گھر لے جایا جا رہا ہے۔ چلو اُٹھو پھر گھر ڈھونڈتے ہیں بھیا! اُس نے اپنے تھیلے پنشن بک اور اندر پڑی ہوئی رقم ٹٹولتے ہوئے کہا۔ وہ بھی چہک کر اُٹھا لیکن اُسکی آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ سے دھند جم چکی تھی اُسے یاد آیا کہ وہ صدیوں سے رویا ہی نہیں تھا اور اب رویا ہے تو آنسوؤں نے اسکی آنکھوں میں اندھا پن اُتار دیا اور جیسے ہی وہ دوسرا قدم اُٹھانے لگا اُسے یوں لگا جیسے آگے ہمالیہ کی گہرائی ہے۔ لیکن وہ رہبری کے جذبے میں آگے بڑھنے لگا۔ چند قدم ہی چلا تھا کہ یوں گرا جیسے کسی نے بیچ کے پھینکا ہو۔ ریحانہ ارشاد لپک کر اس کے قریب آ گئی۔ اس نے اپنا تھیلا زمین پہ رکھ کر اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ چند لوگ جمع ہوئے پھر ہجوم بڑھ گیا۔ ریحانہ ارشاد کی گود سے لوگوں نے اُسکی ٹھنڈی اور اکڑی ہوئی لاش اُٹھائی ایک ایمبولینس کا شور سنائی دیا۔ ریحانہ ارشاد نے زمین پر رکھے ہوئے پلاسٹک کے تھیلے لیے زمین پہ ہاتھ پھیرا تو مٹی اسکے ناخنوں میں گھس گئی۔ لوگ آہستہ آہستہ بکھرنے لگے۔ کچھ ہمدرد انسانوں نے ایمبولینس والوں کو بُرا بھلا کہا کہ مریض کی بیٹی کو یہیں چھوڑ گئے۔ اب یہ کیسے اُسے ہسپتال میں ڈھونڈے گی۔ ایک بڑی عمر کے سفید پوش آدمی نے قریب ہو کر کہا۔ بیٹا فکر نہ کرو بزرگ ٹھیک ہو جائیں گے۔ آؤ میں تمہیں ہسپتال پہنچا آتا ہوں۔ پہلے تو وہ گم سم کھڑی رہی پھر اُس نے فٹ پاتھ پہ بابا پاؤں رکھ کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا اور اپنا پورا وجود سُرخ فٹ پاتھ پہ کھینچ لیا اُسے یوں لگا جیسے اُسکے سامنے کا لمبا فٹ پاتھ بلند ہو کر ہمالیہ بننے والا ہے لیکن اُس نے فٹ پاتھ پہ تیز تیز چلنا شروع کر دیا شام کے پھیلتے ہوئے اندھیروں میں وہ رات بھر کے سفر کے ارادے سے چلتی رہی تاکہ اُس مقام تک پہنچ جائے جسے سخت چڑھائی کے بعد ہموار اور صاف مقام کہتے ہیں جہاں بیٹھ کر وہ فتح مندی اور سکون سے نیچے دیکھ سکے۔

☆☆☆☆☆

بدگمانی کے منڈیر تلے

حیدر علی کو اپنے نئے مکان میں آئے ہفتہ دس دن بھی نہیں ہوئے تھے جب اس قضیئے کی ابتدا ہوئی - یہاں آنے سے پہلے وہ کرایہ کے ایک چھوٹے سے بدنما مکان میں رہتا تھا - مکان کے ساتھ ساتھ مالک مکان بھی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا مگر رہنے کی مجبوری تھی کیوں کہ اتنے کم کرایہ میں اسے کوئی بھی دوسرا مکان دینے کو تیار نہ ہوتا - اپنے ذاتی گھر کی خواہش بچپن ہی سے اس کے دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی مگر کمزور مالی حالت نے اسے کبھی اس کی اجازت نہیں دی تھی - تاہم اس کے باوجود اس کی زندگی کافی سکون سے گزر رہی تھی اور اس کا سبب اس کے خانگی حالات تھے جو خاموش جھیل کی مانند پرسکون اور ارتعاش سے خالی تھے - گھر میں سکون و آرام کے لئے جن لوازمات کی صرورت ہوتی ہے تقریباً" سب اسے میسر تھے - اس کی بیوی شازیہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی تھی اور خاوند کو خوش اور مطمئن رکھنے کے گر جانتی تھی چانچہ باہر کے کٹھن حالات ان کے خانگی اطمینان اور سکون کو برباد نہ کر سکے - اس کے مشاغل بھی محدود تھے؛ صبح دکان پر چلا جاتا اور شام کو واپس آنے کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزارتا اور یوں زندگی کا ایک دن کٹ جاتا - اب تو وہ چالیس سال سے اوپر کا ہو چکا تھا اور اس کے آنگن میں چار پھول جیسے بچے بھی کھیل رہے تھے - قصبے میں اس کی چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی جو اس کی حد درجہ شرافت اور خوش اخلاقی کے باعث خوب چل رہی تھی - اپنی انتھک محنت اور بیوی کی سلیقہ شعاری کی بدولت وہ اتنا کچھ پس انداز کر چکا تھا جس پر زمین خرید کر چھوٹا سا مکان تعمیر کیا جا سکے - قصبے کے حدود کے اندر زمین

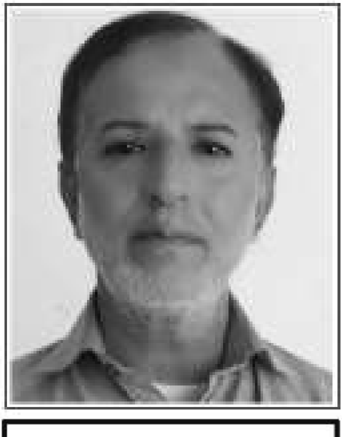

نور کمال شاہ

خریدنا تو مشکل تھا کیوں کہ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں البتہ قصبے سے باہر کچھ فاصلے پر قیمت تقریباً آدھی رہ جاتی تھی، وہاں کم آمدنی والے افراد پلاٹ خرید سکتے تھے- حیدر علی نے بھی ایسا ہی کیا اور ایک مناسب جگہ پر پانچ مرلے کا چھوٹا سا پلاٹ خرید لیا اور تعمیر کا آغاز بھی کر دیا- کچھ نقد رقم پاس تھی، کچھ دکانداروں سے سیمنٹ، سریا وغیرہ قسطوں پر دینے کی بات ہوئی اور یوں کام چل نکلا- کوئی نقشے کے مطابق عالی شان بنگلہ بنوانا تو تھا نہیں، بس عام سا گھر بنانا تھا اور وہ بھی فقط تین کمرے کا؛ اس لئے بے تحاشا خرچے کا امکان نہیں تھا؛ دوم، وہ مسلسل کام نہیں کروا رہا تھا بلکہ ایک خاص حد تک پہنچا کر کام بند کر دیتا اور پھر جب اس کے پاس تھوڑی سی رقم جمع ہو جاتی تو چار چھے ماہ بعد دوبارہ آغاز کر دیتا اس طرح ڈھائی تین سال میں مکان بن کر تیار ہوا- پلاٹ کی لمبائی زیادہ تھی اور چوڑائی کم اس لئے سامنے دو کمرے بن سکتے تھے اور اسے گھر میں تین کمروں کی ضرورت تھی، دو اپنے اور بچوں کے لئے اور ایک کمرہ مہمانوں کے لئے چنانچہ اس نے ایک کمرہ دوسری طرف ان دو کمروں کے عین سامنے گیٹ کی جانب بنایا تا کہ گھر کے استعمال کے ساتھ ساتھ اسے بوقت ضرورت مہمانوں کے لئے بیٹھک کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکے- اس کمرے میں دو دروازے بنائے گئے، ایک گھر کی چار دیواری کے اندر کھلتا تھا جبکہ دوسرا گھر کے باہر گلی کی جانب- دونوں طرف کے کمروں کے درمیانی حصے میں چھوٹا سا صحن بن گیا جس میں کیاریاں بنا کر مالٹے، امرود اور خوبانی کے چند پھلدار پودے لگانے کے ساتھ ساتھ کچھ پھولدار پودے بھی لگا دیئے گئے اور یوں مکان زیادہ خوشنما نظر آنے لگا- ابھی تھوڑا بہت کام باقی تھا مگر حیدر علی نے اس کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا بلکہ اس سے پہلے ہی نئے مکان میں اٹھ آیا کہ باقی کام ہوتے رہیں گے-

حیدر علی نے جہاں پر مکان بنایا تھا وہاں پہلے ہی سے تین چار گھر بن چکے تھے اور اس میں لوگ رہنا شروع ہو گئے تھے- یہ جگہ مرکزی قصبے سے تقریباً پانچ سو میٹر دور شمال کی جانب واقع تھی- آمدورفت کے لئے کھیتوں کے درمیان میں سے کچا راستہ بنا ہوا تھا- لہلہاتے سرسبز کھیتوں کے بیچ میں گزرتا رستہ طبیعت کو سرور بخشتا تھا- یہی راستہ ان مکانات کے سامنے سے گزرتا تھا اور دور پہاڑوں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا- اسی راستے پر قصبے کے مکین اپنے کھیتوں تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ مویشیوں کو چرانے

پہاڑوں کی جانب جاتے تھے اور اسی پر ان کی واپسی ہوتی۔

نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد حیدر علی کے خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس کے خوابوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ اس کی بیوی بھی بہت خوش تھی کیوں کہ اس کو شائد اس کی صبر کا پھل مل رہا تھا اور ویسے وہ تھی بھی بہت صابر و شاکر عورت؛ اللہ کا شکر بجا لانے لگی مگر بد قسمتی سے یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور ایک مہینے کے اندر یہ خوشی پریشانی، دکھ اور ناامیدی میں بدلنے لگی۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک صبح حیدر علی اپنے مکان کے بیٹھک نما کمرے میں سامان ترتیب دے رہا تھا اور وہاں نصب کھڑکی سے، جو گلی کے جانب کھلتی تھی، باہر کا نظارہ دیکھ رہا تھا کہ اس نے وہ منظر دیکھ لیا جو اسے نہیں دیکھنا چاہیئے تھا۔ ایک نوعمر جوان گلی میں منڈلا رہا تھا۔ دس پندرہ قدم آگے جا کر واپس مڑتا اور دوبارہ ٹہلتے ہوئے پہلے والے مقام تک آجاتا۔ سات آٹھ منٹ تک یہ تماشا جاری رہا، اس کے بعد وہ ان کے مکان کے سامنے سے گزر کر آگے دوسرے مکانات کی طرف بڑھا۔ اسے اس کی چال کچھ مشکوک سی لگی تو کھڑکی کے ایک طرف چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ کھڑکی گلی کے مقابلے میں خاصی اونچائی پر تھی اور راستہ نیچے تھا اس لئے نیچے سے کوئی اسے آسانی سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چند ثانئے بعد سامنے والے مکان سے اٹھارہ بیس سال کی ایک لڑکی نکلی؛ چادر میں لپٹی ہوئی اور سر پہ کوڑے کی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھی۔ لڑکی آگے بڑھی اور لڑکے کے قریب سے گزرتے ہوئے لمحہ بھر کو رکی اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ لڑکا کچھ گھبرایا ہوا تھا مگر اس کے باوجود ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ لڑکی کی جانب بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اس کا ہاتھ لڑکی کے بازو پر پھسلنے لگا اور چند ثانئے بعد اس کے ہاتھ لڑکی کے سینے کے ابھار کو ناپنے لگے اور رخساروں کی تپش کو اپنے اندر منتقل کرتے رہے؛ لڑکی گھبراہٹ کے باوجود مسکرانے لگی مگر جلدی ہی لڑکے کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئی اور کچھ آگے جا کر ایک طرف کوڑے کی ڈھیر پر ٹوکری الٹ دی اور واپس لڑکے کی جانب آنے لگی۔ لڑکا ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ ابھی بہت سویرا تھا اور مکین گھروں کے اندر ہی تھے۔ اور راستہ سنسان تھا۔ کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس دفعہ لڑکے کی گھبراہٹ کم ہوگئی تھی۔ پاس سے گزرتی لڑکی کو اس نے پکڑ لیا؛ لڑکی نے بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ لڑکے کے ہونٹ لڑکی کے گال سے جا لگے اور جواباً

لڑکی کے ہاتھ لڑکے کے کندھوں پر جا ٹکے۔ دو تین منٹ تک وہ ایک دوسرے کے ساتھ چھٹ کر مستیاں کرتے رہے پھر لڑکی نے جلدی سے خود کو لڑکے کے بازوؤں کے حصار سے نکالا اور ٹوکری سنبھال کے جلدی سے اپنے گھر میں داخل ہوگئی۔

حیدر علی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس کے جسم سے ہلکا ہلکا پسینہ نکلنے لگا۔ جدید ترقی یافتہ تہذیب میں شائد یہ کوئی اتنا بڑا اور ناقابل معافی جرم نہیں تھا۔ مگر دیہاتی اور پختون معاشرے میں یہ ایک قبیح اور ناقابل برداشت حرکت تھی۔ علاوہ ازیں حیدر علی ایک غیرت مند انسان تھے اس لئے اسے بات بہت بڑی لگی۔ اس نے اس قسم کا واقعہ پہلی بار دیکھا تھا اگرچہ دوستوں سے سنا بہت کچھ تھا اور فلموں میں بھی اس نے اس قسم کے سین دیکھے تھے۔ مگر عملی طور پر پہلی بار یہ نظارہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور ساتھ ہی گھبرایا بھی۔ اصل میں حیدر علی سیدھا سادہ اور بے ضرر انسان تھا؛ اپنے کام سے کام رکھنا اور دیگر امور سے لاتعلق رہنا اس کی خوبی تھی اس لئے اس قسم کے واقعات سے وہ لاعلم ہی رہتا۔ اس نے اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کیا، بیوی کو بھی کچھ نہیں بتایا مگر وہ اس واقعے کو بھلا نہ سکا۔ ہر وقت یہی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ اس کے بعد کئی بار اس نے لڑکی کو اس جوان کے بازوؤں میں جھولتے دیکھا، کئی بار جوان کو اس گھر کے اندر گھستے بھی دیکھا۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ یہ کوئی ایک لڑکی نہیں بلکہ ارد گرد کی دو تین لڑکیاں اس قسم کے حرکات میں ملوث ہیں۔ دکان کو جاتے یا واپس آتے ہوئے قصبے میں بھی اس قسم کے نظارے اسے دیکھنے کو ملتے۔ اس سے پہلے اس قسم کے واقعات شائد نہیں ہو رہے تھے یا حیدر علی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ اب حیدر علی ان لوگوں کی تاک میں رہتا مگر اس نے کبھی ان کے معاملے میں دخل دینے کی کوشش نہیں کی؛ البتہ اس کا رویہ بالکل تبدیل ہو کر رہ گیا۔ گھر میں بیوی کے ساتھ اس کا سلوک نہایت دوستانہ اور مہربانی کا تھا مگر اس واقعے کے بعد وہ اپنا وہی رویہ برقرار نہ رکھ سکا۔ اکھڑا اکھڑا سا اور بے زار رہنے لگا۔ پہلے والی گرم جوشی جاتی رہی اور اس تبدیلی کو اس کی بیوی نے بھی محسوس کیا۔ مگر اس نے اس موقع پر کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور انجان بنی رہی۔ حیدر علی کے دل میں شک کے پودے نے جڑیں پکڑ لی تھیں۔ عورتوں کے متعلق اس کے خیالات بدل چکے تھے۔ بدگمانی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی جس نے بے سکونی اور بے اطمینانی کو

جنم لیا تھا۔ اسے اپنی بیوی پر بھی شک ہونے لگا تھا۔ دروازے کے پاس کیوں کھڑی تھی، بج کے کیوں بیٹھی ہے، کوٹھے کے اوپر چھت پر کیا کرنے گئی تھی؛ یہ سب سوالات اسے پریشان کر رہے تھے۔

انہی دنوں ایک رات کو اچانک اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کی بیوی آہستہ سے اپنے چارپائی سے اٹھ کر بغیر کوئی آواز پیدا کئے دوسرے طرف والے کمرے کی جانب بڑھ رہی ہے۔ خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی مگر اس نے اپنی چارپائی سے اٹھنے کی بالکل کوشش نہیں کی اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ سو رہا ہے مگر نیند اب کہاں؛ طرح طرح کے بھیانک خیالات اس کے دماغ میں چکر کھانے لگے۔ کیا شازیہ بھی ایسی ہے؛ کیا وہ بھی کسی کے بازوؤں میں جھولنے نکلی ہے؛ کیا وہ بھی کسی غیر مرد کی پیاسی ہے؛ کیا وہ بھی بے وفائی کے راستے پر چل نکلی ہے؛ سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد بیوی واپس لوٹی اور خاموشی سے اپنے چارپائی پر دراز ہو گئی۔ طرح طرح کے خدشات اور قسم قسم کے تردوات حیدر علی کے دماغ میں گھومنے لگے۔ اگلی چند راتوں میں اس قسم کے کئی واقعات پیش آئے۔ حیدر علی کے دن کا چین اور رات کا سکون جاتا رہا۔ قصبے میں چھوٹی سی کریانے کی دوکان تھی جس پر زندگی کا دارومدار تھا؛ اب دوکان جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ دیر سے دکان کھولتا اور اکثر وقت سے پہلے اسے بند کر دیتا۔ دلچسپی ختم ہونے سے کاروبار بھی متاثر ہونے لگا۔ وہ چارپائی پر پڑا بیوی کے حرکات و سکنات نوٹ کرتا۔ وہ دیکھتا کہ اس کی بیوی آج شادی کے بیس سال بعد بھی کافی پرکشش ہے۔ اس کے لانبے سیاہ چمکدار بال آج بھی اس کے کمر اور کاندھوں پر بل کھاتے اور لہراتے ہیں۔ وہ دیکھتا کہ اس کے سرخ و سفید گالوں کی سرخی آج بھی برقرار ہے۔ وہ نوٹ کرتا کہ اس کی چال آج بھی مستانی ہے۔ بھاگتے وقت کی دھول نے اس کی گلاب جوانی کو کملایا نہیں ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی چال ڈھال میں زیادہ نکھار اور وقار پیدا ہو چکا ہے۔ وہ آج بھی پہلے سے بڑھ کر جاذب نظر ہے اور نظریں اپنی جانب مائل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سرخ لباس میں آج بھی اس پر حوروں کا گمان ہوتا ہے۔

سوچوں اور تفکرات کے سمندر میں غرق وہ مختلف منصوبے سوچتا رہا۔ غور کرتا رہا مگر وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ ایک دن قصبے سے شام کو آتے ہوئے اپنے ایک دوست سے پستول مانگ کر لے آیا اور اس

کا چیمبر گولیوں سے بھر دیا- دوست کو اس نے صرف یہی بتایا کہ یار! خشک ویرانے میں رہتا ہوں؛ اپنی حفاظت کے لئے پستول کی ضرورت پڑ سکتی ہے- یہی پستول رات کو اس کے سرہانے تکیے کے نیچے پڑا رہتا- شازیہ یہ سب کچھ دیکھتی رہی اگرچہ حیدر علی نے پستول اس سے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر شازیہ نے اسے دیکھ لیا تھا- حیدر علی نے ویرانے اور غیر آباد جگہ کا بہانہ بنا کر اسے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی- شازیہ کا رات کے آخری پہر اٹھنے کا معمول جاری رہا- حیدر علی نے بھی اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی- شائد وہ اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا- وہ مناسب موقعے کا انتظار کرتا رہا اور بالآخر ایک رات جب اس کا غصہ اور قہر اپنی انتہا کو چھو رہا تھا؛ وہ ایک فیصلے تک پہنچا- شازیہ آج بھی بستر سے اٹھ کر جا چکی تھی- چند لمحے انتظار کرنے کے بعد وہ خاموشی سے اٹھا اور اس کے تعاقب میں نیچے والے کمرے تک پہنچا- اس کا پورا جسم لرز رہا تھا شائد زیادہ غصے سے اور یا شائد خوف سے- خاموش اور پرسکون فضا؛ دور قصبے سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں- حیدر علی دبے پاؤں کمرے کے دروازے تک پہنچا جو وہاں سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر تھا- لوڈ پستول اس کے ہاتھ میں موجود تھا- کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اس نے دروازے کے قریب کان لا کر آہٹ سننے کی کوشش کی- اس کے حیرت کی انتہا نہیں رہی- بہت ہی آہستہ آواز میں سسکیوں کی آواز اس کے کان میں پڑی- اندر کوئی رو رہا تھا اور ہچکیوں کی آواز آ رہی تھی- اگلے ہی لمحے اس نے پوری طاقت کے ساتھ دروازہ پرے دھکیلا- کنڈی نہیں لگی تھی؛ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا، ساتھ ہی کتے اور زور سے بھونکنے لگے- اندر کا منظر اس کے لئے حیران کن تھا- شازیہ مصلے پر سجدے میں پڑی بلک رہی تھی اور ہچکیاں لینے سے اس کا بدن ہچکولے کھا رہا تھا وہ اللہ کے حضور سربسجود تھی- وہ رات کے پچھلے پہر تہجد پڑھنے اٹھا کرتی تھی مگر حیدر علی اس سے لاعلم تھا-

پستول حیدر علی کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا- اسے غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا- اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے- اس نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر شازیہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا جو سجدے سے اٹھ چکی تھی- ساتھ ہی دونوں رونے لگے- وہ مصلے پر بیٹھی شازیہ کو چوم رہا تھا اور آنسو اس کے رخساروں کو دھو رہے تھے-

☆☆☆☆☆

صراطِ مستقیم

نائیلہ الیاس

فطرت اتنی بے رحمی سے مجھ پر وار کرے گی، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ دنیا مجھے ایک مضبوط با کردار اور ایماندار انسان کے طور پر جانتی تھی۔ لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگ ضرور مجھے جانتے تھے۔ قانون کے شعبے میں میری ایک منفرد پہچان تھی۔ حق اور سچ کے لیے لڑنا، بے باک اور نڈر انداز مجھے دیگر ہم عصروں سے ممتاز کرتا تھا اور میرا نام بھی ممتاز احمد خان تھا۔

پنجاب کے روایتی پنجابی زمیندار گھرانے کا اکلوتا چشم و چراغ ہونے کے باوجود میں نے کبھی روایتی زمینداروں والے رویے کو نہیں اپنایا۔ شاید یہ میرے والدِ مرحوم کی نصیحتوں اور تربیت کا بھی اثر تھا۔ جنہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے مجھے ایک نصیحت کی تھی کہ بیٹا! یاد رکھنا زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے یا اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے تمہیں ہمیشہ دو راستے ملیں گے، ایک راستہ بظاہر پرکشش اور آسان ہوگا، دوسرا راستہ مشکل اور دشوار ہوگا، مگر یاد رکھنا اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے آسان اور بظاہر خوبصورت نظر آنے والے راستے پر قدم نہ رکھنا کیونکہ یہ راستہ گناہ کا راستہ ہوگا اور دوسرا راستہ جو کہ شروع میں دشوار گزار اور کٹھن محسوس ہوگا، سیدھا راستہ ہوگا۔ یاد رکھو ہمیشہ سیدھے راستے کا انتخاب کرنا کیونکہ یہ راستہ ہی در حقیقت آسان راستہ ہوتا ہے۔ جس پر چل کر نہ صرف تمہاری منزل بھی تمہیں ملے گی بلکہ خدا کی رضا اور دل کا سکون بھی حاصل ہوگا جبکہ برائی کے راستے پر چل کر دنیا و آخرت کی تباہی اور ضمیر کی بے چینی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ والد محترم کی یہ نصیحت میں نے پلے باندھ لی تھی۔ چونکہ بیک گراؤنڈ مضبوط تھا، کسی قسم کی مالی تنگی بھی نہ تھی۔ حق گوئی اور راست بازی خون میں شامل تھی۔ اپنی خداداد صلاحیتوں اور اپنے پیشے سے جنون کی حد تک عشق نے جلد ہی مجھے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

میرے دن رات میرے نہ رہے۔ مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں کہ خود اپنے لیے ایک لمحہ بھی نکالنا دشوار ہو گیا۔ انہی شب و روز کے درمیان گاؤں سے والد صاحب کا پیغام ملا کہ والدہ صاحبہ شدید علیل ہیں اور مجھے بہت یاد کر رہی ہیں۔ ایک لمحے کے لیے دل جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ میں نے کیا کیا۔ اتنی مصروفیات پیدا کر لیں کہ پیدا کرنے والی ماں کو ہی بھول بیٹھا۔ اگلی ہی صبح میں اپنی

ماں کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ماں کے چہرے پر جو خوشی اور رونق تھی وہ دیکھ کر میرا دل بھی سچی خوشی سے بھر گیا۔ حویلی میں جشن کا سا سماں تھا۔ رشتے داروں اور ملنے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اچانک محسوس ہوا کہ اس ہجوم میں دو آنکھیں ہر جگہ میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ تیز سرمئی آنکھیں۔ وہ آنکھیں اس قدر خوبصورت تھیں کہ باقی چہرہ دیکھنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ کوئی غیر نہیں میرے پیارے ماموں چوہدری بشیر کی بیٹی تھی اور ہم دونوں کو بچپن ہی سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ ان آنکھوں کی اپنی ہی بولی تھی۔ ایک الگ ہی زبان تھی، کاجل سے بے نیاز اس قدر حسین آنکھیں میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ خیر میں جو محبت جیسے جذبے سے آج تک ناآشنا ہی تھا۔ اب اچانک ہی محبت اپنے سارے معصوم اور پاکیزہ رنگوں کے ساتھ مجھ پر آشکار ہو گئی تھی۔ ہر رنگ کا اپنا ہی حسن تھا جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ خیر اب وقت آ گیا تھا کہ میں اپنے والدین کی زندگی بھر کی محبتوں اور شفقتوں کے بدلے ان کی جھولی میں ایک چھوٹی سی خوشی ڈال سکوں۔

”شاہدہ کی اور میری شادی روایتی تام جھام اور دھوم دھڑکے کے ساتھ ہوئی۔ شاہدہ کی بے لوث محبت، خود سپردگی اور خدمت گزاری نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ شادی کے بعد ایک ماہ کیسے گزر گیا اس کا احساس تک نہ ہوا۔

دن رات میں اور رات دن میں کب ڈھلتے، کچھ احساس نہ ہوتا۔ دن رات شاہدہ کی گھنی زلفوں کی چھاؤں اور ریشمی بانہوں میں گزر جاتے۔ آخرکار شہر سے بار بار آفس کے لوگوں سے تنگ آ کر مجھے رخت سفر باندھنا پڑا۔

شاہدہ تو گاؤں ہی میں رہ کر ماں جی اور بابا کی خدمت کرنا چاہتی تھی مگر بابا نے سختی سے انکار کر دیا اور شاہدہ کو بھی میرے ساتھ جانے کا حکم دیا۔

مگر بابا آپ لوگ بالکل اکیلے ہو جائیں گے...... میں اب آپ کو مزید اکیلا نہیں رہنے دوں گا۔ اگر آپ شاہدہ کو میرے ساتھ بھیجنے پر بضد ہیں تو پھر آپ دونوں بھی میرے ساتھ چلیں گے۔ ہم سب اکٹھے رہیں گے...... پلیز بابا۔

یہ تو ممکن نہیں ہے پتر، مگر تو فکر مت کر جیسے ہی مجھے دادا بننے کی خوشخبری ملے گی دوڑا چلا آؤں گا، شاہدہ نے شرما کر سر جھکا لیا اور میں بھی مسکرانے لگا۔

دوسرے دن صبح ہم شہر کے لیے روانہ ہونے والے تھے، اماں اور بابا اپنی اداسی کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے...... کہ اچانک ہی ایک بھونچال سا آ گیا۔

ڈیڈی، انکل، انکل...... ایک تیز آواز

کمرے میں گونجی اور میں ایک جھٹکے سے ماضی سے حال میں آ گیا، ثناء ہاتھ میں چائے کا مگ پکڑے سامنے کھڑی تھی- کیا بات ہے انکل جی، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے- کہاں کھوئے ہوئے ہیں...... آں ہاں میں ہڑ بڑا کر رہ گیا......

ثناء میرے سامنے پڑے کشن پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور گہری نظروں سے مجھے گھورنے لگی...... یکدم ہی میں گھبرا گیا- مجھے لگا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہے-

بتایئے نا کیا بات ہے، آپ کچھ دنوں سے اس قدر خاموش اور الجھے الجھے سے دکھائی دے رہے ہیں Is everything allright...... سب ٹھیک تو ہے ناں......

یہ کہتے کہتے ثناء نے حسب اجازت میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی، میں نے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا-

نہیں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں- مجھے اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی-

"نہیں بالکل نہیں، کچھ نہ کچھ تو بات ضرور ہے، آپ بالکل بدلے بدلے لگ رہے ہیں...... میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا-

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی- میں واقعی بدل گیا تھا- میں اس کو کیسے بتاتا کہ جس انسان کو وہ اپنا ڈیڈی انکل کہتی ہے جس انسان کو وہ دنیا کا سب سے نیک اور معصوم انسان سمجھتی ہے- ایک گریٹ مین کہتی ہے وہ گریٹ انسان عظمت کی بلندیوں سے گر کر پستی کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا- مجھے خود سے کراہت محسوس ہو رہی تھی- گھن آ رہی تھی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں، میں...... اس گھٹیا انداز میں بھی سوچ سکتا تھا- کاش کاش ایسا نہ ہوا ہوتا میں ساری زندگی ایک خود فریبی میں مبتلا رہتا، کم از کم ضمیر کی چبھن سے تو محفوظ رہتا- سوچوں میں گم، ثناء نے پھر مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کی I said- tell me whats wrong with you.

یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر ثناء نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی- اس بار میں نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا- وہ ہکا بکا ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی- پھر روہانسی آواز میں بولی-

کیا ہوا ڈیڈی انکل، کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے- کیا آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے- پلیز بتایئے ناں، پلیز-

"میں نے کہا نا میں بالکل ٹھیک ہوں، پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو-" "مگر...... اس نے کچھ کہنا چاہا......"

Just leave me alone. میں نے قدرے سختی سے کہا اور وہ منہ بسورتی ہوئی باہر نکل گئی"- میں بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا، میں جانتا تھا، اس کی کوئی غلطی نہیں تھی، وہ تو معصوم تھی، گناہ گار تو میں تھا، خطا

کارتو میں تھا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس ذہنی کشمکش سے کیسے چھٹکارہ حاصل کروں۔
صراط مستقیم پر چلنے والے کبھی نامراد نہیں رہتے، سیدھے راستے پر چلنے والوں کو کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا“ بابا کی تصویر پر نظر پڑی تو ان کی آواز کانوں میں گونجنے لگی، سوچیں ایک بار پھر ماضی کی جانب سفر کرنے لگیں۔
گاڑی تیار کھڑی تھی میں بابا سے گلے ملا، ماں بار بار مجھے گلے لگاتی، کبھی ماتھا چومتی، اسی وقت لوگوں کے شور شرابے نے ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔
بابا نے اشارہ کیا اور ماں جی شاہدہ کو لے کر اندر چلی گئیں اسی وقت ہمارے منشی کریم چاچا گاؤں سے دس، بارہ معزز لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ سب لوگ اونچی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ منشی چاچا انہیں خاموش ہونے کے لیے کہہ رہے تھے مگر لگتا تھا کہ سب لوگ شدید قسم کے غم و غصہ کا شکار تھے۔ خیر اسی وقت بابا کی گرجدار آواز گونجی اور سب لوگوں کو یک دم ہی جیسے سانپ سونگھ گیا۔
”کیا بات ہے منشی، خیریت تو ہے“ ”یہ کیا صبح صبح اودھم مچا رکھا ہے۔“ ”کونسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے، تم لوگوں پر“
قیامت ہی تو ٹوٹی ہے ہم پر...... کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے قیامت ہی آ گئی ہوتی تو اچھا تھا سرکار۔
یہ گاؤں کے اکلوتے پرائمری سکول ٹیچر سجاد بخش کی آواز تھی، اس کی حالت خاصی بری محسوس ہو رہی تھی اور رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔
”آخر ہوا کیا ہے، کچھ بتا؟ گے بھی......“ میں نے پوچھا۔
”یہ پوچھیے کہ کیا نہیں ہوا، ہمیں تو بتاتے بھی شرم آتی ہے“
اور اس ملعون مولوی کو اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے عشق لڑاتے ہوئے شرم نہ آئی۔
یہ نوجوان آڑھتی اشفاق کی جوشیلی آواز تھی۔
بابا نے چونک کر حیرت سے منشی کی جانب دیکھا، منشی نے اور دیگر لوگوں نے جو واقعہ سنایا اس نے بابا سمیت مجھے بھی حیران پریشان ہونے پر مجبور کر دیا۔ قصہ یہ تھا کہ گاؤں کے سرکاری مسجد کے پیش امام عبدالرحیم کی اہلیہ کا دو سال پیشتر انتقال ہو گیا تھا۔ امام صاحب تجرد کی زندگی گزار رہے تھے۔
عمر کی 55 بہاریں دیکھ چکے تھے، پچھلے کچھ دنوں سے ماسٹر صاحب کا 4 سال کا بیٹا بیمار تھا اور ان کی اٹھارہ سالہ نوجوان بیٹی شگفتہ چھوٹے بھائی کو دم کروانے مولوی صاحب کے پاس لے جاتی تھی۔
کل شگفتہ حسب معمول چھوٹے بھائی کو دم کروانے گئی تو مولوی صاحب نے اس کو اپنے حجرہ خاص میں بلا لیا اور شگفتہ سے

دست درازی کی کوشش کی، شگفتہ کی چیخ و پکار سن کر مدرسے کے بچے اندر آگئے اور شگفتہ روتی ہوئی گھر بھاگ گئی۔

لوگوں نے مولوی صاحب کو گاؤں سے فرار ہوتے ہوئے پکڑ لیا تھا اور خوب اچھی طرح پٹائی کرنے کے بعد منشی کے گھر میں باندھ رکھا تھا اور اب گاؤں کے سربراہ لوگ فیصلے کے لیے بابا کے پاس آئے تھے۔

قصہ مختصر مولوی صاحب کو گاؤں بدر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس معاملے کو نمٹاتے نمٹاتے دن ڈھل گیا اور مجبوراً ہم نے روانگی کا پروگرام دوسرے دن رکھ چھوڑا۔

شام کو بابا کے ساتھ چائے پیتے ہوئے میں نے سوال کیا کہ کیا کوئی انسان اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس حد تک گر سکتا ہے جہاں وہ اچھے برے کی پہچان بھی کھو بیٹھے۔

بابا جان نے ایک گہری سانس لی اور کہا، ہاں میرے بچے یہ فطری تقاضے منہ زور سیلاب کی طرح ہوتے ہیں اور بروقت ان پر بند نہ باندھا جائے تو یہ سب کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔

رشتے ناطوں کا تقدس بھی بھلایا جاسکتا ہے۔ انسانیت، اخلاقیات کیا انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اتنا کمزور بھی ہوسکتا ہے کہ ان معمولی فطری تقاضوں سے شکست کھا جائے؟

نہیں بابا جان، میں نہیں مانتا۔ میں نے بابا کی بات کی نفی کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

بابا جان نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا، چائے کی پیالی سے ایک گھونٹ بھر کر ایک جانب تپائی پر ٹکا دی اور کہا۔

میرے وکیل بچے!

"سنو! میرے وکیل پتر، تم ان فطری تقاضوں کو کمزور اور حقیر کہتے ہو، یہ تو اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ جب انسان پر حاوی ہو جائیں تو ان کے سامنے انسانیت، اخلاقیات تو کیا رشتے ناطے تک حقیر تنکے کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ان نفسانی حملوں سے بچنے کی پناہ تو ہمارے پیغمبر اور اولیاء کرام نے بھی کی ہے، پھر بھلا ہماری کیا حیثیت ہے۔

"مگر بابا ہم انسان ہیں...... ہمیں مضبوط ہونا چاہیے۔"

بے شک ہونا چاہیے مگر پھر بھی ہم ایک کمزور لمحے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اللہ بڑا مہربان ہے اس نے انسان کی اس مشکل کا حل بھی تعلیم فرما دیا ہے۔ اسی لیے نکاح کا حکم دیا گیا ہے۔

اسی لیے اسلام میں بیوہ کے فوری نکاح کی تاکید کی گئی ہے۔

مگر افسوس آج کے ماڈرن دور میں لوگ نکاح سے کتراتے ہیں اور زنا کی طرف جاتے ہیں، اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے

فرمان کی روشنی میں انسان اپنی ضرورت کے مطابق نکاح کا بروقت اہتمام کرے تو اس کو گناہ کی طرف جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس سلسلے میں یہ مت سوچو کہ دنیا کیا کہے گی، لوگ کیا سوچیں گے۔

ارے بھائی یہ دنیا ہے، آپ دنیا کو کیوں دیکھتے ہو، اللہ اور اس کے نبی کو دیکھو، ان کی اطاعت کرو، یاد رکھنا صراط مستقیم ہی ہماری ہر پریشانی کا حل ہے۔

دوسرے دن ماں اور بابا کی دعا؟ں کے سائے میں ہم شہر کے لیے روانہ ہوگئے۔ ایک بار پھر مصروفیات کے سمندر میں غرق ہو کر رہ گیا وقت کا بے رحم پہیہ گھومتا رہا۔

یکے بعد دیگرے ماں اور پھر بابا بھی مجھے چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

میرا شمار اب شہر کے چوٹی کے وکلاء میں ہونے لگا، وکالت کے ساتھ ساتھ میں رفاہ عامہ کے کاموں میں بھی بھرپور حصہ لیتا تھا۔ خاص طور پر خواتین کے حقوق، کم عمری کی شادیاں اور گھریلو تشدد کے موضوعات پر تقریر کرنے کے لیے اکثر سیمینارز سے شرکت کی دعوت ملتی تھی...... شاہدہ کی مجھ سے محبت اور خدمت میں نہ تو کوئی کمی آئی تھی نہ بے زاری تاہم قدرت نے شادی کے دس سال گزرنے کے باوجود ہمیں اولاد کی نعمت سے محروم ہی رکھا تھا، میں یہاں اولاد حاصل کرنے کے جتن اور کوششوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ انگریزی طریقہ علاج سے حکمت تک اور پیروں فقیروں اور تعویز گنڈوں تک ہم نے کوئی در نہ چھوڑا تھا اس کے باوجود بھی ہم ماں اور باپ کہلانے کی سعادت سے محروم ہی رہے تھے، شاہدہ نے ایک بار پھر اپنے خلوص اور وفا کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دی، مگر نہ جانے کیوں میں کبھی بھی شاہدہ پر سوتن لانے کی جرات نہ کر سکا اور صبر کر کے بیٹھ گیا"۔

اور پھر ہماری زندگیوں میں سویرا آ گئی، سویرا 9،10 سال کی بہت ہی پیاری اور معصوم سی بچی تھی۔ وقت کے بے رحم پنجوں نے اس کو ماں باپ کی شفقت سے محروم کر دیا تھا۔

سویرا اکبر علی کی بھانجی تھی۔ اکبر علی محض وفادار ڈرائیور ہی نہیں گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا تھا، سویرا کی ماں سویرا کو جنم دینے کے وقت ڈلیوری میں پیچیدگی کے باعث اپنی ماں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

باپ نے 40 روز مشکل سے گزارے اور دوسری شادی کر لی، معصوم سویا 10 سال سوتیلی ماں کے مظالم برداشت کرتی رہی، پھر شاید قدرت کو اس پر رحم آیا اور اس کا باپ جو کہ ایک الیکٹریشن تھا، ایک دن کھمبے پر کچھ تاریں جوڑتے ہوئے اس کی اپنی زندگی کی تاریں کٹ گئیں، کرنٹ کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ غریب کو دوسری سانس کی مہلت بھی نہ ملی۔ اکبر علی یتیم سویرا کو اپنے گھر لے آیا مگر یہاں بھی اکبر علی کی زبان دراز اور

لڑاکا بیوی نے اس معصوم اور بدنصیب بچی کا جینا حرام کر دیا اور آج پھر اکبر علی پریشان صورت لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔

''اب پھر کوئی نیا جھگڑا ہوا ہے اکبر علی...... شاہدہ نے پوچھا''۔

لڑائی جھگڑے تو روز کا معمول بن چکے ہیں بیگم صاحبہ، مگر اب مسئلہ دوسرا ہے۔

وہ کیا......

وہ جی آپ کو تو پتہ ہے کہ میں نے پچھلے سال دبئی میں ڈرائیور کے لیے فارم بھرا تھا، اب اللہ کے کرم سے میرا ویزہ لگ گیا ہے۔ مسئلہ اب یہ ہے جی کہ میں اس معصوم کو اپنی جلاد بیوی کے حوالے کیسے کروں میرے سامنے اس کا یہ حال ہے میرے بعد تو وہ نہ جانے اس غریب کا کیا حشر کرے گی۔

''ہم مم...... میں نے کھنکھار کر کہا، پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے تمہارے نزدیک''۔

وہ جی میں، میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مناسب سمجھو تو سویرا کو آپ کے پاس چھوڑ جاؤں......

اس کے بعد کے تمام مراحل آسانی سے طے ہو گئے میں نے باقاعدہ تحریری اور قانونی طریقہ کار سے سویرا کو اڈاپٹ کر لیا، ہماری ویران زندگی میں جیسے بہار سی آ گئی۔ سویرا معصوم ہی نہیں بلکہ بے حد ذہین بچی تھی، جلد ہی وہ ہمارے ساتھ گھل مل گئی اور شاہدہ تو اس کو دیکھ دیکھ کر جینے لگی۔ میں بھی شاہدہ کو خوش دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ مگر میرا ہر اطمینان عارضی ثابت ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ سویرا کو پا کر شاہدہ اولاد کا غم بھول گئی ہے مگر یہ شاید میری بھول تھی، شاہدہ سویرا کے آنے سے ظاہری طور پر بہل گئی تھی مگر اولاد کی کمی کا روگ اندر ہی اندر اس کو گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وقت کے پرندے نے ایک بار پھر اڑان بھری اور 12 سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔

سویرا کی 24 ویں سالگرہ کے دوسرے دن کئی مہینوں سے بیمار شاہدہ مجھے چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی 24۔ سالہ رفاقت کا یہ انجام میرے لیے غیر متوقع تھا، دن رات شاہدہ کے بنا کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے۔

24 سال کی سویرا ایک دم سے اپنی عمر سے بڑی دکھائی دینے لگی اب وہ ہر وقت میرے لیے پریشان رہتی، میری ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی، دوستوں نے مجھے دوسری شادی کا بھی مشورہ دیا لیکن میں نہیں کہہ کر ٹال دیتا۔

''آخر کب تک تنہائی کا عذاب جھیلتے رہو گے خان اور دوسری شادی کرنے میں حرج ہی کیا ہے''۔ یہ میرا سب سے بے تکلف دوست امجد تھا۔ امجد ایک مشہور سائیکالوجسٹ تھا اور شاہدہ کے فوت ہونے کے بعد سے دوسری شادی کے لیے راضی کرنے کا اس نے جیسے ٹھیکہ ہی لے لیا تھا۔

''سوری بھائی مجھے معاف ہی رکھو' اور اس عمر میں بھلا میں شادی کرتا کیا اچھا لگوں گا؟

''واٹ یو مین'' اس عمر میں یو آر اونلی 54...... کم آن ڈونٹ بی سلی، 54 سال کی عمر میں تم خود کو بابا آدم کے زمانے کا سمجھ بیٹھے ہو۔ بھائی میں نے تم سے کہیں بڑی عمر کے افراد کو 18، 18 سال کی لڑکیوں سے شادی کرتے بھی دیکھا ہے۔

امجد نے بلا جھجک بولتے ہوئے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔

اور پھر ان شادیوں کا انجام بھی دیکھا ہوگا۔ سوری میں کسی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ میں نے قطعیت سے کہا۔

اوکے، مگر میں نے کب کہا ہے کہ تم کسی کم عمر لڑکی سے شادی کرو۔

تو پھر مسز شیرازی تو تمہارے لیے بہت ہی مناسب پروپوزل ہے۔ بیچاری دس سال سے بیوہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ میری مسز کے ساتھ ان کی دوستی بھی ہے۔ اسی نے مجھے بتایا کہ وہ تمہارے اندر کافی انٹرسٹڈ ہے۔

اوکے اوکے آئی تھنک، اب اس ٹاپک کو کلوز ہونا چاہیے کیونکہ کھانے کا وقت ہوگیا ہے...... میں نے امجد کو ٹالتے ہوئے کہا''۔

ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی، مگر یاد رکھنا فطرت بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ فطری تقاضے بڑے بڑے شہ زوروں کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ امجد نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاہاہا، مائی ڈیئر فرینڈ میں اتنا کمزور بھی نہیں ہوں کہ فطری تقاضے مجھے اتنی آسانی سے زیر کرلیں۔''

امجد سر پکڑ کر رہ گیا۔

پھر بہت جلد امجد کی بات درست ثابت ہوگئی۔

آہستہ آہستہ تنہائی کا احساس شدت سے حملہ آور ہونے لگا، رات کو بستر کا سونا پن مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا، دھیرے دھیرے فطری تقاضے مجھے بری طرح ستاتے۔ 55 سال کی عمر میں شاید آپ کو شریک حیات کی ضرورت نوجوانی سے بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ آج یہ بات بھی سچ ثابت ہوگئی تھی چونکہ جوانی کی تیزی میں تو شاید وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا مگر بڑھاپے میں شریک سفر کے بنا ایک ایک لمحہ قیامت کی طرح گزرتا ہے۔ مجھے ایک عجیب سی خجالت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، یہ ایک ایسی پریشانی تھی جس کو دوستوں کے ساتھ بھی شیئر کرتے جھجک محسوس ہوتی۔ خاص طور پر امجد کو پتہ چلتا تو وہ مجھے ضرور شرمندہ کرتا اور میں اپنی کمزوری کسی پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے خود کو مزید مصروف کرنے کے لیے کوششیں شروع کردیں۔ پارٹیز میں جانا سوشل سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے کے ساتھ ساتھ جم بھی جوائن کرلیا۔

مگر افسوس اندر کا خالی پن ہجوم میں بھی کسی ناگ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا رہتا ہے۔ کبھی کبھی جذبات کسی سرکش گھوڑے کی طرح بے لگام ہوجاتے تو میں سوچتا کہ

جب گھر میں کھانا نہ ملے تو ضرورتاً بازاری کھانے بھی کھانے پڑتے ہیں۔ پھر میں نے خود ہی اپنی اس سوچ پر لعنت بھیج دی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں ممتاز علی خان، کبھی عین شباب میں تو تم نے اس طرح کی مکروہات کے بارے میں سوچا تک نہیں اور اب اس ادھیڑ عمری میں اس طرح سوچ رہا ہوں، نہیں ہرگز نہیں میں کبھی زنا کا راستہ اختیار نہیں کروں گا، میں اتنا کمزور نہیں"۔ میں عبادت کا سہارا لینے لگا، میرا فالتو وقت اب مسجد میں اور مدارس میں گزرنے لگا۔

اب میں خود کو قدرے پرسکون محسوس کرنے لگا۔ میں قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ مگر میرا یہ سکون، اطمینان عارضی ثابت ہوا اس بار میرے نفس نے اس انداز سے سرکشی کی کہ میں خود سے نفرت کرنے لگا۔ میں خود اپنی نظروں میں اجنبی بن کر رہ گیا۔ مجھے لگا کہ آج تک میں جس ممتاز علی خان کو جانتا تھا وہ کوئی اور تھا۔ یہ ممتاز علی خان کوئی اور ہے۔ ایک کمزور، ڈرا ہوا اور بے بس حقیر انسان......

اس دن میں آفس میں اپنے سیکرٹری کو ایک کیس کے سلسلے میں ڈکٹیشن دے رہا تھا۔ جب خلاف معمول مجھے سویرا کی کال آئی۔ ٹرانسپورٹ عملہ کی ہڑتال کے باعث وہ یونی ہی میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ میرا ڈرائیور بھی چھٹی پر تھا اور مجبوراً مجھے ہی سویرا کو پک کرنے کے لیے جانا پڑا۔ مجھے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے جب سویرا تیزی سے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے چلتی ہوئی گاڑی کی جانب بڑھی۔ اس نے نیلی جینز کے ساتھ ہلکا گلابی کرتا پہن رکھا تھا۔ شہد رنگ کے شانوں تک کٹے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ آج پہلی بار میں نے اسے اس انداز سے دیکھا۔ خوبصورت تو وہ تھی ہی مگر اب بے حد بھرپور بھی ہو گئی تھی......

"ہیلو کہاں کھو گئے......" سویرا میرے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آں ہاں، کک کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں" میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں اور دل ہی دل میں لاحول کا ورد شروع کر دیا۔

سویرا میری کیفیت سے بے نیاز بے تکان بولنے لگی، پتہ ہے، ڈیڈی انکل میری کلاس فیلوز کہہ رہی تھیں کہ تمہارے ڈیڈ تو تمہارے ڈیڈ لگتے ہی نہیں۔ آپ کتنے ینگ اور ہینڈسم ہو۔ سویرا اکثر میری تعریفیں کرتی رہتی تھی اور میں مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ مگر آج......آج نہ جانے کیوں اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر ایک انجانا سا احساس ہوا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

زندگی میں یہ پہلی رات تھی جب میں اس قدر پریشان تھا۔ مجھے سخت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی، میرے ضمیر نے مجھے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا تھا اور میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے تھا۔

میرا ضمیر مجھ پر لعنت ملامت کے کوڑے برسا رہا تھا اور میں اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔

کیوں آخر کیوں تم نے اس بچی پر جو تمہیں ڈیڈ کہتی ہے، ایسی غلط نظر ڈالی، جو بچی تمہیں اپنے باپ کی طرح سمجھتی ہے تم نے اس کے بارے اس قدر بے ہودگی سے سوچا، آخر کیوں......؟

"جواب دو، ممتاز علی خان جواب دو"۔ میں نادم تھا، سخت شرمندہ۔

مجھے خود پر شدید غصہ بھی آنے لگا، نہیں نہیں آج کے بعد میں تمہیں سویرا کے بارے اس گھٹیا انداز میں سوچنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ کبھی نہیں، اس کے بعد چند دن خیریت سے گزر گئے۔

میں سویرا کا سامنا کرنے سے گریز کرتا۔ رات کا کھانا بھی اکثر باہر ہی سے کھا کر آجاتا اور صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی آفس کے لیے روانہ ہو جاتا۔

میرے اس بدلے ہوئے رویے کو اس حساس لڑکی نے فوراً محسوس کرلیا اور وہ سمجھی کہ شاید میں اس سے ناراض تھا مگر اسے کیا معلوم کہ میں اس سے نہیں خود اپنے آپ سے ناراض تھا۔

شاہدہ کے بعد ہر اتوار کو سویرا ناشتے کا بھرپور اہتمام کرتی اور میرا پسندیدہ انڈوں کا آملیٹ پراٹھے اور لسی کے ساتھ بادام کا حلوہ بھی بناتی۔

اس دن بھی میرے لاکھ بہانے کرنے کے باوجود سویرا مجھے تقریباً زبردستی ڈائننگ ٹیبل پر لے ہی آئی تھی۔ ناشتے کی میز پر بیٹھا میں بے دلی سے اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔

وہی گھسی پٹی خبریں، بے زار ہو کر میں نے اخبار ایک جانب پھینک دیا، اسی لمحے سویرا ایک ہاتھ میں لسی کا جگ اور دوسرے ہاتھ سے ہاٹ پاٹ سنبھالتی ہوئی تیزی سے ٹیبل کی جانب آئی۔ سویرا ہمیشہ تیز تیز چلنے پر شاہدہ سے ڈانٹ سنتی تھی اور اچانک ہی اس کا پاؤں پھسل گیا، جگ اور ہاٹ پاٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرے اور نہ جانے کس طرح وہ بری طرح لڑکھڑا کر مجھ پر آن گری۔

وہ کچھ اس انداز سے گری کہ اس کے جسم کی حرارت اور سانسوں کی گرمی مجھے اپنی سانسوں میں محسوس ہوئی۔ میں یک دم بوکھلا کر رہ گیا۔ کئی روز سے کی گئی توبہ استغفار ایک لمحے میں دماغ سے دھواں بن کر نکل گئی۔ انسانیت، اخلاقیات اور شرافت کا جنازہ نکلنے کے لیے بے چین تھا۔ اگر کچھ باقی بچا تھا تو وہ تھی صرف جبلت، ایک مرد کی جسمانی اور حیوانی جبلت۔

اب میں نہ تو کسی کا انکل تھا نہ منہ بولا ڈیڈ میں اس لمحے صرف ایک مرد تھا اور سویرا، سویرا صرف ایک عورت، ایسی عورت جس کو چھونے اور حاصل کرنے کی خواہش ہر جذبے پر حاوی ہو گئی تھی۔

میرا دل شدت جذبات سے اتنا تیز دھڑک رہا تھا کہ ایسے لگتا تھا ابھی سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے محسوس ہوئے ضبط کرنے کی کوشش میں پورا بدن پتے کی مانند کانپنے لگا۔

سویرا جواب خود کو سنبھال چکی تھی، پریشان ہو کر میری کیفیت کو دیکھنے لگی، میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سچے دل سے اللہ سے مدد مانگی۔ یا اللہ یا اللہ مجھے بچالے، مجھے بچا لے۔ سامنے دیوار پر خانہ کعبہ کی پینٹنگ آویزاں تھی، میں حرم شریف کا تصور کرتے خدا کے حضور گڑگڑانے لگا۔

کیا ہوا ڈیڈ، آپ ٹھیک تو ہو، مم میں ڈاکٹر کو کال کرتی ہوں، آپ بولتے کیوں نہیں۔

میں نے سویرا کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور چپ کر کے گہری گہری سانسیں لیتا رہا، سویرا دوڑتے ہوئے ڈاکٹر کو کال کرنے چلی گئی، اللہ نے کرم کیا اور جذبات کا طوفان تھم گیا۔

شکر کا مقام تھا کہ سویرا نے میری کیفیت کو طبیعت کی خرابی پر محمول کیا تھا اور میری اندرونی جذباتی کشمکش سے بے خبر رہی۔

امجد کے کلینک میں سر جھکائے کسی مجرم کی طرح بیٹھا میں انتہائی ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔

''اچھا تو یہ بات ہے امجد نے غور سے میری جانب دیکھا......''

میں، میں بہت شرمندہ ہوں امجد......

I am feeling ashamed of my sefl.

مگر کیوں، دیکھو امجد یہ ٹھیک ہے کہ سویرا کو تم نے اڈاپٹ کیا، اس کو اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا، بہت اچھا اور نیک کام کیا، مگر بیٹی کی طرح ہونے اور بیٹی ہونے میں بہت فرق ہے۔

She is not actualy your daughter.

وہ تمہاری سگی بیٹی تو نہیں ہے اور منہ بولی بیٹی سے نکاح کرنا نہ تو غیر قانونی ہے نہ غیر اسلامی فعل ہے۔ مگر غیر انسانی فعل تو ہے۔

وہ کیا سوچے گی، دنیا کیا کہے گی، میں نے کہا۔

دنیا کی پرواہ مت کرو، البتہ سویرا سے بات کرلو اگر وہ مانتی ہے تو دنیا کی ناراضگی کی پرواہ مت کرو۔

سویرا سے بات کرنے کے خیال سے ہی مجھ پر وحشت سوار ہونے لگی۔

ایک جانب میرے اندر کا مرد تھا جو اپنی خواہش کے زیر اثر تھا دوسری جانب ایک انسان تھا جو مشرقی روایات اور احترام کے تقاضے نبھانا چاہتا تھا۔

میں ایک آدمی اور انسان میں تقسیم ہو چکا تھا، کئی روز تک انسان اور آدمی میں جنگ چلتی رہی اور آخر کار میں ایک فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

اس فیصلے تک پہنچنے میں ایک بار پھر میرے

مرحوم والد کی نصیحت کام آئی، جنہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ اپنی جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لیے سیدھے راستے پر چلنا چاہیے اور اس ضمن میں دنیا کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

میں فیصلہ کر چکا تھا، صراط مستقیم پر چلتے ہوئے اپنی خواہش اور ضرورت کو پورا کرنے کا فیصلہ۔

شہر کے سب سے خوبصورت شادی ہال میں میں اپنے سامنے دلہن بنی سویرا کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دلہن کے عروسی لباس میں آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین و معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ میں بے حد خوش تھا۔ سارے انتظامات امجد نے بہت عمدگی سے کیے تھے۔

شادی کے تحفے کے طور پر میں نے سویرا کے لیے اس کی پسند کی گاڑی لی تھی، بس کچھ ہی دیر میں رخصتی کی رسم ہونے والی تھی۔ شہر کی نمایاں اور ممتاز شخصیات کو اس تقریب ولیمہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جہاں ایک جانب میرے مخلص اور ہمدرد دوست احباب میری خوشی میں خوش تھے، وہیں دوسری جانب کچھ بدخواہ میرا مذاق بھی اڑا رہے تھے۔ اڑتی اڑتی کچھ سرگوشیاں میرے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔

''اس عمر میں ممتاز علی خان کو ویسے چونچلے زیب نہیں دیتے، بھلا کیا ضرورت اس تام جھام کی، سادہ سی تقریب نکاح ہی کافی تھی۔''

میں بھی سادگی سے نکاح کے حق میں تھا، مگر سویرا نہ مانی اور اس کی پرزور فرمائش پر ہی مجھے اپنے دعوت ولیمہ کا بھی اہتمام کرنا پڑا۔

انہی خیالات میں غرق تھا کہ امجد نے مجھے ٹہوکا دیا، چلو رخصتی کا وقت ہو گیا ہے۔ سویرا تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

اور اب سویرا دلہن بنی میرے سامنے کھڑی تھی، میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کا ہاتھ ذیشان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جی ہاں سویرا کا نکاح میں نے امجد کے نوجوان اور ہونہار بیٹے ڈاکٹر ذیشان کے ساتھ کر دیا تھا۔ سب کچھ بہت جلدی ہوا تھا۔

اس کے ساتھ ہی بیوہ مسز کامران جو کہ اب مسز ممتاز تھی میرا ہاتھ تھامے کھڑی تھیں اب میں اکیلا نہیں تھا۔ شاہین میری زندگی کے سفر میں میرا ساتھ نبھانے کے لیے بہار بن کر آ گئی تھی۔ سویرا کے اصرار پر ہی میں نے اس کی رخصتی والے دن اپنے ولیمہ کا بھی اہتمام کر ڈالا تھا۔

سویرا رخصت ہو گئی، شاہین میری ویران زندگی میں بہار بن کر آ گئی، میں مسکرا رہا تھا، انسان جیت گیا، انسانیت جیت گئی تھی اور نفسانی خواہش میں مبتلا آدم ہار گیا، میں نے اسے ہرا دیا۔ صراط مستقیم پر چلتے ہوئے میں نے اپنے فطری تقاضے بھی پورے کر دیے تھے اور انسانی تقاضے بھی

☆☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلک کمیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئر مین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیر طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

افضل حسین خاصے متاثر لگتے تھے۔ اسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہنے لگے ''بڑی ہمت کی بات ہے۔ گاؤں میں تو پکڑے جانے کے ڈر سے ہی سارے جذبے سو جاتے ہیں۔ کمال ہے بھئی کمال ہے۔ جس قوم کا ہیرو اس قدر دبنگ تھا وہ قوم کس قدر نڈر ہوگی۔ کمال ہے بھائی کمال ہے۔ سامنے میز پر رجسٹر پڑا تھا۔ عرض کیا آپ چاہیں تو اپنے تاثرات قلمبند کر سکتے ہیں ویسے بہتر ہوگا کہ یہ قصیدہ بائیں ہاتھ سے لکھیں۔

کہنے لگے ''مجھے ابھی یہاں چند دن ٹھہرنا ہے کیوں مروانے پر تلے ہوئے ہو۔''

دوپہر کو بوفے لنچ کے لئے ڈائننگ ہال میں

گئے تو کھانے دیکھ کر طبیعت سیر ہوگئی۔ اس قسم کا بوفے لنچ تو لاس ویگس میں بھی نہیں کھایا تھا۔ بلا مبالغہ کوئی چالیس قسم کے کھانے، سلاد، سویٹ ڈشیں اور ہاٹ اینڈ ساور، چکن کارن، چکن کریم سوپ، ملگوٹی سوپ، سپیشل اور کلیئر سوپ، اسی طرح کھانوں میں پانچ قسم کی تو مچھلی تھی۔ بیکٹی، پرانز، لابسٹر، اوسٹرز، کیوی آبر، مرغ مسلم اور غیر مسلم۔ کئی قسم کے سیکس، جائنٹ مٹن وغیرہ۔ اسی طرح سویٹ ڈشوں کا بھی سلسلہ تھا۔

کھانا کھا کر ہم کمرے میں آئے تو نیند کی یلغار سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اتنا کھانا تو ایک وقت ہی کھایا جاسکتا تھا۔ ہم سو گئے۔

شام کو سمندر کی سیر کے لئے نکلے۔ ساحل پر بے شمار بادبانی کشتیاں راج ہنسوں کی طرح ڈول رہی تھیں۔ لیمپ پوسٹ اور بلند عمارات سے اٹھتی ہوئی روشنیاں سمندر کے سینے میں جذب ہورہی تھیں۔ ہوا تیز تھی۔ ہم نے ایک موٹر لانچ کرائے پر لی اور لمبی سیر کو نکل گئے۔ لانچ کے اندر سنیکس اور ہاٹ اینڈ کولڈ ڈرنکس کا بندوبست تھا۔ ہم نے کافی کا آرڈر دیا کیونکہ کچھ کھانے کی نہ تو گنجائش تھی اور نہ حاجت۔ رات کو ہم واپس آئے تو ڈنر سرو ہورہا تھا۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بابا توبہ کرو'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''ابھی تو لنچ شریف سینے پر مونگ دل رہا ہے۔ شوق میں زیادہ کھانا کھایا ہے صبح تک مشکل سے ہضم ہوگا۔''

ہم باتیں کرتے کرتے مرکزی ہال تک آ گئے۔ الیکٹرانک بورڈ پر تحریر پڑھ کر افضل حسین کے پاؤں رک گئے۔ جلی حروف میں لکھا تھا۔ ہوٹل کیسینو۔

''ہو جائیں چند بازیاں!'' میں نے انہیں چھیڑا۔

ایک لمبی آہ بھر کر بولے ''حسنانہ و برقاب کہاں سے لاؤں۔ زندگی میں صرف یہی شوق پال رکھا ہے۔ شراب میں نہیں پیتا، سیر سپاٹے سے ویسے ہی دل بھر گیا ہے۔ تمباکو نوشی کو گناہ کبیرہ سمجھتا ہوں۔ باقی رہی دوسری بات تو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی ہاں ہی نہ کردے۔''

''آپ کچھ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔'' میں نے انہیں چھیڑا۔

کہنے لگے ''ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ بے وقت کی راگنی اچھی نہیں لگتی۔ کیا تم نے نواب صاحب کا حرام حلال والا لطیفہ نہیں سنا۔''

''لکھنو کے نوابوں اور پنجاب کے جاٹوں کے مزاج میں بعد المشرقین ہے۔ گاؤ تکیوں پر لیٹنے والے جلد ہتھیار پھینک دیتے ہیں، کھیت کھلیانوں میں کام کرنے والے اتنی آسانی سے مات نہیں کھاتے۔''

ہنس کر بولے ''بابا تم تو بال کی کھال اُتارتے ہو۔''

اگلے دن ہم نے سارا شہر دیکھ ڈالا۔ ۱۹۸۴ء کا منیلا آج کے شہر سے مختلف تھا۔ رزال میوزیم کے علاوہ وہ جگہیں دیکھنے والی تھیں۔ صدارتی محل اور

اتحادی فوجوں کا قبرستان۔ وہ عشرت کدہ اور عبرت گاہ ساتھ ساتھ تھیں۔ محل کے اندر جانے کی یہاں بھی ممانعت تھی۔ البتہ ملکہ عالیہ امیلڈا مارکوس کے قصے زبان زد خاص و عام تھے۔ سڈول پنڈلیاں! تین سو جوتے، ہزاروں ملبوسات، ہیرے جواہرات، دنیا بھر کے کلون اور پرفیوم، ہر ماڈل اور رنگ کی گاڑیاں - نوکروں اور نوکرانیوں کی فوج ظفر موج۔ جب بن سنور کر نکلتی تو بوڑھے مارکوس کی رگوں میں خون ٹھاٹھیں مارنے لگتا اور دھڑکتا ہوا دل پسلیوں سے جا ٹکراتا۔ سارے ملک کی دولت لوٹ کر وہ امریکی بینکوں میں لے گیا تھا۔ غالب نے کہا تھا ''ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا۔'' یہاں اس کی کوئی حد نہیں تھی۔ ایک یہ عورت تھی جس کے منہ سے پھلجھڑیاں پھوٹتی تھیں اور دوسری وہ حرماں نصیب اکینو کی بیوہ جس کے آنسو تھمتے نہ تھے۔

قبرستان کے مرکزی دروازے پر لکھا تھا۔ یہاں وہ بہادر اور نڈر جوان دفن ہیں جو فلپائن کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں کام آئے۔

جاپانیوں نے پرل ہاربر کی طرح یہاں بھی شب خون مارا تھا۔ تین لاکھ کی فوج دبے قدموں آئی اور پچاس ہزار مقامی فوج کو بھون ڈالا۔ ڈگلس میک آرتھر آسٹریلیا چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک لشکر جرار اکٹھا کیا اور اپنی شکست اور ہزیمت کا بدلہ لینے واپس آیا۔ اس وقت تک ویسے ہی جاپانیوں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ کیا سوچ کر جرمنی اور جاپان نے ساری دنیا سے ٹکر لی تھی۔ اگر کسی منصوبے سے چلتے تو اپنے اصل دشمنوں کو مات دے سکتے تھے۔ پروپیگنڈا اپنی جگہ لیکن دونوں نے مظالم کی حد کر دی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ شکست کے بعد انہیں سزا دینے کے بجائے اتحادیوں نے انہیں سہارا دیا۔ آج ساری دنیا امریکہ کو مطعون کرتی ہے۔ ایٹم بم چلانا ظلم تھا۔ اگر چاہتا تو ٹوکیو اور برلن پر بھی پھینک سکتا تھا۔ سب کچھ ختم ہو جاتا۔

جب ہم واپس آئے تو ہمارے ساتھ تاسف اور تاریخ تھے۔ اگلا دن اس اعتبار سے اہم تھا کہ رزال پارک میں فرڈینینڈ مارکوس کے خلاف احتجاجی جلسہ تھا۔ میں نے افضل حسین کو شمولیت کی دعوت دی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ بولے ''تم انقلابی انسان ہو۔ میں Status quo کا آدمی ہوں۔ ہم لوگ حکومت وقت کے خلاف مظاہرے نہیں کرتے ۔ ہمارے علاقے میں اگر تھانیدار بھی مرضی کا نہ ہو تو 'وخت' پڑ جاتا ہے۔ ویسے بھی باہر گرمی اور حبس ہے۔ اگر شوق جہاد پورا کرنا ہو تو کر لو۔'' گو انہوں نے یہ سب باتیں ازراہ تفنن کہی تھیں لیکن اس سے فیوڈل مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔

بڑا عجیب منظر تھا۔ بڑا دلکش نظارہ تھا۔ زن و مرد جوق در جوق پارک کی طرف جا رہے تھے۔ سب نے پیلے رنگ کی پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے تو باقاعدہ لباس بھی اس رنگ کا پہن رکھا تھا۔ چار سو مارکوس

اور آمریت کے خلاف نعرے لگ رہے تھے۔
میرے پاس بلو بینڈ تو نہ تھا لیکن پھر بھی جلوس میں شریک ہو گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دس لاکھ آدمی جمع ہو گئے۔ نعروں سے دھرتی ہل رہی تھی۔ منیلا کی عمارتیں لرز رہی تھیں۔ سب کو یقین تھا کہ اس روز کا جلسہ آمریت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں اس تاریخ ساز جلسے کا عینی گواہ تھا۔ میں نے بھی نعرے لگائے۔ ظلم کے خلاف، اگر مسلح جدوجہد نہیں کی جا سکتی تو نفرت کا اظہار تو کیا جا سکتا ہے۔
البتہ ایک بات نے مجھے غمگین کر دیا۔ دس لاکھ آدمیوں کا احتجاج۔ دس سال کا عرصہ اور ایک آمر مطلق۔ کس قدر مہنگا سودا ہے۔ اس جلسے نے امریکہ کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب مہرے بدلنے کا وقت آن پہنچا ہے۔
جب میں جلسے میں شرکت کے بعد ہوٹل پہنچا تو پسینے میں شرابور تھا۔ بش شرٹ جسم کے ساتھ چپک گئی تھی۔ پتلون کی کریز بھی ٹوٹ چکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرا تمازت آفتاب سے سنولا گیا تھا۔ افضل حسین میری ہیئت کذائی دیکھ کر مسکرائے
”کیا مارکوس کو گدی سے اُتار آئے ہو۔“
”بس اب چند دن کی بات ہے۔ آپ جلد خوش خبری سنیں گے۔“
کہنے لگے ”میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ امریکہ کا پٹھو ہے بے دام غلام جتنا ملک میں ظلم ڈھاتا ہے اتنا ہی اُوپر جی حضوریاں بھی کرتا ہے۔ اس کو اُتارنا آسان نہیں امریکہ اس کی مدد کرے گا۔“
”امریکہ اب کچھ نہیں کر سکتا۔ امریکہ کسی پٹھو کو گرا تو سکتا ہے بچا نہیں سکتا۔ آپ دیکھیں گے عنقریب یہ چاروں شانے چت ہوگا۔“
”لگتا ہے گرمی تمہارے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ بہتر ہے ٹھنڈے پانی سے غسل کرو۔“
”غسل تو اب مارکوس کا ہوگا“
بولے ”لگ گئی شرط؟“
”آپ ہمیشہ ہارتے ہیں کبھی تو جیتنا بھی سیکھیں۔“ میں نے مشورہ دیا۔
ہانگ کانگ: کیتھی پیسفک کا جہاز جب ہانگ کانگ پہنچا تو بڑا عجیب لگا۔ سارا شہر پانی اور پہاڑ پر کھڑا تھا۔ مین ہٹن کی طرح ہر طرف فلک بوس عمارتیں تھیں۔ دراصل حیران کن چیز لینڈنگ اسٹرپ تھا۔ جس کے دونوں جانب یہ عمارات تھیں۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس تنگنائے میں جہاز کس طرح اُترے گا۔ ہوائی اڈہ شہر کے بیچوں بیچ تھا۔ اسے پائلٹ کی مہارت کہیں یا ٹیکنالوجی کا کمال جہاز بخیر و عافیت اُتر گیا۔ امیگریشن کاؤنٹر پر انسپکٹر نے تین چیزیں دیکھیں۔ ہمارے چہرے، گرین پاسپورٹ اور ڈیسک کے نیچے پڑی ہوئی سمگلرز کی لسٹ۔
بولا ”منیلا سے ہانگ کانگ کیوں آئے ہو؟“
”سنا ہے یہاں کے لوگ بہت ملنسار ہیں“ میں نے جواب دیا۔
کہنے لگا ”میں کوئی پہیلیاں نہیں بجھوا رہا۔

سیدھا سادا سوال پوچھا ہے۔“
”کم از کم یہ دیکھ لیتے کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں تو شاید یہ سوال پوچھنے کی نوبت نہ آتی۔“
اس نے خشمگیں نظروں سے ہمیں دیکھا اور پاسپورٹ پر مہر لگا دی۔ باہر نکل کر ٹیکسی پکڑی تو ڈرائیور نے پوچھا کہاں چلنا ہے۔ ہم نے کہا کسی مناسب ہوٹل میں لے چلو۔ ”کون سے شہر میں؟“ ہم چکرا گئے۔ اس نے ہماری لاعلمی بھانپتے ہوئے وضاحت کی۔ ”یہاں دو شہر ہیں۔ ہانگ کانگ اور کلون! آپ نے کون سے حصے میں ٹھہرنا ہے؟“
”ہم تو ایک ہی سمجھے تھے“
”دونوں جڑے ہوئے ہیں۔ درمیان میں سمندر ہے لیکن پہلے لوگ کشتیوں میں آتے جاتے تھے۔ اب پل بن گئے ہیں۔ سمندر کے اندر اور اوپر۔
”جو حصہ زیادہ خوبصورت ہے وہاں لے چلو۔“ بھائی افضل حسین نے کہا۔
بولا ”دونوں شہر خوبصورت ہیں۔ اگر ساؤتھ چائنا سی کو انگشتری تصور کر لیا جائے تو یہ اس میں جڑے ہوئے نگینے ہیں۔ برطانیہ نے بڑا سوچ سمجھ کر انہیں آباد کیا تھا۔ یہ چین کی Out post ہے۔ یہاں سے اس دیوہیکل ملک کی نگرانی کی جا سکتی تھی لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ عنقریب یہ شہر اس کی گود میں جا گرے گا۔“
”کیا تم خوش ہو؟“
”ہرگز نہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی اکثریت چین سے الحاق نہیں چاہتی۔ سب شخصی آزادیاں سلب ہو جائیں گی۔ جس دن سے برطانیہ نے دستبرداری کا اعلان کیا ہے یہاں کے تجارتی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ پراپرٹی کی قیمتیں نصف رہ گئی ہیں۔ عمارتیں تو زمیں بوس نہیں ہوئیں لیکن بزنس مینوں کی کمریں دوہری ہو گئی ہیں۔ اکثریت بھاگ کر برطانیہ میں بسنا چاہتی ہے۔“
”لیکن تم جیسے لوگوں کو کیا فرق پڑے گا۔ تم آج بھی ٹیکسی چلاتے ہو الحاق کے بعد بھی سٹیرنگ تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔“ افضل حسین نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔
”بالفرض کمیونسٹ حکومت نے میرے ہاتھ میں کدال پکڑا دی یا جوتے سینے پر لگا دیا تو کیا ہوگا؟ یہی تو اس نظام کی خرابی ہے۔ کما میں رہا ہوں، کھا کوئی اور رہا ہے۔

From each one according to his capacity to everyone according to his needs.

سلوگن تو ضرور سنا ہوگا۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہر شخص کی محنت کے ثمرات اس کے پاس رہیں۔
ڈرائیور نے ہمیں ”ہانگ کانگ“ ہوٹل پر اُتار دیا۔ درمیانہ سا ہوٹل تھا۔ ۱۲۰ ڈالر میں دو کمرے مل گئے۔ ہم تھکے ہوئے تھے، سو گئے۔
شام کے وقت کمرے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو افضل حسین تھے۔ اب

کے انہوں نے نکل[1] سے نہیں بلکہ ہاتھ سے دستک دی تھی کیونکہ ہانگ کانگ میں کوئی کیسینو نہیں ہے۔ لوگ یہ شوق پورا کرنے میکاؤ جاتے ہیں۔ ہے تو وہ بھی چینی علاقہ لیکن وہ پرتگیزیوں کے پاس تھا اور اسے Lasvegas of the east کہا جاتا ہے۔

میں نے کپڑے بدلے اور تیار ہو گیا۔ ہم باہر نکلنے ہی والے تھے کہ اچانک مجھے خیال آیا میرے پرس میں پرویز شاہ کا کارڈ ہے۔ شاہ صاحب ہانگ کانگ میں بزنس کرتے تھے۔ وہ بھی ان گھبرائے ہوئے لوگوں میں شامل تھے جن کا ذکر ٹیکسی ڈرائیور نے کیا تھا۔ میری پاکستان میں ان سے ایک بار ملاقات ہوئی۔ میاں منظور چھرا انہیں میرے پاس لایا تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں اپنے بزنس کا کچھ حصہ پاکستان منتقل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ لاہور سے پشاور تک ایئر کنڈیشنڈ کوچز چلانے کا تھا۔ روٹ تو میں نے دے دیے لیکن ساتھ ہی تنبیہ بھی کی۔ پاکستان میں ٹرانسپورٹ چلانا ہانگ کانگ کے بزنس مین کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس پیشے میں جتنی بسیں ہوں اتنے غنڈے بھی پالنے پڑتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے روزمرہ کا معمول ہیں۔ وہ جاتے ہوئے اپنا پتہ دے گئے۔ میں نے کارڈ احتیاطاً رکھ لیا تھا حالانکہ اس وقت ہانگ کانگ جانے کا سان وگمان تک نہ تھا۔ خوش قسمتی سے پہلی کال پر ہی مل گئے۔ جب میں نے بتایا کہ ہانگ کانگ سے بول رہا ہوں تو بڑے خوش ہوئے اور تھوڑی دیر بعد اپنی کار لے کر آ گئے۔ پہلے تو ناراض ہوئے کہ اپنے آنے کی پیشگی اطلاع کیوں نہ دی۔ وہ ایئرپورٹ پر آ جاتے۔ پھر وعدہ لیا کہ ہم جتنے دن ہانگ کانگ میں ہیں ان کے ذاتی مہمان ہوں گے۔ افضل حسین سے تعارف کرایا تو بولے وہ انہیں غائبانہ جانتے ہیں۔ میاں احمد سعید ان کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ احمد سعید صرف لندن کے کیسینوز کو دیدار نہیں کراتے ہانگ کانگ آ کر باقاعدہ ریسیں بھی کھیلتے ہیں۔

شاہ صاحب نے پہلے تو ہمیں ہانگ کانگ کی سیر کرائی۔ اتنی بلند بالا عمارتیں تو شاید مین ہٹن میں بھی نہیں ہوں گی۔ انہوں نے بتایا کہ جزیرے میں زمین کم ہے اس لئے مجبوراً اونچی عمارات بنانا پڑتی ہیں۔ برطانیہ نے شہر کیا بسایا ہے سونے کی چڑیا پال لی ہے۔ دنیا بھر میں تجارت کے جو چند مراکز ہیں، اس شہر کا شمار ان میں کیا جاتا ہے۔ الیکٹرانکس گڈز، کلاتھ مارکیٹ جہاں برطانیہ کی ہیلڈز سے لیکر چین کے ملک تک ہر قسم کے کپڑے ملتے ہیں۔ اشیائے خورد ونوش کی بہت بڑی منڈی ہے۔ اگرچہ اکثریت چینیوں کی ہے لیکن شہر کاسموپالٹین ہے۔ ہر قوم کا کوئی نہ کوئی فرد یہاں آباد ہے۔ لوکل گورنمنٹ سسٹم ہے۔ برطانیہ اپنا گورنر بھیجتا ہے جو چیف ایگزیکٹو ہے۔

۱- پانچ سینٹ کا امریکی سکہ

تقسیم سے قبل ہندوستان سے خاصی تعداد میں ہندو اور مسلمان روزگار کی تلاش میں یہاں آ گئے تھے۔ مسلمان زیادہ ترقی نہیں کر سکے البتہ ہندوؤں نے ٹھیک طرح سے تجارت شروع کر رکھی ہے۔

ہم کافی دیر تک شہر کی سیر کرتے رہے۔ بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے مین ہٹن میں پھر رہے ہوں۔ چلتے چلتے ایک ریسٹورنٹ کے قریب گاڑی روک لی۔ بتانے لگے کہ یہ ہانگ کانگ کے مشہور ریسٹورنٹس میں سے ایک ہے۔ Gay lords جو ایک ہندو کی ملکیت ہے۔ جس طرح پاکستان میں شیزان کے کھانے مشہور ہیں اسی طرح ہانگ کانگ میں اس کے کھانے لذیذ ہیں۔ گاہکوں کی زیادہ تعداد انگریزوں کی ہے۔ دنیا میں اس کی کئی شاخیں ہیں۔

کھانا واقعی مزیدار تھا۔ ماحول بھی بالکل شیزان والا تھا۔ چکن تکے اور مٹن کباب، ہوٹل کی سپیشلٹی تھی۔ سوپ کی جگہ یخنی سرو کرتے تھے۔ کھانا کھا کر ہم باہر نکلے تو ہم نے اجازت چاہی، کہنے لگے ایک مقام رہ گیا ہے اور وہ ہے پہاڑ کی چوٹی سے شہر کا نظارہ۔ جسے Most beautiful night spot of the world بھی کہا جاتا ہے۔ ہمیں پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے میں گھنٹہ لگ گیا۔ راستہ خاصا تنگ اور دشوار گزار تھا۔ سڑک کے ساتھ ریل کی پٹڑی بھی تھی۔ اتنی بلندی پر عام ٹرین نہ جا سکتی تھی۔ دو پہیوں کے علاوہ تیسرے پہیے کی مدد سے گاڑی دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی اوپر جاتی ہے جسے tooth wheel کہتے ہیں۔ جن لوگوں نے دیہات میں رہٹ چلتے دیکھے ہیں انہیں اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ٹوتھ وہیل گاڑی میں توازن قائم کرتا ہے اور اس کو پیچھے سرکنے سے روکتا ہے۔

شاہ صاحب نے درست کہا تھا۔ ٹاپ سپاٹ پر بڑی بھیڑ تھی۔ لگتا تھا ہانگ کانگ کے سب ٹورسٹ ایک مقام پر جمع ہو گئے ہیں۔ سیاحوں کے کیمرے اس خوبصورت منظر کو اپنے اندر محفوظ کر رہے تھے۔ نیچے دونوں جڑواں شہر، کلون اور ہانگ کانگ جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ رنگا رنگ روشنیاں سمندر کے سینے میں جذب ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان زمین پر اتر آیا ہے یا جھیل نے ستاروں کی شال اوڑھ لی ہے۔ سڑکوں پر چلتی ہوئی گاڑیاں، ماچس کی ڈبیوں کی طرح رینگتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ شاہ صاحب کیمرہ ساتھ لائے تھے۔ ہم نے کئی تصاویر بنائیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر کئی ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے ستانے بیٹھ گئے اور کاپوچینو کافی پی۔

اگلا دن اس اعتبار سے اہم تھا کہ مجھے ہانگ کانگ میں مقیم پاکستانیوں سے ملاقات کرنا تھی۔ پتہ چلا توفیق ہمدانی پاکستان ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ دوہری خوشی ہوئی کہ کوئی ہمدانی دیارِ غیر میں اس قدر مقبول ہے۔ فون پر ان سے ملاقات کے لئے گیارہ بجے کا وقت

طے ہوا۔ افضل حسین آرام کے موڈ میں تھے اس لئے میں اکیلا ہی ملنے چلا گیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھے ان کے دفتر تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو انہوں نے گاڑی بھیج دی۔ ڈرائیور بھی پاکستانی تھا۔ وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ کہنے لگا ”ملاقات تو گیارہ بجے کرنی ہے۔ سوچا لگے ہاتھوں ہانگ کانگ کی مرکزی جامع مسجد دکھلا دوں۔“ مسجد واقعی بڑی تھی اور طرز تعمیر پر بھی خاص توجہ دی گئی تھی۔ یہ مسلمانوں نے چندہ جمع کر کے بنائی تھی۔ پہلے سارے مسلمان ایک جگہ نماز پڑھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ فرقہ واریت کا عفریت وہاں بھی جا پہنچا۔ ایک مرتبہ تو نوبت لڑائی جھگڑے تک آ پہنچی۔ ہانگ کانگ حکومت بروقت قدم نہ اُٹھاتی تو خون خرابے تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ ملک بدری بہت بڑی سزا ہے جو آسانی سے ہضم نہیں ہوتی۔

توفیق صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے ”فون پر آپ نے مجھے دو دفعہ ہمدانی کہا ہے۔ پہلے تو میں اپنے نام کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ میں توفیق ہمدانی نہیں احمدانی ہوں۔ میرا تعلق کراچی سے ہے اور میں یہاں والوں کا کاروبار کرتا ہوں۔“

”کیا اس علاقے میں دالیں بھی پیدا ہوتی ہیں؟“ مجھے حیرانی ہوئی۔

ہنس کر بولے ”اس کی ضرورت نہیں۔ اشیائے خورونوش چاہے دنیا کے کسی کونے میں بھی پیدا ہوں، ٹریڈنگ ہم کرتے ہیں۔ کمپیوٹر، ٹی وی، فرج، کاریں، امریکہ، جاپان اور جرمنی میں بنتی ہیں بکتی ہمارے توسط سے ہیں۔ ریشم چین کی سلک ملیں اُگلتی ہیں بکتا ہانگ کانگ کے بازاروں میں ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ جو سیٹھ آپ کے ملک میں ملیں لگاتے ہیں، وہ سرمایہ کہاں سے لاتے ہیں۔ وہ پیسہ نوردین اور احمد خان کا ہوتا ہے۔ قطرہ قطرہ جب بنکوں میں جمع ہوتا ہے تو دولت کا دریا بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دالیں آسٹریلیا میں پیدا ہوں یا امریکہ میں، سودا ہم کرتے ہیں۔

میں نے پاکستانی کمیونٹی کا ذکر کیا تو اُداس ہو گئے۔ کہنے لگے ”آپ کے پاس وقت نہیں ہے نہیں تو میں آپ کو جیل میں لے جاتا۔ ہانگ کانگ کی جیلیں پاکستانیوں سے بھری پڑی ہیں۔ ایک طویل عرصے سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے آ رہے ہیں لیکن کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کچھ تو ناروا سختیوں کو جھیلتے جھیلتے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔“

”ان کا جرم کیا تھا؟“

”یہی کہ بغیر ویزے کے روزگار کی تلاش میں یہاں آ گئے۔ ایجنٹ نوکری کا چکمہ دے کر سہانے خواب دکھاتے ہیں۔ اکثریت مقامی قوانین سے بے خبر ہوتی ہے۔ آتے ہی پکڑے جاتے ہیں اور بقیہ عمر اپنے آپ کو کوس کوس کر اور آہیں بھر کے گزار دیتے ہیں۔“

”تو آپ لیگل ایڈ کیوں مہیا نہیں کرتے؟“

بولے ”حتی المقدور کرتے ہیں۔ آپ کو علم ہے

کہ یہاں وکلا بھاری فیسیں لیتے ہیں۔ دو چار ہوں تو ٹھیک ہے لیکن جہاں تعداد سینکڑوں میں پہنچ جائے وہاں ہمت جواب دے جاتی ہے۔ پھر اس میں وکیل کس حد تک قانونی موشگافیاں نکال سکتا ہے۔ جب ویزا ہی نہیں ہے تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ اکثر کے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں ہوتا۔ ایجنٹ ایک سبز کاپی تھما دیتا ہے جس پر انٹ شنٹ لکھا ہوتا ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" مجھے واقعی بڑا دکھ ہوا۔

"میرے خیال میں اس معاملے کو حکومتی سطح پر اُٹھانا چاہیے۔ آپ کو چاہیے کہ وطن جا کر ارباب حکومت کی توجہ اس انسانی مسئلے کی طرف دلائیں۔ حکومت پاکستان ہانگ کانگ گورنمنٹ سے بات کرے۔"

"ہمارا سفارت خانہ کیا کر رہا ہے؟"

"کس سفارت خانے کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو جو آزاد پاکستانی ہیں ان سے نہیں ملتے۔ غریب دھکے کھا کر واپس آ جاتے ہیں بالفرض کسی کو شرف باریابی دیں تو یوں تاثر دیتے ہیں جیسے احسان عظیم کیا ہو۔"

"تو پھر یہ کرتے کیا ہیں؟"

"بزنس۔ اپنا ذاتی کاروبار! ملک سے کیا منگوانا ہے یا ملک میں کیا بھیجنا ہے اور کس طرح بھیجنا ہے۔ انہوں نے اپنے ایجنٹ رکھے ہوئے ہیں یا رشتہ داروں کے ذریعے کرتے ہیں۔"

"آپ مطمئن ہیں؟"

بولے "ذاتی حد تک تو مجھے کوئی پرابلم نہیں۔ امیر آدمی ہوں۔ کونسلر کو فون کروں تو خود چل کر آ جاتا ہے۔ حکومت سے بھی اچھے مراسم ہیں بس اہل وطن کی طرف سے فکر رہتی ہے۔ ان کی حالت زار مجھے بے کل اور بے قرار رکھتی ہے۔"

ان سے کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ وطن کا حال پوچھتے رہے۔ اکثر باتیں لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی کوئی نئی بات سننے کا تجسس رہتا ہے۔ جب میں رخصت ہوا تو مجھے پورے سفر میں پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ میرے قدم بوجھل ہیں اور ذہن پر دھواں سا چھا رہا ہے۔

شام کو پرویز شاہ صاحب ہمیں شاپنگ کے لئے لے گئے۔ ان کے دفتر کے بالکل نیچے بازار تھا۔ صرف سیڑھیاں اُترنا پڑتی تھیں۔ یہ ہانگ کانگ کا روایتی بازار تھا۔ اس میں ملٹی سٹوری، ڈیپارٹمنٹل سٹور نہ تھے لیکن ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ چین کی دو گھوڑا بوسکی مشہور ہے جس کا عمومی رنگ ہلکا کریمی ہوتا ہے۔ ایک دکان میں مختلف رنگوں میں دو گھوڑا بوسکی کی قمیصیں بک رہی تھیں۔ میں نے دوست احباب کے لئے بارہ قمیصیں خریدیں۔ اس وقت مجھے بھٹو یاد آئے۔ سجاد شاہ کسی زمانے میں ہانگ کانگ میں ٹریڈ کونسلر رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو دورے پر آئے تو انہوں نے سجاد کو کہا کسی زمانے میں انہوں نے فلاں ٹیلر سے بوسکی کی قمیصیں بنوائی تھیں۔ اس سے چوبیس قمیصیں بنوا کر بھجوائی جائیں۔ سجاد نے ماپ مانگا تو بولے "اس کے پاس میرا ماپ ہے۔ وہ خاص آدمیوں کے لئے الگ سے

رجسٹر Maintain کرتا ہے۔ سجاد نے چوبیس قمیصیں بنوا کر بھجوائیں لیکن وہ فٹ نہ آئیں۔ بھٹو صاحب کو اس بات کا خیال نہ رہا تھا کہ وقت کے ساتھ ان کا وزن بھی کسی حد تک بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اب کے باقاعدہ ماپ بھیجا گیا۔ جب انہیں قمیصیں ملیں تو بھٹو صاحب نے شکریہ کے ساتھ بل کی رقم بھی بھیج دی۔

قمیضوں کے علاوہ میں نے ٹائیاں اور بچوں کے لئے کپڑا بھی خریدا۔ افضل حسین کو بھی مشورہ دیا لیکن انہوں نے انکار میں کندھے اُچکا دیے۔ جب ہم شاپنگ کر کے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو ایک شخص فٹ پاتھ پر بیٹھا سامان بیچ رہا تھا۔ میں نے تتلیوں سے بنا ہوا چھوٹا سا لیڈیز پرس دو ہانگ کانگ ڈالر میں خریدا۔ افضل حسین کی اچانک نگاہ پڑی تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے ”یہ مجھے دے دو۔ میری بیگم کو بہت پسند آئے گا۔“ چوبیس ہزار میل کے سفر میں انہوں نے ہزاروں ڈالر خرچ کیے ہوں گے لیکن خریدیں صرف دو چیزیں۔ ایک بیگم کے لئے پرس اور دوسرا سردار شیر افگن کے لئے اولمپک Signia والی ہاف سلیو بنیان۔

رات کو پرویز شاہ ہمیں چائنیز ریسٹورنٹ پر لے گئے۔ کوئی کھانا بھی اس قسم یا ذائقہ کا نہ تھا جو وطن عزیز کے چائنیز ریسٹورانوں پر دستیاب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اصل چینی کھانا تھا، جو ہم یہاں کھاتے ہیں وہ چائنا میں نہیں ملتا جس طرح یونان میں یونانی دواخانوں کا نام ونشان تک نہیں۔

ہانگ کانگ ہمارے درمیان حد فاصل تھا اس کے بعد ہمارے راستے جدا تھے۔ افضل حسین کو سیدھا کراچی جانا تھا اور میں نے براستہ سنگاپور بنکاک میں کمپیوٹر کورس کے لئے رُکنا تھا۔ اگلے دن افضل حسین صبح کی فلائٹ سے پاکستان چلے گئے۔ میرا فلائٹ شیڈول کچھ اس طرح کا تھا کہ مجھے مزید ایک دن رُکنا تھا۔ ہانگ کانگ تو دیکھ ڈالا تھا اس لئے پرویز صاحب نے مشورہ دیا کہ میکاؤ بھی لگے ہاتھوں دیکھ لیں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہانگ کانگ کی بندرگاہ سے ہر گھنٹے کے بعد میکاؤ کے لئے فیری سروس چلتی تھی۔ فاصلہ بھی ایک گھنٹے کا تھا۔ کسی زمانے میں پانچ گھنٹے لگتے تھے۔ Hydrofile boats اسے گھٹا کر ایک گھنٹے پر لے آئی تھیں۔ اس کشتی کی دو خصوصیات ہیں۔ یہ عملاً پانی کے اُوپر چلتی ہے صرف واٹر پائپ پانی کے اندر ہوتے ہیں۔ وہ پانی کو جس تیزی سے suck کرتے ہیں اسی سرعت رفتار سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ اس عمل اور ردعمل میں کشتی کی رفتار کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ دوسری بات Smooth sailing ہے۔ کشتی ہچکولے نہیں کھاتی۔ مسافروں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کوئی چیز سطح آب پر اس قدر روانی کے ساتھ چل رہی ہے۔

[جاری ہے۔]

خواب اور ہم

تعبیروں کے لیے ہمیشہ خواب ضروری ہوتے ہیں
اسی طرح سے خوابوں میں تعبیر کا ہونا لازم ہے

بے معنی ہوں خواب اگر تو
سمجھو اک ملغوبہ ہیں وہ، منظر منظر تنتے جاتے
بہت پرانے جالوں کا
بے ترتیب خیالوں کا

یعنی خواب وہی اچھے ہیں
جن میں اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہو
خوشبو، رنگوں میں ڈھل جائے اور دکھائی دیتی ہو
جن میں ایسے پھول کھلیں جو بن موسم بھی تازہ ہوں
گھیرا کرتی دیواروں میں جیسے اک دروازہ ہوں

خواہش اور کوشش کا یعنی
ہر پَل ساتھ ضروری ہے
دونوں کو جو یکجا کر دے
ایسا ہاتھ ضروری ہے

امجد اسلام امجد

۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کی یاد میں

[جب قراردادِ پاکستان منظور کی گئی تھی]

آؤ تازہ کریں ہم یادیں اُن لمحات کی عظمت کی
جس دن ہم نے جھلک دیکھی تھی ایک عظیم بشارت کی

☆

ہم نے سب کو سمجھایا تھا، 'پاکستان کا مطلب کیا'؟
خِطّۂ ہند میں اُمّتِ مسلم کا ہے اصل میں منصب کیا
منٹو پارک میں جھلمل جھلمل کاہکشاں تھی محبت کی
آؤ تازہ کریں ہم یادیں اُن لمحات کی عظمت کی

☆

وُہ دِن، وُہ تاریخی دِن، تاریخ میں زندہ آج بھی ہے
تیرگیاں جتنی بھی ہوں، وُہ دِن تابندہ آج بھی ہے
جِس دِن پہلی اینٹ رکھی تھی عالی شان عمارت کی
آؤ تازہ کریں ہم یادیں اُن لمحات کی عظمت کی

☆

ظاہر میں مینارِ پاکستان گواہی دیتا ہے
اصل میں یہ معمارِ پاکستان گواہی دیتا ہے
ہر سُو روشنی پھیلی ہوئی ہے اُس چمکیلی عبارت کی
جس دن ہم نے جھلک دیکھی تھی ایک عظیم بشارت کی
آؤ تازہ کریں ہم یادیں اُن لمحات کی عظمت کی

نسیمِ سحر

مہلت نہیں اَب

کِسی خواب میں جاگتے اِک جہاں سے
وہ آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں
شناسائی کے اِک کھنڈر سے
اُبھر آتی ہے کوئی تصویر
جو میری پہچان میں
بازگشتِ صدا کی طرح گونجتی ہے
مرے دِل کے دروازے کھلتے ہیں
اور رُوح میں
ایک دیرینہ ہمدم
اور اُس کی رفاقت کے آثار
پھر سے نُمودار ہوتے ہیں
کوئی مجھے نیند کی وادیوں سے
اُفق کی طرف کھینچتا ہے
مجھے طاق میں پھر سے روشن مجھے دیکھنا چاہتا ہے
مرے ضبط کردہ اثاثے
مجھے دان کرنے پہ راضی ہے لیکن
مجھے خواب کے نرم بستر سے اُٹھنے کی مہلت نہیں اب!

خاور اعجاز

دن

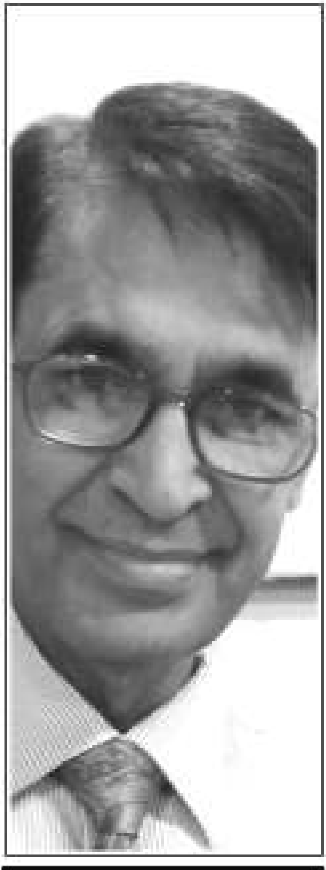

عجب دن تھے

کہ میں جب حلقۂ احباب سے

چپ چاپ اٹھ کر

ناگہاں تیرے لئے گھر کو

سرِ شب بے قراری سے چلا آتا تھا

کیا دن ہیں

کہ ہر شام آجکل ناگاہ

مَیں گھر سے دبے پاؤں نکل کر

حلقۂ احباب میں

بے اختیاری سے چلا جاتا ہوں

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ تواتر ساز بھی ہے، وہ تسلسل باف بھی

تازہ حیرت کے لیے تازہ ندا آنے کو ہے

عرصۂ عمر

تھک گئی راہ گزر
دیر تک چشم و نظر
طاقِ تمنا پہ رہی
کوئی آیا نہ گیا
ہجر کے دروازے تک
درد کی چھاؤں تلے
سو گئیں خالی آنکھیں
دیدِ و اُمید سے
خالی تھیں سوالی آنکھیں
عرصۂ عمر مرا
ایک فسانہ تھا فقط
اور یہ لکھنا لکھانا بھی
بہانہ تھا فقط

کرامت بخاری

کون سنتا ہے یہاں

اے مرے قلبِ تپاں
یہ تری آہ و فغاں
کون سنتا ہے یہاں
رنج ہی رنج سے معمور ہیں یہ کون و مکاں
کوئی راحت کا یقیں ہے نہ مسرت کا گماں
غم کا یہ کوہِ گراں
کرب کا یہ سیلِ رواں
از کراں تا بہ کراں
اَب مقدر میں لکھی ہے یہی شامِ ہجراں
اس پہ کب تک رہے گا یونہی تُو نوحہ کناں
کون سنتا ہے یہاں
اے مرے قلبِ تپاں
یہ تری آہ و فغاں

بحضورِ اقبالؒ

حامد یزدانی

تخیل میں گونجا، کبھی آہنگ میں ابھرا
ہر دور میں اقبالؔ نئے رنگ میں ابھرا

حُبِّ شہِ لولاک کہ سانسوں میں رواں ہے
اک زمزمۂ پاک کہ سانسوں میں رواں ہے

پیغامِ بقا دیتی وہ مسحور صدا سے
وہ فجر کے لمحات کی مقبول دعا سے

وہ عدل کی تصویر، وہ انصاف کا منظر
دکھلایا ہمیں عظمتِ اسلاف کا منظر

احساس ابدگیر ہے کچھ ایسا بیاں میں
مشرق کی اذاں گونجی ہے اکنافِ جہاں میں

احساس کا اک شعلہ بھڑکتا رہا دن رات
سینے میں کوئی درد دھڑکتا رہا دن رات

ہر حرف کہ تکشیف ہے اسرارِ ازل کی
ایمان کی تلقین ہے، دعوت ہے عمل کی

تخلیقِ سخن بامِ حقیقت کا ہے زینہ
ظاہر کے خرابے میں وہ باطن کا دفینہ

اک گوشۂ افلاک کو مہتاب نے ڈھونڈا
اقبالؔ کی آنکھوں کو خود اک خواب نے ڈھونڈا

توصیف نگاری کا ہمیں وصف کہاں ہے
جو لکھتے ہیں ہم محض یہ لکھنے کا گماں ہے

کسی گم شدہ شب کی سیر

یونہی ہم گنگناتے ہیں
گھنی شب میں
سلیٹی آسماں، گاچی لگے بادل
گریزاں وقت کی توجیح کرتے قرمزی لمحے
سمٹتی سردیوں کے استعارے
نارسائی کے، اداسی کے اشارے
رفتہ موسم کا 'فنون'
لکشمی، دی مال، لارنس، پاک ٹی ہاؤس
ہر سُو،
خالد احمد کی غزل پر بحث جاری ہے
صحافی اونگھتی خبروں کو چوکس کرتے جاتے ہیں
عمارت اُکھڑی اُکھڑی
کچھ سپاہی اک نیا پیغام لاتے ہیں
عبارت اُکھڑی اُکھڑی
ٹائپنگ اغلاط سے پُر ہے
یہ خالی حرف ہیں؟ وحشت بھرے احکام ہیں؟ کیا ہیں؟
بڑے دکھ سے وہ کہتا ہے:
یہ کوئی آسمانی زخم بھی شاید نہیں!
درآمدہ، ہموار کاغذ،
آڑھے ترچھے، تہہ بہ تہہ کچھ نام ہیں، کیا ہیں؟
کسے یہ پیڑ سے لڑتی ہوائیں گھورتی ہیں!
چھراچھرا چال تاروں کی
کہیں مہدی حسن کے دھیمے دھیمے سُر بکھرتے ہیں
کسی فٹ پاتھ پر

پہلے اُجالے سے لپٹتے کچھ پتنگے قافیہ پیمائی کرتے ہیں
وہ دن بھر کا تھکا رکشا ابھی تک بڑبڑاتا ہے
دھواں!
مصرعے
کہ لوری؟
پھر وہی بوسیدہ پینٹنگ
پھر وہی فرضی سے دوست
دُور کھمبے سے لپکتی ۔۔۔ شاید اردو میں لکھی
اک ملتجی تختی
سموکنگ ۔۔۔؟ نو سموکنگ!
ایک بجلی کے لپکتے تار سے الجھی پتنگیں
رات جیسی گدلی چائے کی مہکتی بھاپ میں تحلیل ہوتا
جاگتا سوتا ہوا کیفے
کہ چوبی میز سے چپکے
گزشتہ روز کے اخبار کو تکتی
کھنکتی پیالیوں کی اوٹ سے
ساتن کی نیلی تتلیوں کو کھوجتے سورج بھی نکلے گا!
ابھی تو ایک دوجے سے گلے ملتی اذانیں مسکرائیں گی
ابھی سے کس لیے تم اُٹھتے جاتے ہو!
مرے یارو!
ذرا ٹھہرو، ابھی بیٹھو،
چلو اک بار پھر،
روٹھے دنوں کو گدگداتے ہیں
یونہی ہم گنگناتے ہیں
گھنی شب میں ۔۔۔!

حامد یزدانی

زمین کی نشانیاں (فروغ فرخ زاد کی فارسی نظم کا ترجمہ)

سورج اب ایک برف کے تودے کی مثل تھا
اور اُس زمیں سے برکت اور رحمت تھی اُٹھ چکی
دھرتی پہ جتنا سبزہ تھا، سب سوکھنے لگا
دریا کی ساری مچھلیاں بھی خشک ہو گئیں
اور اُس کے بعد خاک نے مُردے اُگل دیئے

تنہائیوں کے غاروں میں بے ہودگی جنی
خوں میں حشیش و پوست کی تھی بُو رچی ہوئی
اُس عہدِ بدنصیب کی ماؤں کی کوکھ نے
پیدا کیے جو لال، وہ سر کے بغیر تھے
گہوارے پاسِ شرم سے قبروں میں جا چھپے

پھر اُسکے بعد لوگوں کو کچھ بھی رہا نہ یاد
پھر اُس کے بعد انکو نہ تھی عشق ہی کی یاد
پھر اُسکے بعد اُنکو نہ تھی جیت ہی کی یاد
پھر اُسکے بعد اُنکو کچھ بھی نہیں تھا یاد

وہ لوگ، وہ الم زدہ، غمگین وہ بدنصیب
وہ مُردہ دل، اُداس، وہ مبہوت و تیرہ بخت
اپنے شکستہ جسموں کے منحوس بوجھ کے
منحوس، تیرہ بوجھ کے نیچے دبے ہوئے
اک دائمی مسافرت کے دُکھ میں مبتلا
وہ لوگ، وہ الم زدہ، غمگین و بدنصیب
وہ جن کے ہاتھ ہو گئے آماس کا شکار
عصیاں کی ایک آرزوئے دردناک سے

وہ بے بصر جو اپنی ہی وحشت میں غرق تھے
عصیاں کے ایک بے پنہ، مہیب بوجھ نے
اُن کی بے عقل رُوحوں کو مفلوج کر دیا

سورج اب ایک لاش کے مانند سرد تھا
اور اُن نراش لوگوں کو کچھ بھی خبر نہ تھی
وہ غمزہ پرند کہ ایماں ہے جس کا نام
اُن کے دلوں سے کب سے ہے پرواز کر چکا

ازھر منیر

تمھاری کمی تھی بہت

آج رونق ہے ہر سمت چھائی ہوئی
پر جو دل ہے مرا مضطرب ہے بہت
اچھا موسم ہے ہر کوئی خوش ہے یہاں
ہے اُداسی مگر مجھ پہ چھائی ہوئی
مثلِ صحرا ہے دل میرا ویراں بہت
میرے جذبات کو کیسے سمجھے کوئی
کوئلیں، بلبلیں
گنگناتے ہوئے گیت گاتے ہوئے
اُڑ رہی ہیں فضاؤں کے ماحول میں
اپنی دُھن میں یہاں ہر کوئی مست ہے
خوشنما پھول پر
آب کی ننھی بوندیں ہیں ٹھہری ہوئی
مجھ کو ٹھنڈی ہوا نے چھوا تو لگا
مجھ کو آئی ہو تم چھیڑنے کے لیے
پھر ہوا یوں کہ یہ شام بھی ڈھل گئی
رات آئی تو سارا جہاں سو گیا
بادلوں میں چھپا چاند اچھا لگا
پر وہ تم سا نہ تھا
خوشنما رنگ اپنے جلو میں لیے
ہیں ستارے سبھی جھلملاتے ہوئے
ہر طرف حسنِ قدرت ہے پھیلا ہوا
میری آنکھوں میں لیکن نمی تھی بہت
تھا سبھی کچھ تمھاری کمی تھی بہت

طاہر ناصر علی

''خانہ بدوش''

ان پکے مکانوں میں
جو لوگ نہیں بستے
وہ لوگ بھی زندہ ہیں
تم سوچ نہیں سکتے؟

''مہندی والے خواب کی خوشبو''

مجھے یہاں پر ذات کی
تہذیبوں میں پلتی
رسموں کے ناگوں نے
مہلت دی ہوتی تو
میں بھی
اس کے
مہندی والے ہاتھ کا حصہ بن سکتا تھا

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپ بھی دیں دامن کو ہوائیں
پھول کہاں تک آگ لگائیں

مستقبل

[نثری نظم]

میں رات
یادوں کی پگڈنڈی پر سفر کر رہا تھا
قدم تھے کہ اٹھتے ہی نہیں تھے
بچھڑنے والے کے ساتھ
گزرے ہوئے لمحات
ہر قدم پر میرا راستہ روک رہے تھے
رنگین اور خوشبودار یادیں
سرخ پھولوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں
میں یادوں کے سحر میں گم تھا
صحن میں کھیلتے
ننھے پوتے کی کلکاری سنائی دی
میں سنبھلا
کلکاری پھر سنائی دی
میں نے اسے ڈی کوڈ کیا
وہ کہہ رہی تھی
"اٹھ ماضی سے نکل
حال میں آ
میں تیرا مستقبل ہوں"

منظور ثاقب

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہم اپنے دل پہ کچھ نازاں تھے خالد
سو اک دن ہم کو ہونا تھا خجل بھی

کوملتا

کوملتا تو کیسی ہوگی

چاندنی جیسی اجلی اجلی
پانی سی شفاف

کوملتا تو کیسی ہوگی

رنگا رنگ رنگولی
نرم ملائم سانس سے بڑھکر ہوگا روپ سروپ
آنکھ تری کھلنے سے نکھرے گی دنیا میں دھوپ

کوملتا تو کیسی ہوگی

کیسی تیری خوشبو
خوشبو تیری دھیمی ہوگی یا پھر ہوگی تیز
دھیرے دھیرے بھاگنے والی یا ہنگامہ خیز
بارش کی چھن چھن کے جیسی ہوگی تیری تھاپ
پورا ہوگا سات سروں کا انمٹ ایک ملاپ

کوملتا تو کیسی ہوگی
بھوری؟ نیلی آنکھیں؟
بھوری نیلی آنکھیں ہونگی سندر کالے
بال
مسکاتے ترے ہونٹ ہمیشہ
سورج جیسے گال
پوروں سے پیروں تک ہوگی مکھن دودھ سے تازی
چھوکر دیکھنے والے ہونگے تیرے ہاتھ پیازی

کوملتا تو کیسی ہوگی

چہرہ پھول گلاب
سب نے تیرے کھل اُٹھنے کے دیکھے کتنے خواب

کوملتا بادل کا باجا نیل گگن پر بولے
جب تو اس دھرتی پر اترے
پنکھ سنہری کھولے

کوملتا ترے گرد رہیں گے پریوں کے کچھ غول
اُمڈے گی خلقت کہ دیکھیں کلی کھلی انمول

کوملتا تری راہ تکے ہے چنچل سا اک دور
ہاتھ اُٹھائے کھڑا ہوا ہے پورا شہر لاہور

رخشندہ نوید

نثری نظم

خواب نگری میں

نیند کے عوض آنکھیں رہن رکھوا دی ہیں

ناتمام آرزوئیں تھکن سمیٹے

یاس کی گود میں محوِ خواب ہیں

سوچوں میں خار اگ آئیں تو تخیئل

زہر اگلنے لگتا ہے

یادِ کسک کے سوا کچھ نہیں

محبت رو پہلا خواب، گر آنکھوں کے دریچوں پر

دستک دے کر لوٹ بھی جائے

اسکی دستک بازگشت کی صورت

ماہ و سال تک سماعتوں میں گونجتی رہتی ہے

یہ لامحدود تنہائی

خود سے بغاوت کا ثمر ہی تو ہے

نخلِ اداسی پر خامشی اوس کی صورت برستی ہے

یہ تنہائی مرے وجود کو آباد رکھتی ہے

نائیلہ راٹھور

نثری نظم

اے دوست سنو

دل تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہے

تمہارے قدموں کی آہٹ

اور میری دھڑکنیں

اگر باہم سو جائیں

تو ہم اپنی

پسند کی دنیا بنا سکتے ہیں

ہم اک دوسرے کی

خوشی غمی میں

جی سکتے ہیں

تمام عمر دُکھی رہا

نہ کوئی میت ملا

نہ ہی وحشتوں میں کمی ہوئی

مگر اب یوں لگتا ہے

ہماری دوستی میں

ہجر کی خزاں

ختم ہونے والی ہے

اور ہمارے دل کے آنگن میں

وصل کا

سورج طلوع ہونے والا ہے

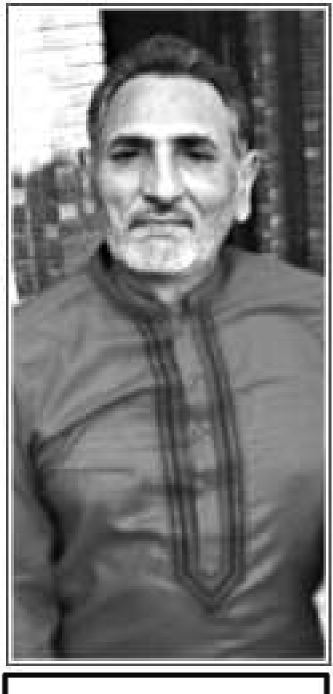

امین کنجاہی

انحراف

گماں نہیں ہے
مجھے یقیں ہے
کہ وہ محبت کے آسماں پر
مرے قریں ہے
وہ اک ستارا جو سب سے روشن
مرے لیے تھا، مرے لیے ہے
ذرا سا پردے میں چھپ گیا ہے
تو کیا ہوا ہے
خلا میں صدیوں بھٹکتے رہنے سے بھی
یہ ممکن نہیں ہوا ہے
ملن کسی کا کسی کی خواہش
پہ رک گیا ہو
صدائیں ساری
دعائیں ساری
ہی رائگانی میں دب گئی ہوں
بس اک حقیقت یہی ہے پیارے
گماں نہیں ہے
مجھے یقیں ہے
کہ میرے جذبے سبھی
تمھاری طرف ہوئے ہیں
تو کچھ وجہ ہے
کوئی سبب ہے کہ چاہ کر بھی
بھلا نہ پائی
میں ایک لمحہ
تمھاری یادیں
تمھارا لہجہ
تمھاری آنکھوں میں جو چمک تھی
اور اُس چمک میں
جو چاہتیں تھیں
مرے لیے تھیں
تمھاری بانہوں کے آہنی سے حصار جو تھے
مرے لیے تھے
خدائے واحد و لم یزل نے
جو کُن کہا تھا
اسی لیے تھا
کہ تم نے اگلے ہزار جنموں میں سونپنا تھے
ہر ایک جیون کے سارے جذبے
جو تم نے اب تک سنبھال رکھے تھے
اک پری رو کے واسطے ہی
تمھی بتاؤ کہ منحرف ہو سکو گے اس سے۔۔
تمھی بتاؤ

رخسانہ سمن

انگلیوں سے دستک

[نثری نظم]

اب مجھے
میرے علاوہ
کوئی بچا نہیں سکتا

دیکھ لیا ہے
سبھی کو
اور اس سبھی میں......سب کچھ آجاتا ہے

جیسے باغ میں
خزاں کے کرایے داروں کا ناجائز قبضہ ہے
جیسے وقت کا لامتناہی جبر
کسی گندے لطیفے کی طرح
شہر بھر میں پھیل گیا ہے
جیسے
تمھاری بے خبری کی پرانی عادت
جسے اب لاتعلقی کی دیمک چاٹ گئی ہے
جیسے اور بہت کچھ
جس کا تذکرہ غیر مناسب ہے

مجھے درختوں کے خواب دکھانے والا
کون تھا؟
مجھے چھاؤں کے کلیے سمجھانے والا کون تھا
مجھے آسمانی ستاروں سے دور
سمندروں کے پار
ہواؤں سے بہلانے والا کون تھا

یہاں اپنے سوا
اگر کوئی دوسرا نہیں ہے
تو پھر وہ کون ہے
جو اکیلے میں بلاوجہ محسوس ہوتا ہے
میرے ارادوں کو
کن کی قینچی سے کاٹتا ہے
میری دعاؤں کے سیونگ اکاؤنٹ کی
نگرانی کرتا ہے

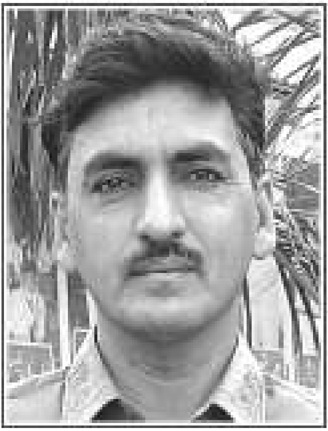

امجد بابر

شکریہ پاکستان

مری دھرتی تُو جنت ہے
مرے خوابوں خیالوں کی
مرے سارے حوالوں کی
تجھے دیکھوں تو لگتا ہے
ملا انعام قدرت کا
حسیں اس پاک دھرتی کو
فرشتوں نے سجایا ہے
خود اپنے پاک ہاتھوں سے
ترے منظر مرے گلشن
کہ جنت کے نظارے ہیں
تری کھیتی ترے صحرا
ندی نالے ترے دریا
پہاڑی چوٹیاں ساری
تمہاری وادیاں ساری
عجب گل رنگ سارے ہیں
بہت دلکش نظارے ہیں
پرندے چہچہاتے ہیں
خوشی کے گیت گاتے ہیں

مری ارضِ وطن سچ ہے
تُو پرکھوں کی نشانی ہے
تجھے گُل رنگ کرنے میں
لہو شامل ہوا جن کا
مرا تجھ سے یہ وعدہ ہے
بڑھاؤں گی تری توقیر کو میں بھی
مجھے جو کچھ ملا اب تک
ترے دم سے ملا سارا
مجھے یہ بات کہنے میں
ذرا سی عار بھی کیوں ہو
مری پہچان تجھ سے ہے
مری یہ جان تجھ سے ہے
یہی سچ ہے حقیقت میں
مرا ایمان تجھ سے ہے
اے پاکستان میری جان
دل سے شکریہ تیرا

سحر علی ارشد

خواہش

میں طالب علم ہوں فزکس کا
مجھے آئن سٹائن سے الفت
مجھے پیار گلیلیو سے اتنا
جتنا کہ سٹیفن ہاکنگ سے
میں چاند ستاروں کا راہی
مجھے عشق مریخ سے زہرہ سے
میری خواہش چاند کو چھونے کی
میں جھانک رہا ہوں برسوں
اپنی اس گلیکسی سے باہر
میں نے دیکھا ہے
کئی بڑے بڑے سے سورج ہیں
اوران کے پاس زمینیں ہیں
اپنی اس دھرتی کے جیسی
اک دنیا ہے جو دھرتی کے رہنے
رہنے والوں سے اوجھل ہے
میری خواہش ہے میں جان سکوں
کیا ان سرسبز زمینوں میں
ہم جیسے لوگ بھی رہتے ہیں
کیا وہ بھی ہم لوگوں کی طرح
جیتے ہیں پھر مرجاتے ہیں
کیا وہاں امیر غریب بھی ہیں
کیا وہاں بھی غم وحسرت ہے
کیا وہاں بھی خوف اور وحشت ہے
کیا وہاں بھی عشق ومحبت ہے
کیا ان کے ماں اور بابا ہیں
کیا ان کے چاند سے بیٹے ہیں
اور بیٹیاں پھولوں جیسی ہیں
لیکن اب تک معلوم نہیں
کہ وہ دنیائیں کیسی ہیں

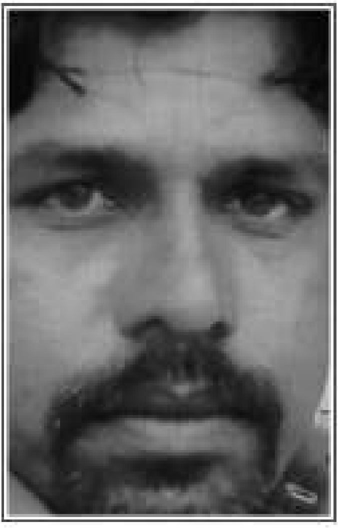

کیفی قلندر

خطوط

آصف ثاقب

واجب الاحترام پیارے عمران منظور صاحب
السلام علیکم!
مارچ کے 'بیاض' کے سرورق پر خالد احمد کی تصویر ماہ منیر سی لگی۔ ایک روشن ضمیر شاعر کا چہرہ چندے آفتاب چندے مہتاب ہی تو ہے۔ یونیسکو نے لاہور کو شہر ادب کا نام دے کر ادب کی دنیا میں حق شناسی کی مثال قائم کی ہے۔ انور شعور کے اس شعر:

تھا جو کسی زمانے میں گہوارۂ ادب
زندہ دلوں کو آج وہ لاہور چاہیے

کی روشنی میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، فی الواقع کسی زمانے میں لاہور گہوارۂ ادب تھا۔ لاہور میں اردو ادب کے ایسے ایسے نامی گرامی اہل قلم موجود رہے جن کی شاعری، مضامین، مزاح، ڈرامہ اور تنقید کی فضیلت کا اعتراف دنیا بھر میں ہوا ہے۔ لاہور کے زندہ دلوں کے لیے آج بھی کچھ کمی نہیں۔ لا و نعم کی باتیں تو ہوا کرتی ہیں۔ لاہور میں آج بھی پائے کا ادب لکھا جا رہا ہے۔ اردو ادب اور پنجابی ادب کے سرمائے میں کہیں گھاٹا نہیں۔ کسی زمانے میں رسالے نقوش، سویرا، ہمایوں، کے سے معیاری رسالے لاہور کی رونق رہے۔ احمد ندیم قاسمی نے 'فنون' کے ذریعے سے ادبی قدروں کی ترویج کی 'فنون' کے اوراق کی بدولت مقبول و معروف شاعروں ادیبوں کو حوصلہ ملا اور انھوں نے پائے کا ادب تحریر کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے اوراق کی معیاری نگارشات بھی اسی طرح پسند کی گئیں لاہور میں ادب لطیف، ادبی دنیا، الحمرا، تخلیق ارژنگ اور اس قبیل کے جملہ رسالے ادبی رونقیں بڑھا رہے ہیں۔ ماہنامہ بیاض کی ادبی ہمہ رنگی اپنے انداز سے یہاں کی فضاؤں پر محیط ہے۔ اس رسالے کی مقبولیت کا ہر کوئی معترف ہے۔ لاہور کے پنجابی رسالے بھی اپنی سی کر دیکھ رہے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ لاہور نے پنجابی کی ادبی اہمیتوں کو بھرپور طریقے سے اُجاگر کیا ہے۔ یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ لاہور، لاہور ہے۔ لاہور کی ادبی سرگرمیاں کبھی ماند نہیں پڑتیں۔ یہ سالک حسرت، پطرس، منٹو، فیض، ندیم، منیر، ساغر، تاج، میرا ادیب، خالد، انتظار حسین، دانش، اور کئی بڑے اہل قلم کا شہر ہے۔ پھر خالد احمد کی منفرد اور موثر شاعری سے بھی اس شہر کو ایک مقام ملا ہے۔ مجھے بھی اسی شہر سے کچھ نہ کچھ ادبی استحکام ملا ہے۔ اس وقت لاہور میں ایک سے ایک اچھا شاعر ایک سے ایک اچھا ادیب موجود ہے۔ اس شہر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عالمگیری کی بشارت ہے۔ آج بھی یہاں اردو پنجابی میں دلافروز ادب تخلیق ہو رہا ہے ادبی رونقوں کو گہن نہیں لگا۔ وہی روشنی ہے وہی دل دادگی ہے وہی ادبی مناظر ہیں۔ ہر لکھائی ہر تحریر آنکھوں میں نور بھر دیتی ہے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں احمد ندیم قاسمی سے ادبی طور پر متعلق رہا۔ 'فنون' میں ایک مدت سے لکھ رہا ہوں اب ناہید قاسمی 'فنون' میں مجھے عزت دیتی ہیں۔ 'فنون' سے مجھے عزت ملی۔ اس رسالے میں میری شاعری شائع ہوئی۔ حصہ اختلافات میں مباحث میں حصہ لیا۔ عروض سے متعلق دو مضامین 'کچھ رباعی کے بارے میں' اور 'تقطیع کے اسالیب' شائع ہوئے۔ تخلیق میں بھی ایک مدت سے لکھ رہا ہوں۔ 'بیاض' نے تو مجھے ایک طرح سے زمین سے اُٹھا کر کرسی نشین کر دیا ہے۔ خالد احمد کی قدردانی سے بڑی تقویت ملی۔ کراچی کے رسالے پرواز (مدیر سید معراج جامی) سے بھی میرا رابطہ لاہور ہی کے واسطے سے ہوا ہے۔ رسالے الحمرا سے بھی ربط ضبط رہا ہے غرض مجھے بوئی کے سے دور کے موضع میں لاہور نے کچھ مرتبہ دیا ہے تو لاہور والے لاہور کے اندر رہ کر زیادہ ادبی تمول پانے والے ہیں اگر یونیسکو نے لاہور کو شہرِ ادب کا درجہ دیا ہے، تو 'حق بحق دار رسید' کی عملی مثال قائم کی ہے۔ میں رسالہ سے متعلق چند اشعار بھیجے ہیں۔ ان کی اشاعت کا یہ مناسب موقع ہے۔ محترم جمیل یوسف اور محترم آفتاب احمد ملک کا میں شکر گزار ہوں انھوں نے عزت دی۔

نسیم سحر صاحب کو معلوم ہو مجھے محمد ارشاد صاحب (صاحب محبت سے لکھ رہا ہوں) کا ایڈریس معلوم نہیں۔ ان سے میری خط کتابت نہیں۔ (کاش ایسا ہو سکتا)۔ محمد ارشاد صاحب کو میں نے شاید اچھے انداز سے متعارف نہیں کرایا۔ ان کی عظمت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بہر طور اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے۔ اس خصوص میں ان کا خط معلومات سے بھرا ہوا ہے۔ خیر اندیش

نسیم سحر

برادر عزیز عمران منظور۔ سلام مسنون۔ مارچ کا شمارہ بھی حسب معمول بروقت موصول ہو گیا تھا۔ دو دن میں ق اے الف سے یا تک پڑھ بھی لیا مگر پھر دوسری مصروفیات میں اُلجھ گیا اور آج اس پر کچھ سطریں بطور تبصرہ لکھ رہا ہوں، امید ہے ابھی زیادہ تاخیر نہیں ہوئی ہوگی۔

جناب ابدال بیلا کا افسانہ "شکار" ان کے اسلوب کی چاشنی اور گہرائی کا لطف دوبالا کرنے کے لیے دو مرتبہ پڑھا۔ دونوں خواتین یعنی آسنا تھ کنول اور دردانہ نوشین خان کے افسانے بھی عمدہ اور عصر رواں کے ترجمان لگے۔ دردانہ نوشین خان کے افسانوں کے روحانی اور معرفت کے اسلوب پر نثری نظم کا سا رنگ چڑھنے لگا ہے جو ان کی کیفیات کو دو چند کر دیتا ہے۔ منجھی ہوئی افسانہ نگار محترمہ فرحت پروین نے اس مرتبہ جیروم ویڈمین کے افسانے slippingbeauty کا اردو ترجمہ "حسن گمراہ" کے عمدہ ترجمے کے ساتھ شاندار لہجے میں کیا ہے۔ جس سے ترجمے پر بھی تخلیق کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ جناب محمد یونس بٹ نے اعجاز رضوی کے خاکوں پر جو رائے دی ہے وہ بذات خود ایک خاکے سے کم نہیں اور ایک عرصے کے بعد یونس بٹ کی لفظ سازی اور بات سے بات نکالنے کے ہنر سے تبصرہ مکرر کا سا لطف اٹھایا۔

۱۹ مارچ ۲۰۱۳ء کو خالد احمد کی وفات کی نسبت سے مارچ کے شمارے میں خالد احمد مرحوم کے بارے میں کچھ عمدہ اور سچے مضامین ان کی وفات کے حوالے سے تھے۔ انتظار حسین مرحوم اور ڈاکٹر خورشید رضوی صاحبان کے مضامین کے علاوہ برادرم نوید صادق کا مضمون بھی قابلِ ذکر ہے جس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا آغاز خالد احمد کی زندگی میں ہوا اور اس کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ اور یوں ان کی شخصیت کے حوالے سے یادنگاری کے ساتھ ساتھ ان کے فن پر بھی نوید صادق نے اہم نکات روشن کیے۔ اسی طرح جناب محمد عبداللہ کا مضمون خالد احمد سے ان کے عقیدتی رنگ کا عکاس تھا اور فیصل زمان چشتی کا مضمون بھی ان کے فن و شخصیت کا اجمالی جائزہ تھا۔ محمد نوید مرزا نے اپنے اور ہمارے دوست اور باکمال شاعر علی یاسر مرحوم کی یادیں تازہ کیں اور اس کی شخصیت کی جاذبیت اور رونق کے حوالے سے میری بھی یادیں تازہ ہو گئیں۔ جناب ہمایوں خان نے ممتاز افسانہ نگار کلیم خارجی کے افسانے 'دیوجانس کا مجاور' کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ برادرم خالق آرزو تنقید نگاری میں عمدہ سے عمدہ انداز میں لکھنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور مستقبل میں ان کے ایک نقد آور نقاد ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ رخشندہ نوید نے "بھاتی والی" جیسی عجیب و غریب پراسراری خودنوشت لکھ کر حیران کر دیا ہے۔ ایسے ہی چند واقعات مجھے بھی پیش آئے جن کو قلمبند کرنے کا ارادہ تو کئی بار کیا مگر دیگر مصروفیات میں رہ گیا۔ ممکن ہے کبھی وقت ملے تو لکھ بھی دوں۔

اب حمد و نعت اور دیگر منظومات کے چند پسندیدہ اشعار لکھ رہا ہوں کہ دوران مطالعہ جن بہت سے اچھے اشعار پر نشان لگایا تھا یہ انہی میں سے چند ہیں: حمدیہ اشعار:

واقف حالوں کا، گہرے رازوں کا
وہ واحد واقف، سارے بھیدوں کا
خالد احمد

اپنی ہستی پہ کیا غور تو عقدہ یہ کھلا اک دن
اپنی مخلوق پہ خالق بھی تو نازاں ہو گا
حسن عسکری کاظمی

اور کچھ نہیں لیکن اتنا جانتے ہیں ہم
وہ جو اس کا بندہ ہے، بندہ ہے محبت کا
ریاض ندیم نیازی

اے خدا تجھ سے عرض کرتے ہوئے
اشک آواز بنتے جاتے ہیں
سرور حسین نقشبندی

نعتیہ اشعار:

مدتوں سوچا کیے غار حرا میں بیٹھ کر
بھید ہستی کے کھلے خلوت سرا میں بیٹھ کر

گلزار بخاری

ہے میرے قلب پہ مہر اطاعتِ احمدؐ
مرا لقب ہے غلامِ محمدؐ عربی

خاور اعجاز

اُنؐ کی مدحت میں جب ہوا موزوں
کیسے مصرع اٹھان میں آیا

سرور حسین نقشبندی

اطاعت آپ کی ہاں طاعتِ خدا ہی تو ہے
سمجھ سکوں تو میں پا جاؤں راز کن فیکوں

سید ریاض حسین زیدی

ہائیکو

اکثر ناؤ میں
دریا پار کیا ہم نے
اُلٹی ناؤ میں

خاور اعجاز

غزلوں کے اشعار:

سکڑ سمٹ کے گزاری ہے زندگی خالد
ہتھیلیوں کی لکیروں کے درمیاں کہیں

خالد احمد

شعر محتاط قرینے سے پڑھے جائیں گے
بزمِ احباب میں کچھ پردہ نشیں ہوتے ہیں

آصف ثاقب

تھا جو کسی زمانے میں گہوارۂ ادب
زندہ دلوں کو آج وہ لاہور چاہیے

انور شعور

عشق نے سنتے ہیں غالب کو نکما کر دیا
ہم کو بھی اس کی طرح بیکار ہونا تھا، ہوئے

جمیل یوسف

ریاضؔ بے غرض کی عزت و توقیر کا باعث
خیالِ ماسوا کی گرد سے دامن بچاتا ہے

سید ریاض حسین زیدی

پیدا کہاں ہیں نابغۂ روزگار لوگ
اس عرصۂ ہنر میں کوئی مطمئن نہیں

حسن عسکری کاظمی

روند کر جانا بھی آتا ہے مجھے
کہہ چکا ہوں میں کہ رستا چاہیے

خاور اعجاز

غمگساری کریں ناداں تو نہیں غم گلزار
آشنا ہو کے مگر پھول نہ مارے کوئی

گلزار بخاری

قیس و فرہاد بڑے نام ہیں لیکن اے دوست
مکتبِ عشق میں حالت جو ہماری ہوئی ہے

راحت سرحدی

لکھ کر کہیں رکھا ہے جو حاصل ہے غزل کا
ہم نے تو ابھی شعر سنایا بھی نہیں وہ

شاہنواز زیدی

تا حشر مری زندگی اس سے ہو مزین
اللہ کی سنت ہے درودوں کا قصیدہ

عقیل رحمانی

کھلے گی سب کے لیے سیرگاہِ دل میری
اور افتتاح مرے یار کے قدم کریں گے

کبیر اطہر

یہ خاکدان ہمارے ہی دم سے ہے آباد
مکین جس میں نہ ہو وہ مکان کچھ بھی نہیں

اقبال سروبہ

میں شعروں میں کہتا ہوں بہت سادہ سی باتیں
دیتی ہے انھیں رنگ تو تفہیم تمہاری

سید ضیا حسین

میں ریزہ ریزہ محبت کو جوڑنے میں رہی
نہ جمع ہونے دیا ریزگاریوں نے مجھے

رخشندہ نوید

نقش بنتے ہیں بگڑتے ہیں سنور جاتے ہیں
کوزہ گر اترے گی کب چاک سے مٹی میری

نجمہ یاسمین یوسف

بشر کی موت واقع ہو چکی ہے
یہ مصنوعی ذہانت کی صدی ہے

شاہدہ دلاور شاہ کلی

دوسرا وار بھی ضروری ہے
دوسرا وار کیجیے صاحب
افتخار شاہد

اس کے چہرے پہ جو تقدس ہے
رند دیکھے تو باوضو ہو جائے
علی حسین عابدی

اک عمر سے آنکھوں میں سنبھالے ہوئے آنسو
اس بار امڈ آئے ہیں سیلاب کی صورت
وسیم عباس

کیا ترا خواب میں آنا بھی نہیں ہے ممکن
کیا مرے نام کی اک رات نہیں ہو سکتی
صغیر احمد صغیر

قتل احساس پہ سبھی یکجا
شاعری نوٹ اختلافی ہے
آرم جاذب

وہ مل کر بیٹھنے کی جب روایت ہی نہیں باقی
اکٹھے ہو رہے ہیں لوگ کیوں برگد کی چھاؤں میں
سرور فرحان

میں لفظوں سے بنا لیتا ہوں شکلیں
مجھے اعزاز میری آذری ہے
عدنان نبیل

ہمیں تو آخری سگرٹ کے آخری کش تک
خیال یار کی چادر میں سر چھپانا تھا
عاصم اعجاز

میری آنکھوں کو دیکھتا کیا ہے
ایک گھاؤ ہے ایک گھاؤ کے ساتھ
ریحان قریشی

بجھتے گھر پہ ہونے جا رہی تھی خامشی طاری
خدا کا شکر میں آواز کی تلوار لے آیا
عزم الحسنین عزمی

عمر بھر عشق میں وہ شخص قرنطین ہوا
جس کسی نے بھی مرے ساتھ گزارے کچھ دن
شہزاد احمد کھرل

ہجر کی چادر اوڑھی ہوئی ہے
تنہائی سے لپٹا ہوا ہوں
امر مجتبیٰ

مرے ہم سخن مری بات کو کسی بولتے ہوئے فن سے کاٹ
مری دھڑکنوں سے جو گل کھلیں انہیں خامشی کے سخن سے کاٹ
عاطف جاوید عاطف

پھر بھی قبول بیعت فاسق نہ کی کبھی
نوک سناں پہ گو مرے بچے قلم ہوئے
تاثیر جعفری

جانے کس کے لیے گھر کی دہلیز پہ
بین کرتا ہے روز اک دیا شام کو
ارسلان ساحل

خدا کے ہونے نہ ہونے کی بحث ایک طرف
کوئی امید نہیں ہے خدا سے ہٹ کر بھی
گوتم ملتانی

اس آنکھ نے جب چھوڑ دی خوابوں کی تجارت
اس وقت خریدار مرے سامنے آیا
فیصل زمان چشتی

ٹھکانہ پوچھنے والوں سے کہہ دو
کہیں ارض و سما کے درمیاں ہوں
اعجاز رضوی

میری غزل کے ایک شعر کا دوسرا مصرع جانے کیسے کمپوزنگ کی غلطی کا شکار ہو کر بے وزن ہو گیا۔ درست شعر یوں ہے:

زندگی کی کتاب نسیاں کا
دھندلا باب ہو گیا میں بھی

نظموں میں امجد اسلام امجد، طالب انصاری اور شاہنواز زیدی کی نظموں کے کچھ اقتباس ہائی لائٹ کیے تھے لیکن اب انھیں ٹائپ کرنے کی ہمت نہیں اور کچھ یہ خط بھی طویل ہوتا جا رہا ہے اس لیے یہ محترم شعرائے کرام زبانی تعریف و تحسین قبول فرمائیں۔ ۲۳/ مارچ کے قومی دن کے بارے میں بھی نظمیں خوب ہیں۔

ایک مرتبہ پھر خط کی طوالت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اور اگر گنجائش اس خط کے حجم سے کم ہو تو میں آپ کو اس کی حسب منشا ایڈیٹنگ کا اختیار دیتا ہوں۔

خیر اندیش

ہمایوں خان

جناب عمران منظور صاحب،

السلام علیکم!

آپ کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ادبی رسالے ماہنامہ ''بیاض'' لاہور سے میرا پہلا تعارف خیبر پختونخوا کی معروف ادبی شخصیت کلیم خارجی صاحب (مردان) کی وساطت سے ہوا۔ جس کے لئے میں اُن کا ممنون و احسان مند ہوں کہ اتنے اعلیٰ اور معتبر ادبی رسالے سے مجھے روشناس کرایا۔

بدست کلیم خارجی صاحب مجھے ماہنامہ ''بیاض'' لاہور، نومبر، دسمبر اور جنوری باقاعدگی سے ملتے رہے اور اسی طرح میں اسکا باقاعدہ رُکن بن گیا۔ میں نے ان تینوں شماروں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھا۔ کلیم صاحب نے آپ کا مختصر تعارف بھی کرایا اور یہی وجہ ہے کہ آج خط کی صورت میں آپ سے آدھی ملاقات کی جسارت حاصل کر رہا ہوں۔ کلیم خارجی اور آپ جیسی ادبی و علمی شخصیات کی بدولت نہ صرف ہمارا رشتہ اُردو زبان و ادب کے ساتھ جُڑا ہوا ہے بلکہ اُردو زبان و ادب کے حوالے سے ہم بہت کچھ سیکھ بھی رہے ہیں۔ بقول شاعر

بات کرنے کا حسین طور طریقہ سیکھا
ہم نے اُردو کے بہانے سے سلیقہ سیکھا

میں حال ہی میں قرطبہ یونیورسٹی پشاور سے ایم فل (اُردو) کر چکا ہوں۔ اور اب اسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ مجھے نثر لکھنے کا بے حد شوق ہے اور میں خود مزاحیہ تحریریں لکھتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کے اگلے شمارے کے لئے ایک مزاحیہ مضمون ارسال کرونگا۔

جناب عمران منظور صاحب!

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ادب کی تخلیق اور ترسیل کا دائرہ لامحدود ہے تاہم دورِ جدید میں جہاں ابلاغ کے بعض ذرائع نے دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے وہاں ادبی جرائد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی رسائل و جرائد ہر دور میں قیمتی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ آج کے دور میں ادبی ذوق رکھنے والے اور اُردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والے لوگ تو موجود ہیں مگر کوئی بھی مخلص نہیں۔ آج کے نفسا نفسی دور میں بہت ساری ایسی شخصیات ملتی ہیں کہ اُردو زبان و ادب کے حوالے سے بلند و بانگ دعوے کرتے تو ہیں لیکن اُردو زبان و ادب کی خدمت اور پرورش سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے خود کو ایک طرف کر لیتے ہیں۔ لیکن میں آج آپ کو بطورِ مدیر ''ماہنامہ بیاض'' لاہور کو خراجِ تحسین اور مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ''ماہنامہ بیاض'' لاہور آپ کی ماہرانہ ادارت میں پھلتا پھولتا ہوا ادبی دُنیا میں اُردو زبان و ادب کو زندہ جاوید رکھتے ہوئے اُردو و ادب کی سیرابی کر رہا ہے۔ ''ماہنامہ بیاض'' لاہور کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ چاہے اصنافِ نظم ہو یا اصنافِ نثر کہنہ مشق ادیب ہوں یا نو وارد ادیب، سب کے نمایاں پاروں کو تنقیدی بصیرتوں کو ترسیل و ابلاغ کا پورا پورا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ''ماہنامہ بیاض'' لاہور میں نئے سکالرز، نئے سیکھنے والوں اور ادبی ذوق رکھنے والوں اور زبان و ادب کے طالب علموں کیلئے بہت مفید اور علمی و ادبی مواد ہوتا ہے۔ اب ذکر کرتا چلوں ''ماہنامہ بیاض'' لاہور مارچ کا ماہنامہ زبردست رہا۔ دائم آباد گوشہ خالد احمد میں انتظار حسین، خورشید رضوی، نوید صادق، محمد عبداللہ اور فیصل زمان چشتی نے خالد احمد کی شخصیت اور فن کے حوالے سے انتہائی اہم مضامین تحریر کیے۔ ان سب ادیبوں نے خالد احمد کے فن کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

مارچ کے شمارے میں نئے شعراء کرام پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اس حصے میں سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، محمد نوید مرزا، عارف فرہاد اور خالق آرزو کے نئے شعراء پر علمی، معلوماتی اور تنقیدی مضامین بہت عمدہ ہیں۔ افسانوی تخلیقی پارے بھی ''ماہنامہ بیاض'' لاہور کو چار چاند لگانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ آسناتھ کنول کا افسانہ ''کنول''، یہ آج کے لوگوں میں احساس جگانے کا متلاشی ہے۔ انسان کی اُن خوبیوں کا ذکر کیا ہے کہ اس دُنیا میں انسان صرف اپنے لئے نہیں جیتا بلکہ دوسروں کے لئے بھی کچھ اچھا کر کے دکھائے۔ اس کے علاوہ گل زیب عباس کا افسانہ ''کبوتری''، نوشین روما کا افسانہ ''فریب''، ذروانہ نوشین کا افسانہ ''نبھاتے ہیں ایسا'' سب افسانے عمدہ افسانے ہیں۔

غزل کا حصہ بھی خاصا جاندار رہا۔ نئے لکھنے والے شعراء بھی اپنی طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ غزلوں میں جمیل یوسف، سید ریاض حسین زیدی، صفدر صدیق رضی، عقیل رحمانی، شوکت محمود شوکت، طاہر ناصر علی، سید ضیا حسین، رخشندہ نوید، حسنین سحر، اشفاق ناصر، محمد نوید مرزا، رومانہ رومی اور عدنان خالد دادِ تحسین کے مستحق ہیں۔

نظم کے حصے میں بھی عمدہ نظمیں شامل ہیں۔ امجد اسلام امجد کی نظم ''احسان''، شاہ نواز زیدی ''ترکِ وطن''، منظور ثاقب ''صدائے کشمیر'' اور امین گنجاہی ''باجیالڑکی'' عمدہ نظمیں ہیں۔

اُمید ہے آپ ''ماہنامہ بیاض'' لاہور اسی طرح باقاعدگی سے شائع کرتے رہیں گے۔ اور اُردو زبان وادب کی تعمیر وترویج میں اہم کردار ادا کرتے رہیں گے۔ میری دُعا ہے کہ ''ماہنامہ بیاض'' لاہور اسی طرح آپ کی ادارت میں پھلتا پھولتا رہے۔ بقول شاعر

پھلا پھولا رہے یا رب چمن میری اُمیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

والسلام

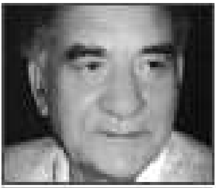

سلطان سکون

بہت عزیز ومحترم عمران منظور صاحب سلامت رہیں۔ آمین!

مجھے یہ خط لکھنے پر ایک جملے نے آمادہ کیا ہے جو ''بیاض'' کے اس تازہ شمارے میں ایک بہت نامور وممتاز ادبی شخصیت نے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے۔ اللہ جانے یہ جملہ موصوفہ نے شعوری طور پر لکھا ہے یا غیر شعوری طور پر سرزد ہوگیا؟ جو بھی ہے مجھے یہ جملہ ہضم نہیں ہو رہا جس کی وجہ شاید میری کم علمی یا کج فہمی ہو سکتی ہے۔ وہ جملہ ہے ''پیکنگ یونیورسٹی کہیں اللہ میاں کے پچھواڑے ہی تھی۔'' یہ بات نہیں کہ پہلی بار یہ جملہ مذکورہ شخصیت نے ہی لکھا ہے بلکہ اس سے پہلے بھی مجھے یہ جملہ کئی ایک دوسرے حضرات کی تحریروں یا گفتگو میں پڑھنے سننے کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔ مگر مجھے کچھ کہنے یا لکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔

''بیاض'' میں لکھنے والوں میں زبان وادب کی بہت بڑی بڑی ممتاز و نامور شخصیات شریک ہوتی ہیں اور میں ایک نہایت کم علم ہونے کی حیثیت سے یہ سوال اپنی معلومات کے لیے ان سب سے پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آیا کہ مذکورہ جملہ مناسب ہے؟ ایک تو یہ کہ کیا اللہ کے نام کے ساتھ لاحقہ طور پر ''میاں'' کا لفظ لکھنا یا بولنا مناسب ہے جب کہ اللہ کے نام کے ساتھ تعالیٰ کا خوبصورت لاحقہ موجود ہے کچھ دوسرے الفاظ بھی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ، اللہ کریم، اللہ تبارک وتعالیٰ وغیرہم۔ دوسری بات یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ کسی جگہ مقیم ہے کہ جس کے پچھواڑے (نعوذ باللہ) کوئی عمارت یا اور کوئی جگہ واقع ہے۔ مذکورہ نوعیت کا ایک اور جملہ بھی کئی بار سننے میں آیا کہ ''فلاں تو اللہ میاں کی گائے ہے'' (استغفر اللہ) اس نوعیت کے جملے یا الفاظ کسی بڑی ادبی شخصیت کی زبان سے نکلے ہوں یا قلم سے لکھے گئے ہوں تو وہ مجھ ایسے کم علم شخص کے لیے تو سند کا درجہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خوش رکھے پروفیسر غازی علم الدین میرپور آزاد کشمیر والے کہ جنھوں نے ایسے جملے اور الفاظ کی اپنی ایک کتاب میں نشان دہی کی ہے اور ان کے استعمال سے اجتناب برتنے کی گزارش بھی کی ہے۔ موصوف گزشتہ ایک مدت سے اردو زبان کی بھلائی میں مصروفِ عمل ہیں۔ میں معذرت خواہ بھی ہوں۔

والسلام

آفتاب احمد ملک

برادر ذی وقار عمران منظور صاحب!

ہدیہ سلام وحمت!!

امید ہے آپ بمع ''بیاض'' کی متحرک ٹیم بخیریت ہونگے ___ سرکاری وقت وتاریخ کے مطابق مارچ 2021 کا شمارہ خالد احمد (مرحوم) کی رنگین زندہ روح کی تصویر سے ملاقات ہوئی۔ موت کا وقت مقررہ ہے۔ ''بیاض'' کی آمد کا وقت بھی قارئین ادب کے دلوں کی لگاتار دھڑکن جیسا ہے۔

شیڈول کے مطابق بلحاظ ترتیب حمد ونعت کے بعد ابتدائی غزل بانی مدیر کی پڑھی۔ صفحہ

نمبر 2 اور صفحہ نمبر 25+26 اور نظم صفحہ نمبر 27 تا 30 خوب ہے۔ عمر عزیز کی دھوپ چھاؤں پر دو اشعار حیران کن ہیں کہ:

کہاں گیا وہ جو اک تخن میں گونجتا ہے — ملا؟ وہ نیم زبان و وہ نیم جان کہیں
سکڑ سمٹ کے گزاری ہے زندگی خالد — ہتھیلیوں کی لکیروں کے درمیان کہیں

برادرم خالد احمد (1944-2013) کے گوشہ (صفحہ نمبر 31 تا 63) میں انتظار حسین + خورشید رضوی + نوید صادق + محمد عبداللہ + فیصل زمان چشتی صاحبان نے مختلف گوشوں کو مخصوص انداز میں قارئین کی نذر کیا۔ واثم آباد کے صفحات زندہ تحریریں یعنی ادبی ریکارڈ محفوظ ہوتا جا رہا ہے۔

سید ریاض حسین زیدی کا ادبی خاکہ مجھا کرم ناصر اور نسیم سحر کا انیس انصاری کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے معلوماتی مضمون پڑھا۔ علی یاسر کی شخصیت پر محمد نوید مرزا نے منثری خراج تحسین پیش کیا۔ عارف فرہاد نے پروفیسر ڈاکٹر نثار ترابی کی شخصیت، علمی و ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ نصرت صدیقی نے منفرد و جامع افسر ساجد کی شاعری پر قلم آرائی کی۔ خالق آرزو کا خاصا معلوماتی اور دلچسپ مضمون بعنوان ہر کوئی غزل گو۔ پروفیسر محمود پاشا عموی قارئین کے علم میں اضافہ ہے۔ چھ کتابوں کے ٹائٹل دیکھ کر بے پایاں ادبی طمانیت ہوئی۔ محترم شوکت علی شاہ "شاہ و داستان" میں تا حال قارئین بیاض کو ساتھ ساتھ جاپان کی سیر و سیاحت کرا رہے ہیں۔ اس قوم کی حرکات و سکنات کو پڑھ کر حیرت بھی اور خوشی بھی کیا انھوں نے زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنا ہے۔ شاہ صاحب کی ماہانہ قسط "انتظار فرمایئے" گزر جاتی ہے وقت اتنا تیزی سے گزرتا ہے کہ شب و روز "شاہ و داستان" کی عالم خواب میں پڑھی جاتی ہے۔ مختلف صفحات کے نیچے جہاں جہاں ایک شعر کی جگہ خالی ہوتی ہے وہاں خالد احمد کا شعر خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ اس بار 21 اشعار کو مختلف صفحات میں سمیٹا ہے۔ یعنی برادرم نعمان منظور صاحب کا "انتخاب" خوب ہے۔ جن شعرا نے پہلی بار قلم ڈائری اٹھانے پر آمادہ کیا۔ زیر نظر شمارے میں چند اشعار دیکھیے اور سر دھنیے:

غم کے اشعار میں موضوعِ تخن ہو جیسا
آپ جس نظم میں ہوں ہم بھی وہیں ہوتے ہیں
شعر محتاط قرینے سے پڑھے جائیں گے
بزم احباب میں کچھ پردہ نشیں ہوتے ہیں
(آصف ثاقب)

غیر بھی بانٹ لیا کرتے تھے درد ہمارے
اپنے بھی کر دیتے پرائے کس کی انا نے
(جلیل عالی)

ذکر اس کا چھیڑ دیتے ہیں کسی عنوان سے
دوستوں سے برسر پیکار ہونا تھا ہوئے
(جمیل یوسف)

ہر شخص اپنی ذات میں غلطاں ہے ان دنوں
دیکھا کہ شہر بھر میں کوئی سلطنت نہیں
(حسن عسکری کاظمی)

زندگی کی کتاب نسیاں کا
دھندلا سا باب ہو گیا میں بھی
(نسیم سحر)

گو دعویٰ شاعری کا ہم کو نہیں ہے لیکن
سنتے ہیں گو نج کچھ کچھ اپنی نوا گری کی
(خاور اعجاز)

مقدر میں جو ہونا ہو وہ آخر ہو کے رہتا ہے
کبھی بدلی نہیں جاتی لکھی تقدیر کاتب کی
(رشید آفرین)

مسلسل چل رہی ہے خلق رب کی
کوائف کاروائی دیکھیے گا
(گلزار بخاری)

آسماں سر پر پرندوں نے اٹھا رکھا ہے
دوست اک پیڑ کی جس روز سے آری ہوئی ہے
(راحت سرحدی)

یہ کوزہ گر کا ہی دستِ ہنر ہے میں کیا ہوں
میں جانتا ہوں مرا خاکدان کچھ بھی نہیں
جبیں وقت پہ اقبال خود کو نقش تو کر
نصاب کچھ بھی نہیں امتحان کچھ بھی نہیں
(اقبال سروبہ)

منکشف ہوتے راز سربستہ
تجھ کو اپنی بھی جو خبر ہوتی
گلشن آرزو اجڑتا کب؟
باغباں کی اگر نظر ہوتی
(جسارت خیالی)

میں شعروں میں کہتا ہوں بہت سادہ سی باتیں
دیتی ہے انھیں رنگ تو تفہیم تمھاری
(سید ضیا حسین)

رضا! بیگانی سے
تمھارے رابطے ہیں
(نعیم رضا بھٹی)

میں ڈھونڈتی رہی مسجد میں خود کو رخشندہ
جوئے میں ہار دیا تھا جواریوں نے مجھے
(رخشندہ نوید)

میرا خلوص، میرا تخیل، مرا قلم
مصروف کار فکر کی گہرائیوں میں ہے
(رومانہ رومی)

70 غزل گو اور 14 نظم گو شعرا کے نئے نئے تخیلات پڑھ کر قلبی وتخلیقی صلاحیتوں کی داد دی جاتی ہے۔ ہائیکو اور افسانے بھی قلم کار دوستوں نے بڑی عرق ریزی سے لکھے ہیں۔ زیر تبصرہ شمارے میں سات خطوط تحریری پیغامات بھی جو قارئین ومضامین نگار احباب کے مابین رابطہ ہے چونکہ خطوط نگار اور مضامین نگار کے موبائل نمبر ''بیاض'' میں درج نہیں ہوتے۔ اخلاقی اور تحقیقی نقطہ نگاہ سے باہمی رابطے کے لیے نمبرز لازمی ہیں نہ پوسٹل ایڈریس ہوتا ہے اس طرح نگارشات پڑھ کر خط نگار اپنی رائے سے ماہنامہ اظہار کرتا ہے۔ خطوط نگار بھائی اعراب میں جو 241 صفحات کا لفظ لفظ پڑھ کر مختصر پیرائے میں بات کرنے کا فن جانتے ہیں۔ بقول وسیم عباس کہ:

الفاظ و معانی کو ملی ہم سے بصارت
ہم لوگ حقیقت میں ہیں اعراب کی صورت

رانا محمد شاہد

جناب عمران منظور! السلام علیکم!

مارچ کا ''بیاض'' خالد احمد کے خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ مارچ ان کے انتقال کا مہینہ ہے۔ اسی مناسبت سے انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ اس صاحب اسلوب شاعر کی یادوں و باتوں کو دہرایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے گوشہ خالد احمد میں انتظار حسین، خورشید رضوی، نوید صادق، محمد عبداللہ اور فیصل زمان چشتی نے اپنے اپنے انداز میں انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ خاص طور پر خورشید رضوی نے خالد صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں علالت کے حالات قلمبند کیے۔

میں کہیں پڑھ رہا تھا کہ جس روز خالد احمد کا انتقال ہوا۔ اسی روز انھوں نے اپنے گھر والوں سے ضد کی کہ انھیں یہاں سے لے جائیں۔ یہاں رہنے کو دل نہیں کرتا۔ اسی شب ان کا انتقال ہو گیا۔ شاید وہ جانتے تھے کہ ان کا مسکن اب کہیں اور بن چکا ہے۔ موت بھی تو ایک نقل مکانی ہے خالد احمد نے کہا تھا:

چلتے چلتے اچانک انھیں، چل پڑیں
میز بھی، دوست بھی، شہر بھی چھوڑ دیں
کس پڑاؤ پہ، کس موڑ پر، کس گھڑی
ادھ کہی داستاں، ادھ کہی چھوڑ دیں

نوید صادق نے صحیح لکھا کہ خالد احمد ہنستے کھیلتے اچانک اُن میں سے اٹھ کر چلے گئے اور ایک غزل کے ان اشعار میں تو انھوں نے زندگی کی حقیقت کو بھرپور انداز میں بیان کیا۔

زندگی بھر یہ بوجھ ڈھونا ہے
آگہی عمر بھر کا رونا ہے!!!
کاش کوئی ہمیں یہ بتلا دے
کس کے سینے سے لگ کے رونا ہے
علم، عرفان، آگہی خالد
خاک کے ساتھ خاک ہونا ہے

رخشندہ نوید نے اپنی تحریر ''براق والی'' میں بہت خوبصورت یادیں شیئر کیں۔ پڑھتے ہوئے اپنے بچپن کے بہت سے رنگ سامنے آتے رہے۔ بچپن کا دور ہی ایسا ہوتا ہے۔ بے فکری کے ساتھ گزارے وہ دن اور والدین کی محبت انسان کبھی نہیں بھولتا۔

افسانوں میں آسناتھ کنول کا ''مقصد'' ہی ابھی پڑھا ہے۔ واقعی جو انسان زندگی کا مقصد پالیتا ہے۔ اس کی زندگی دوسروں کے لیے وقف ہو جاتی ہے اور یہی انسانیت کی معراج ہے۔ ''ادب کا ساتا کلاز'' اعجاز رضوی کے بارے میں ڈاکٹر یونس بٹ کا مختصر مگر منفرد خاکہ پسند آیا۔ ڈاکٹر صاحب مزاح کی دنیا کا ایک بڑا نام ہیں۔ ایک عرصے بعد ان کی تحریر نظر سے گزری۔

فقط والسلام

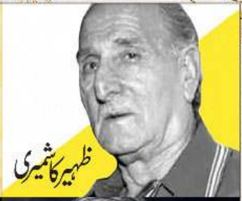
ظہیر کاشمیری
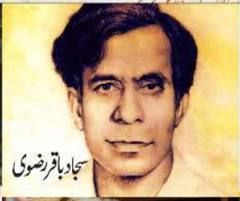
سجاد باقر رضوی
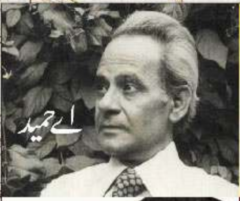
اے حمید
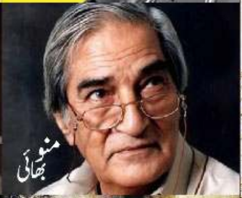
منو
بھائی

مستنصر حسین تارڑ

انیس ناگی
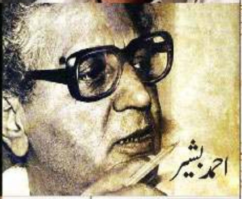
احمد بشیر

شہزاد احمد
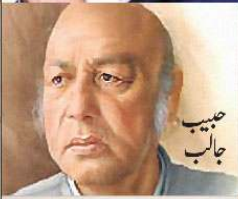
حبیب
جالب
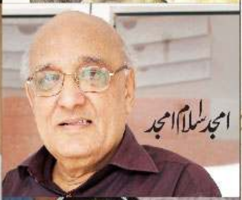
امجد اسلام امجد
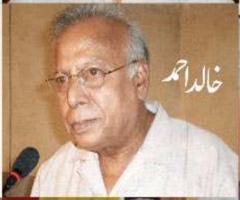
خالد احمد
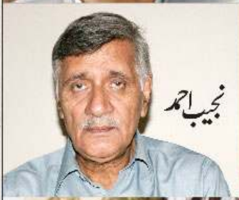
نجیب احمد

بشریٰ رحمن

خواجہ محمد زکریا

عطاالحق
قاسمی
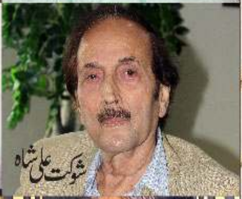
شوکت علی شاہ
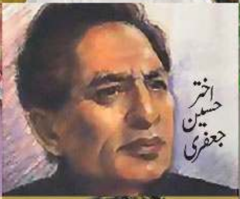
اختر
حسین
جعفری

عقیل روبی
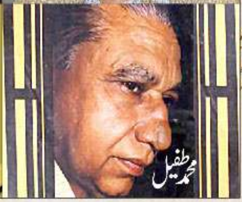
محمد طفیل

ساغر صدیقی

ناصر کاظمی

PAK TEA HOUSE
SINCE 1948